

دعوتِ دین کے قرآنی اصول

از

تفسیر معارف القرآن

زیرِ ہدایات

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم

حضرت مولانا ڈاکٹر ساجد الرحمٰن صدیقی صاحب زید مجدہم

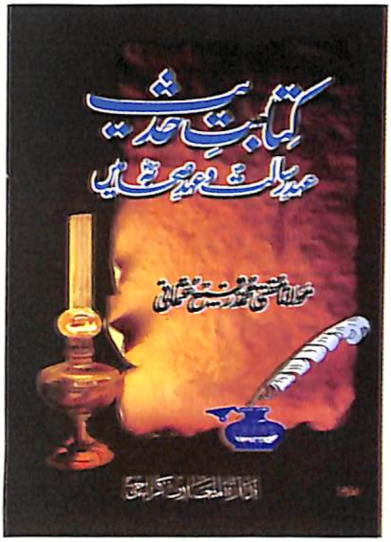
تخریج و ترتیب

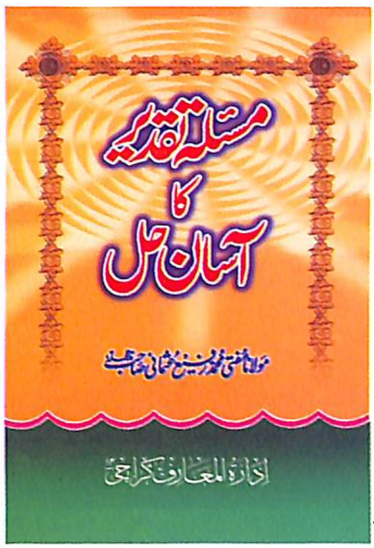
طلبۂ التخصص فی الدعوۃ والارشاد ۱۴۲۸ھ

جامعہ دار العلوم کراچی



ادارۃ المعارف کراچی


کتابتِ حدیث
عہدِ رسالت و عہدِ صحابہؓ میں
مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی
ادارۃ المعارف کراچی


مسئلہ تقدیر
کا
آسان حل
مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب
ادارۃ المعارف کراچی

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ

دعوتِ دین کے قرآنی اُصول

از

تفسیر معارف القرآن

زیرِ ہدایات

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم

حضرت مولانا ڈاکٹر ساجد الرحمٰن صدیقی صاحب زید مجدہم

تخریج و ترتیب

طلبہ التخصص فی الدعوۃ والارشاد ۱۴۲۸ھ

جامعہ دار العلوم کراچی

ادارۃ المعارف کراچی ۱۴

باہتمام : محمد مشتاق شتی

طبع جدید : محرم ۱۴۳۰ھ - جنوری ۲۰۰۹ء

مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی

ناشر : ادارۃ المعارف کراچی ۱۴

فون : 5049733 - 5032020

ای میل : i_maarif@cyber.net.pk

ملنے کے پتے :

ادارۃ المعارف کراچی ۱۴

فون: 021- 5032020, 021-5049733

- مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴
- دارالاشاعت، اُردو بازار، کراچی
- ادارۂ اسلامیات، انارکلی، لاہور
- مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار، لاہور
- مکتبہ سیّد احمد شہید، لاہور
- کتب خانہ رشیدیہ، راولپنڈی

فہرستِ مضامین

***

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

حرفِ اوّل

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ النَّبِیِّ الۡعَرَبِیِّ الۡاَمِیۡنِ وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحۡبِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کی صلاح وفلاح اور اس کی ہدایت کے لئے ہر زمانے اور ہر مقام پر پے در پے رسول اور انبیاء مبعوث فرمائے، اور سب سے آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انسانوں کے لئے بشیر اور نذیر اور خاتم الانبیاء بنا کر مبعوث فرمایا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ مبارکہ کے ساتھ دِین کو مکمل اور نعمتِ ہدایت کو تمام فرمایا، اور ہمیشہ کے لئے دِینِ اسلام کو جملہ انسانیت کے لئے دِینِ حق کے طور پر قبول فرمالیا۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سالہ سعی وکوشش سے اور پیہم اور مسلسل دعوت وتبلیغ سے صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت تیار کی جو اس دِینِ حق کا عملی نمونہ اور اس دعوتِ حق کا پیکرِ مجسم تھے۔ تاریخِ انسانیت میں کبھی کوئی جماعت صحابہ کرامؓ کی طرح دِین واخلاق کا ایسا عملی نمونہ اور جہدِ مسلسل اور سعی وکوشش کا اس قدر حسین مظہر نہ بن سکی، یہ صرف اور صرف صحابہ کرامؓ ہی تھے جو نوعِ انسانی کا خلاصہ اور کمالِ انسانیت کی اعلیٰ ترین مثال بن کر صفحۂ ہستی پر آئے اور ساری دُنیا میں دعوتِ اسلام کو پھیلایا۔ نہ صرف یہ کہ دعوتِ اسلام

دُنیا کے گوشے گوشے میں پہنچائی بلکہ تابعین کی ایک جماعت بھی ایسی تیار کردی جس نے دِینِ حق کی اشاعت اور دعوتِ اسلام کے دُور دراز علاقوں تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، اور پھر یہی سلسلہ آگے بڑھا، اَتباعِ تابعین اور علماء وصلحاء اور صوفیاء و اولیاء ہر دور میں دِین کی اشاعت میں منہمک رہے اور دعوتِ دِین کے کام میں اپنی زندگیاں کھپاتے رہے۔

دعوتِ دِین، دعوتِ حق ہے، یہ ''لا إلٰہ إلّا اللّٰہ'' کی دعوت ہے، یہ ایسی دعوت ہے جو ایک مؤمن اور مسلمان کی حقیقی متاع ہے، اور یہ متاع اسے دِل وجان سے بھی زیادہ عزیز ہے، یہ ایک خالق اور ایک مالک کی بندگی کی طرف دعوت ہے، یہ اس جانب دعوت ہے کہ اللہ واحد ہی ہے جس سے بندۂ مؤمن لولگا تا ہے، اسی کو پکارتا ہے، اسی سے سوال کرتا ہے، اسی سے مناجات کرتا ہے، اسی سے مدد مانگتا ہے، اسی سے اِستعانت کا خواستگار ہوتا ہے اور اس کی بندگی کرتا ہے اور اس کی عبودیت میں سرشار رہتا ہے، "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ"۔ ایک حدیث مبارک میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ'' جب مانگو تو اللہ ہی سے مانگو، اور جب مدد چاہو تو اسی سے مدد چاہو۔''

انسان کی فطرتِ سلیمہ کا مقتضا بھی یہی ہے کہ وہ اپنے مالکِ حقیقی کے سامنے سرنگوں ہوجائے اور اسی سے راز ونیاز کرے اور اسی سے مناجات کرے اور اسی کو پکارے، اگر کوئی انسان اللہ کو نہیں پکارتا اور اس سے لَو نہیں لگاتا تو اس کا وجود کھوکھلا ہوجاتا ہے، اور وجود کا یہ کھوکھلا پن اس کو بے چین اور سعادت سے محروم کردیتا ہے، قرآنِ کریم میں حق سبحانہٗ ارشاد فرماتا ہے کہ:-

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّیْهِ اِلَى الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾ (الرعد)

ترجمہ:- اسی کا پکارنا سچ ہے، اور جن لوگوں کو پکارتے ہیں اس کے سوا

وہ کام نہیں آتے ان کے کچھ بھی مگر جیسے کسی نے پھیلا دیئے دونوں ہاتھ پانی کی طرف کہ آپہنچے اس کے منہ تک، اور وہ کبھی نہ پہنچے گا اس تک، اور جتنی پکار ہے کافروں کی سب گمراہی ہے۔

جو اپنی ضرورتوں اور حاجتوں میں اللہ کو چھوڑ کر کسی اور طرف متوجہ ہوتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کنویں کے کنارے پر کھڑا ہو کر دونوں ہاتھ پھیلا دے کہ پانی اس کے منہ تک پہنچ جائے تو وہ کبھی نہیں پہنچ سکتا۔

اسلام تمام انسانیت کو صلاح و فلاح کی طرف بلاتا ہے اور سعادت کی جانب دعوت دیتا ہے اور امن وسلامتی کا ہمہ گیر پیغام ہے۔ دعوتِ دِین ایک سعادتِ ابدی ہے، فوز وفلاحِ دائمی ہے اور دِین و دُنیا کی مکمل کامیابی ہے، اسلام نے تمام اُمتِ مسلمہ کو داعیٔ حق بنا کر اُٹھایا ہے اور ارشاد فرمایا ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ　(آل عمران:۱۱۰)

ترجمہ:۔ تم ہو بہتر سب اُمتوں سے جو بھیجی گئیں عالم میں، حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر۔

آیتِ مبارکہ کی تفسیر میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اپنی تفسیر ''معارف القرآن'' میں فرماتے ہیں کہ:۔

اس آیت میں اُمتِ محمدیہ کے خیر الامم ہونے کی وجہ بیان فرمائی ہے کہ یہ خلق اللہ کو نفع پہنچانے ہی کے لئے وجود میں آئی ہے، اور اس کا سب سے بڑا نفع یہ ہے کہ خلق اللہ کی رُوحانی اور اخلاقی اصلاح کی فکر اس کا منصبی فریضہ ہے۔

غرض دعوتِ دِین اس اُمت کا ایک منصبی فریضہ ہے جس کی تکمیل کے لئے ایسے

افرادِ کار کی تیاری ضروری ہے جو علم میں کامل، عمل میں پختہ اور سیرت و کردار میں قابلِ تقلید نمونہ ہوں۔ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہم رئیس الجامعہ ''جامعہ دارالعلوم کراچی'' اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم نے اس ضرورت کے مدِ نظر جامعہ دارالعلوم کراچی میں قسم التخصُّص فی الدّعوۃ والإرشاد قائم فرمایا، اور اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس شعبے کی ترقی کے لئے اپنا قیمتی وقت نکالا اور ہمہ وقت سرپرستی قبول فرمائی۔

رئیس الجامعہ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہم نے دعوت وارشاد کے ان طلبہ کی جانب خصوصی توجہ فرمائی اور دعوت وتبلیغ کے اُصول اور اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قواعد وضوابط سے متعلق روزانہ ایک گھنٹہ درس دیتے رہے اور اپنے معارفِ علمیہ سے طلبہ کو مستفید فرماتے رہے۔ اُصولِ دعوت کی تدریس کے ساتھ ساتھ حضرت رئیس الجامعہ مدظلہم نے طلبہ کی علمی استعداد میں اضافہ اور کارِ دعوت کے سلسلے میں انبیائے کرام علیہم السلام کے دعوتی اُصولوں کے بارے میں فہم وبصیرت حاصل کرنے کے لئے اپنی زیرِ نگرانی طلبہ کو مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ''معارف القرآن'' میں دعوتِ دِین سے متعلق قرآنی آیات کی تفسیر کے مطالعے پر مامور فرمایا اور انہیں دعوت سے متعلق تفسیری مضامین جمع کرنے کی ہدایت فرمائی۔

حضرت رئیس الجامعہ کی مسلسل نگرانی اور توجہ کے باعث التخصُّص فی الدّعوۃ والإرشاد کے قابلِ احترام طلبہ نے بہت محنت جزرسی اور دقتِ نظر سے مضامینِ دعوت پر مشتمل قرآنی آیات کی تفسیر کو بہت حسن وخوبصورتی کے ساتھ یکجا کیا اور حضرت مفتیٔ اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے علمی نکات کو یکجا کیا۔ حضرت رئیس الجامعہ اس عظیم کام کی مسلسل نگرانی فرماتے رہے۔ اور ایک سال سے زائد عرصے میں الحمدللہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بہت ہی وقیع علمی کام ہے جو اِن شاء اللہ ہمیشہ کے لئے دعوتی کام سرانجام دینے والوں کے لئے مشعلِ راہ بنا رہے گا۔ اگر یہ کہا جائے تو

غیر مناسب نہ ہوگا کہ قسم التخصّص فی الدّعوۃ والإرشاد میں پایۂ تکمیل کو پہنچنے والا یہ کام اس شعبے کی اہمیت وافادیت کو واضح کرنے کے لئے بہت کافی ہے، وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ۔

اس مقام پر یہ وضاحت کردینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیری مواد کی ترتیب وتدوین میں مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کو نمایاں کرکے مرتب کیا گیا ہے اور ربطِ مضمون کے لئے جو اِضافی عبارت تحریر کی گئی ہے وہ باریک خط میں رکھی گئی ہے تاکہ حضرت مفتی صاحبؒ کی تحریر ممتاز اور نمایاں ہوجائے۔

اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ دُعا ہے کہ اس عمل کو قبول فرمائے اور قسم التخصّص فی الدّعوۃ والإرشاد کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور ان مقاصدِ حسنہ کی تکمیل کا ذریعہ بنائے جو اس شعبے کے قیام سے بزرگوں کے پیشِ نظر ہیں۔ اللہ ہم سب کو توفیقِ عمل سے بہرہ ور فرمائے، آمین۔

(مولانا ڈاکٹر) ساجد الرحمٰن صدیقی (صاحب زید مجدہم)
نگران قسم التّخصّص فی الدّعوۃ والإرشاد
جامعہ دار العلوم کراچی

***

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

دعوتِ دِین کے راہنما اُصول

''تخصُّص فی الدعوۃ والارشاد سالِ اوّل کے طلبہ کو ۱۴۲۷ھ میں، پھر دو سال بعد نئی جماعت کے طلبہ کو ۱۴۲۹ھ میں مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب زید مجدہم نے اپنے پہلے درس میں چند بنیادی نصیحتیں ارشادفرمائیں جو دعوت وارشاد کی خدمت کے لئے رہنما اُصول کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کا خلاصہ یہاں بطور مقدمہ کے شامل کیا جارہا ہے۔''

عزیز طلبہ! دعوت وارشاد کا کام بہت عظیم ہے۔ جملہ انبیائے کرام علیہم السلام جو دُنیا میں تشریف لائے قرآنِ حکیم میں ان سب کا بنیادی مقصد ''اِنذار'' اور ''تبشیر'' بتلایا گیا ہے، اور ہم نے جو علم دِین حاصل کیا ہے اس کا مقصد بھی ''اِنذار'' اور ''تبشیر'' ہی ہے۔ قرآنِ کریم کی درج ذیل آیتِ مبارکہ میں بھی تفقہ فی الدّین کے حصول کا مقصود ''اِنذار'' بیان کیا گیا ہے۔

فَلَوۡلَا نَفَرَ مِنۡ کُلِّ فِرۡقَۃٍ مِّنۡہُمۡ طَآئِفَۃٌ لِّیَتَفَقَّہُوۡا فِی الدِّیۡنِ وَلِیُنۡذِرُوۡا قَوۡمَہُمۡ اِذَا رَجَعُوۡۤا اِلَیۡہِمۡ لَعَلَّہُمۡ یَحۡذَرُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾ (التوبۃ)

اوصافِ انبیاء اختیار کرنے کی ضرورت

چونکہ دعوت الی اللہ انبیائے کرام علیہم السلام کا کام ہے، اس لئے ضروری ہے کہ داعیانِ حق وہ اوصاف اختیار کریں جو انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کے متبعین کے اوصاف تھے۔ جن میں سب سے پہلے تقویٰ اور اللہ سے ڈرنا ہے۔ اور اُسوۂ حسنہ کو اس طرح اپنی زندگی کے ہر پہلو میں بروئے کار لانا ہے کہ تمام اُمورِ حیات اُسوۂ حسنہ سے ہم آہنگ ہوجائیں، اور اس کے سانچے میں ڈھل جائیں، کیونکہ لوگ زبانی کلامی وعظ

ونصیحت سے اتنے متاثر نہیں ہوتے جتنے عملی نمونے سے متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ آج کے غیر مسلم تعلیماتِ اسلام کو پڑھ کر اور ان سے متاثر ہوکر تو مسلمان ہورہے ہیں مگر مسلمانوں کی زندگی اور ان کے موجودہ طرزِ عمل سے متاثر ہوکر مسلمان نہیں ہورہے، بلکہ ان سے اظہارِ نفرت کرتے ہیں۔ کیونکہ عام طور سے مسلمانوں کا عملی نمونہ اسلام کے مطابق نہیں ہے۔ اس پر ایک سکھ کا واقعہ یاد آ گیا۔

واقعہ یہ ہوا کہ ہم لوگ ایک دفعہ جرمنی گئے ہوئے تھے، واپسی سے ایک دن پہلے کچھ وقت ملا تو ہم بچوں کے لئے کچھ چیزیں خریدنے ایک ڈیپارٹ منٹل اسٹور چلے گئے، اسٹور کا مالک ایک سکھ تھا، وہ ہمارے پاس آ کر بڑی بشاشت سے ملا، اور یہ معلوم کرکے بہت خوش ہوا کہ ہمارا تعلق پاکستان سے ہے، اُس نے فصیح و بلیغ اُردو میں اِلتجاء کے سے انداز میں کہا کہ خریداری سے فارغ ہوکر اگر آپ میرے دفتر میں تھوڑی دیر کے لئے تشریف لے آئیں تو بڑی نوازش ہوگی۔ ہم نے وعدہ کرلیا، لیکن خریداری میں کچھ تاخیر ہوگئی، اس پر اس کی طرف سے دو، تین بار یاددہانی کا پیغام بھی آیا کہ بھول نہ جائیں۔ چنانچہ خریداری سے فارغ ہوکر ہم اس کے دفتر میں گئے، دفتر ماشاءاللہ بڑی نفاست سے سجا تھا، ہر چیز اپنی مقرّرہ جگہ پر بڑے سلیقے سے رکھی تھی، ان کی یہ نفاست اور سلیقہ مندی دیکھ کر خوشی ہوئی۔

اس نے مجھ سے عقائدِ اسلام کے متعلق مختلف باتیں دریافت کیں، میرے محبت بھرے جوابات بغور سننے کے بعد وہ کہنے لگا کہ: مجھے تو یہ ساری باتیں بہت اچھی لگتی ہیں، میں ان سب کو ماننے کے لئے تیار ہوں۔ اچھا یہ بتایئے کہ: اسلام کیسے لاتے ہیں؟

میں نے کہا کہ: اس کا تو بہت آسان طریقہ ہے، اسلام میں ایک کلمہ ہے اس کے مطلب ومفہوم کو اچھی طرح سمجھ کر جب آپ کو اس کے سچا ہونے کا یقین ہوجائے تو اسے دِل سے مان کر زبان سے وہ کلمہ پڑھ لیا جائے۔ وہ کہنے لگا: ٹھیک ہے، آپ مجھے وہ کلمہ پڑھادیں، میں اسلام لانا چاہتا ہوں۔ میں نے کلمہ پڑھادیا اور اس کا مطلب بھی سمجھادیا۔

اُس نے پوچھا: اب مجھے کیا کرنا ہے؟ میں نے بتایا کہ اسلام لانے کے بعد سب

سے پہلا اہم فریضہ نماز ہے، میں نے اُسے نماز، غسل اور وضو کے بارے میں بتایا، اُس نے کہا: آپ تو کل پاکستان چلے جائیں گے، مجھے کچھ کتابیں رہنمائی کے لئے دے جائیں۔

میں نے اپنے میزبان مولانا قاری احسان صاحب- جو دارالعلوم کراچی ہی کے فارغ التحصیل ہیں- ان کو فون کر کے صورتِ حال بتائی، اور اُن سے کہا کہ وہ نماز کی کتاب اور تفسیر معارف القرآن کی پہلی جلد لے کر آ جائیں۔

تھوڑی دیر میں وہ آ گئے تو میں نے اُس سے کہا کہ: اب آپ ہمارے ساتھ مل کر دُعا کریں، اس وقت آپ کی دُعا زیادہ قابلِ قبول ہے، میں نے اس کو حدیث سنائی کہ "اسلام لانے پر اللہ تعالیٰ پچھلے تمام گناہ معاف فرما دیتے ہیں" لہٰذا آپ اس وقت سب گناہوں سے پاک ہیں، غرض! ہم نے مل کر خوب اہتمام سے دُعا کی۔

اس کے بعد میں نے کہا: مبارک ہو، اس وقت آپ ہم میں سب سے بہتر مسلمان ہیں، کیونکہ آپ کے پچھلے سب گناہ معاف ہو چکے ہیں، یہ بڑی خوش نصیبی کی بات ہے۔

وہ حیرانگی سے کہنے لگا: کیا میں مسلمان ہو گیا؟ میں نے کہا کہ: ہاں الحمدللہ آپ مسلمان ہو گئے ہیں۔ وہ کچھ دیر پریشان سا ہو کر سوچتا رہا، پھر بولا: نہیں! میں مسلمان نہیں ہوتا۔

میں نے حیران اور کچھ پریشان سا ہو کر وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا: آپ نے جو باتیں اسلام کی مجھے بتائی ہیں وہ بہت اچھی ہیں، میں ان سب کو مانتا ہوں، مگر میں نے بہت مسلمان دیکھے ہیں، وہ اچھے نہیں ہوتے، میں مسلمان ہونے کے لئے تیار نہیں۔

"کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں اسلام لے آؤں مگر مسلمان نہ بنوں؟"

میں اس مشکل سوال کے جواب میں اُسے تکنے لگا۔

آخری بات جو اُس نے کہی وہ یہ تھی کہ میں سکھ ہوں، سردار گوبندر سنگھ کا سکھ، میں مسلمان نہیں ہوں۔

بعد میں اُن صاحب سے بالواسطہ سلام و پیام کا سلسلہ جاری رہا، مگر ملاقات نہ ہوسکی، یہاں تک کہ اسی حالت میں ان کا اب سے کچھ عرصہ پہلے انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

اس واقعہ کو سنانے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے زندگی کا نمونہ جو لوگوں کے سامنے آ رہا ہے، یہ وہ نمونہ نہیں ہے جو انبیائے کرام اور صحابہ کرام کا تھا، ان کا حسین کردار دیکھ دیکھ کر لوگ اسلام میں کھنچے چلے آتے تھے، آج ہمیں دیکھ کر لوگ اسلام سے متنفر ہو رہے ہیں۔

اس لئے عزیزو! سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر انبیائے کرام علیہم السلام اور صحابہ کرام، اور سلف صالحین والی خوبیاں پیدا کریں۔

دعوت الی اللہ کے دو طریقے

دعوت الی اللہ کے دو طریقے ہیں: ۱ قول، ۲ عمل۔ پھر دعوتِ قولی کی دو صورتیں ہیں: ۱ تقریر، ۲ تحریر۔ ایک کا تعلق زبان سے، اور دُوسری کا تعلق قلم سے ہے، اس لئے ہر داعی کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اپنی مادری زبان اور اس کے محاوروں پر خوب مہارت حاصل ہو، خواہ اس کی زبان کوئی بھی ہو، اس لئے کہ اگر وہ اپنے علاقے میں جا کر اپنی زبان میں لوگوں کو دِین کی تعلیم دے گا تو وہ زیادہ اثر انگیز ہوگی، بخلاف اس کے کہ کوئی دُوسری زبان والا دعوتِ دِین دے۔

مثلاً: اگر میں چترال جا کر وعظ کروں تو ہوسکتا ہے کہ عقیدت و محبت کی وجہ سے وہ لوگ میری بات سن لیں، اور ادب و احترام بھی کریں، مگر میری بات میں وہ تأثیر نہیں ہوگی جو اہلِ زبان کی دعوت و اِرشاد میں ہوگی۔ اس لئے ہر داعی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی زبان میں مہارت اور فصاحت و بلاغت پیدا کرے۔

اور اگر دعوت و تبلیغ کا کام اُسے اپنے وطن کے بجائے کسی اور علاقے میں کرنا ہے تو وہاں کی زبان پر عبور حاصل کرنے کی پوری کوشش کرے، اور وہاں کے رسم و رواج اور محاوروں کو سمجھے۔

قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ (ابراہیم:۴)

ترجمہ:- اور ہم نے تمام (پہلے) پیغمبروں کو (بھی) انہی کی قوم کی

زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، تا کہ (ان کی زبان میں) ان سے (اَحکامِ اِلٰہیہ کو) بیان کریں (کہ اصل مقصود واضح بیان کرنا ہے)۔

اور دُوسری صورت جو دعوتِ قولی کے زُمرے میں آتی ہے وہ ''تحریر'' ہے، داعی کا خط صاف ستھرا، قاعدے کے مطابق ہونا چاہئے، تحریر میں بلاغت وفصاحت اور ادبیت کی جھلک نمایاں ہو۔ اگر داعی کا خط بھدا ہے تو پڑھنے والا پہلی ہی نظر میں بد دِل ہو جائے گا کہ یہ مجھے کیا سکھائے گا، اس کا تو اپنا خط ہی صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا تحریر کا صحیح ہونا بھی ضروری ہے۔

آج کل ابلاغ کا زیادہ تر کام صحافت کے ذریعے ہو رہا ہے، لہٰذا اس فن کو بھی جاننے کی ضرورت ہے۔ ابلاغ کی دو صورتیں ہیں: ۱۔ پرنٹ میڈیا، ۲۔ الیکٹرانک میڈیا۔ پرنٹ میڈیا میں ابلاغ کے لئے تحریر میں ادبیت اور بلاغت کی ضرورت ہے، اور الیکٹرانک میڈیا میں دعوت وتبلیغ کے لئے زبان کی فصاحت وبلاغت اور سلاست ضروری ہے۔ پرنٹ میڈیا کا تعلق قلم سے ہے اور الیکٹرانک میڈیا کا تعلق زبان سے ہے۔ لہٰذا ان دونوں چیزوں میں داعی کو مہارت پیدا کرنا چاہئے۔ اور یہی مہارت وعظ وتقریر، عوامی خطبات اور دعوت وتبلیغ کے سلسلے کی ملاقاتوں اور مکالموں میں مطلوب ہے۔

اور دعوتِ دِین کا دُوسرا طریقہ ''عمل'' ہے، یعنی داعی اور واعظ وناصح کا عملی نمونہ اور کردار، یہ دعوت کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے، اور اپنا کردار درست کرنے کے لئے مصلح کی ضرورت ہے، ان لوگوں کی صحبت وتربیت میں رہنا ضروری ہے جنھوں نے بزرگوں سے اپنے باطن کی اصلاح اور تربیت حاصل کی ہو۔ عادۃ اللہ یہی ہے کہ جس طرح مریض کا علاج طبیب ہی کرسکتا ہے اسی طرح باطنی امراض سے بھی بغیر مصلحِ رُوحانی کے شفا نہیں ہوتی۔

اِحسان کی اہمیت

اب تک جو علم آپ نے حاصل کیا وہ فقہِ ظاہر تھا، فقہِ باطن باقی ہے، جسے ''اِحسان'' کہتے ہیں۔ اسی کو عرفِ عام میں ''تصوّف'' کا نام دے دیا گیا ہے، جس کو بعض

اوقات محلِ نقد بھی بنایا جاتا ہے، اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس کو "اِحسان" کے نام سے تعبیر کیا جائے۔

عزیزو! جب ہم تخصُّص فی الافتاء میں داخل ہوئے تو حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہٗ اکثر یہ بات فرمایا کرتے تھے۔

چنانچہ ہم نے عرض کیا کہ: آپ ہی ہمیں بیعت فرمالیں، چونکہ آپ سے عقیدت ومحبت بھی ہے اور طبعی مناسبت بھی، لیکن حضرت والد صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا کہ: باپ بیٹے کے درمیان اس تعلق سے کچھ مشکلات پیش آسکتی ہیں، اس لئے انہوں نے ہمیں عارف باللہ سیّدی حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونے پر آمادہ کیا، اور ہمارا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

سیّدی حضرت ڈاکٹر عارفی رحمہُ اللہ فرمایا کرتے تھے "اب زمانہ ریاضتوں اور مجاہدوں کا نہیں رہا، اب لوگ بڑی بڑی مشقتیں برداشت نہیں کرسکتے" اس لئے انہوں نے ہمیں آسان معمولاتِ زندگی ارشاد فرمائے، اور ان ہی کے مطابق تربیت فرمائی۔

جب حضرت والد صاحب قدس سرہٗ، حضرت تھانوی صاحب رحمہ اللہ کے پاس اصلاحی تعلق حاصل کرنے کے لئے گئے تو عرض کیا کہ "حضرت! میری تمنا تو بہت ہے کہ تصوّف وسلوک کے منازل طے کروں، مگر سنتا ہوں کہ بڑے مجاہدوں اور ریاضتوں اور فرصت کا کام ہے، میں خِلقۃً ضعیف بھی ہوں، زیادہ محنت برداشت کرنے کے قابل نہیں، اور فرصت بھی کم ہے، اور وقت تمام درس وتدریس اور مطالعے کے کاموں میں گزرتا ہے۔ کیا ان حالات میں بھی مجھے کوئی حصہ نصیب ہوسکتا ہے؟"

حضرتؒ نے بڑی شفقت سے فرمایا: "یہ تم نے کیا کہا، کیا اللہ کا راستہ صرف اقویاء کے لئے ہے، ضعفاء کے لئے نہیں؟ فارغ البال لوگوں کے لئے ہے، کم فرصت لوگوں کے لئے نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ راستہ سب کے لئے کھلا ہوا ہے، ہاں ہر ایک کے لئے عمل کا طریقہ مختلف ہے، بزرگوں نے فرمایا ہے:

طُرُق الوصول الی اللہ بعدد أنفس الخلائق۔

یعنی اللہ تک پہنچنے کے راستے اتنے ہی اَن گنت ہیں، جتنے انسان۔
یہاں کوئی عطائی کی دُکان نہیں کہ سب کو ایک ہی گولی دی جائے، ہم آپ کو ایسا طریقہ بتائیں گے، جس میں نہ قوت کی ضرورت نہ فرصت کی۔"

پھر فرمایا کہ: فرائض و واجبات اور سنن وغیرہ جو سب مسلمان ادا کرتے ہیں، وہ تو اپنی جگہ ہیں، آپ صرف تین چیزوں کی پابندی کرلیں اِن شاء اللہ سارا سلوک اسی سے طے ہو جائے گا۔

۱- تقویٰ اختیار کریں، اس کا مفہوم آپ کو بتلانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ تقویٰ صرف نماز، روزہ اور ظاہری معاملات کا نہیں، باطنی اعمال میں بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا ظاہری میں ہے۔

۲- دوسرے ہر لایعنی (بے فائدہ) کام، کلام، مجلس، ملاقات سے پرہیز کریں، اور فرمایا: لایعنی سے میری مراد وہ کام ہے، جس میں نہ دِین کا کوئی فائدہ ہو، نہ دُنیا کا۔ غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے اعمال، اقوال، مجالس میں بہت سا وقت ایسا گزرتا ہے کہ کام کی بات تھوڑی سی، اور بے فائدہ وزائد زیادہ۔ بس ان سے پرہیز کرنا ہے۔

۳- تیسرے بقدرِ ہمت وفرصت کچھ تلاوتِ قرآن روزانہ کیا کریں۔

پھر ارشاد فرمایا کہ: اب بتلاؤ اس نسخے میں کون سی چیز محنت یا فرصت کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اگر غور کرو گے تو اس میں قوّت اور زیادہ محفوظ رہے گی، کیونکہ تقویٰ ایسی چیز ہے کہ بہت سے ایسے کاموں سے روکتا ہے جو اِنسان کی قوّت ضائع کرتے ہیں، اور جب لایعنی کاموں، ملاقاتوں، مجلسوں سے پرہیز کرو گے تو تمہاری فرصت علمی مشاغل کے لئے اور بڑھ جائے گی۔

آخر میں فرمایا کہ: نسخہ تو آپ کے لئے اتنا ہی ہے، اگر دِل چاہے اور فرصت بھی ہو تو صبح شام سبحان اللہ، الحمد للہ، لا اِلٰہ اِلَّا اللہ، سو سو مرتبہ اور اِستغفار و درود شریف سو سو مرتبہ پڑھ لیا کرو، اور نمازوں کے بعد تسبیح فاطمہ کا اِلتزام کرلو۔"

اس لئے عزیزو! ضروری ہے کہ کسی بزرگ سے اپنا اصلاحی تعلق پیدا کر کے اور

با قاعدہ بیعت ہوکر فقہِ باطن کو بھی اس اہتمام سے حاصل کریں، جس طرح فقہِ ظاہر حاصل کیا ہے۔

اور اس بات کی عادت ڈالیں کہ جب بھی کسی کام کے لئے جائیں، درس و تدریس ہو یا دعوت و تبلیغ "حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ" کو ۴۰ مرتبہ، یا کم از کم ایک مرتبہ ضرور پڑھ لیا کریں، یہ تیر بہدف عمل ہے۔

حضرت والد صاحب قدس سرہٗ نے ۱۹۶۴ء میں مجھے ایک کام کے لئے بھیجا، اور فرمایا کہ "یہ دُعا پڑھ لو!

رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا"

الحمدللہ یہ دُعا پڑھ کر گیا تو جو کام مہینوں میں ہونا تھا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دو، تین گھنٹے میں ہوگیا، ہر اہم کام شروع کرنے سے پہلے یہ دُعا پڑھ لیا کریں۔

نیز درس و تدریس اور وعظ سے پہلے یہ دُعا بھی ضرور پڑھ لیا کریں:-

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ﴿۲۵﴾ وَیَسِّرْ لِیْۤ اَمْرِیْ ﴿۲۶﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ﴿۲۷﴾ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ﴿۲۸﴾ (طٰہٰ)

قاعدہ کلیہ

قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ ہر کام میں رُجوع الی اللہ ہو، حضرت سیّدی ڈاکٹر عارفی صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے "وضو، یا مسجد میں جانے، یا روبقبلہ ہوکر بیٹھنے وغیرہ کا انتظار نہ کیا کرو، بلکہ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، چپکے چپکے اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتے رہا کرو۔"

رجوع الی اللہ کلیدِ کامیابی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ سنتِ نبوی کی پیروی لازمی ہے، اور ضروری ہے کہ اپنے آپ کو سنت کا پابند بنائیں، جس کے لئے قلب کی اصلاح ناگزیر ہے، اور اِصلاح بغیر مرشد کے نہیں ہوتی۔

دعوتِ دین کی فکر اور لگن

داعی کے لئے ضروری ہے کہ اُسے دعوت و تبلیغ کی دُھن اور لگن ہو، اس معاملے

میں ہمارے تبلیغی حضرات قابلِ رشک ہیں، جب تک آپ کے اندر دعوتِ دِین اور امر بالمعروف ونھی عن المنکر کی تڑپ نہیں ہوگی آپ کے کلام میں تأثیر پیدا نہیں ہوگی۔

ایک مرتبہ مجھے طوبیٰ مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھانے اور بیان کرنے کے لئے جانا تھا، اور اس کے لئے تیاری کر رہا تھا، کبھی کسی کتاب کو دیکھتا اور کبھی کسی کتاب کو، اسی دوران ہمارے بہنوئی حضرت مولانا نور احمد صاحب رحمہ اللہ - سابق ناظم دارالعلوم کراچی - تشریف لائے اور فرمایا: بیان میں جو بات تم کہنا چاہتے ہو، پہلے اس کی ضرورت واہمیت کا احساس اپنے اندر پیدا کرو، اور رُجوع الی اللہ ہو تو بات میں تأثیر پیدا ہوگی۔

جہاں زخم ہو وہاں مرہم لگاؤ

میرے مرشدِ محسن، عارف باللہ سیّدی حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ ہر موقع پر اُس کے مطابق نہایت حکیمانہ اور دِل میں اُتر جانے والی بات ارشاد فرمایا کرتے تھے، ایک مرتبہ مجھے ایک بڑے دینی ادارے کی طلب پر مجھے وہاں بیان کے لئے بھیجا تو فرمایا:

"یاد رکھو! فرمائشی تقریریں کبھی نہ کرنا، رسمی تقریریں کبھی نہ کرنا، بلکہ جہاں جاؤ یہ دیکھو کہ یہاں کس بات کی زیادہ ضرورت ہے، جس خرابی کو جہاں زیادہ پاؤ، اُس کے بارے میں اِخلاص کے ساتھ بات کرو، جہاں زخم ہو وہاں مرہم لگاؤ۔

بیان شروع کرنے سے پہلے اپنی نیت کو اللہ کے لئے خالص کرلو، اور دُعا کرو کہ یا اللہ! مجھے حق بات، حق نیت سے، حق طریقے سے کہنے کی توفیق عطا فرما، اور مسنون دُعاؤں کا اہتمام کرو۔"

حضرتؒ کا بتایا ہوا یہ نسخہ ایسا اکسیر ہے کہ جب بھی اس پر عمل کی توفیق ہوتی ہے، اُس کا فائدہ سامنے آجاتا ہے۔

جب آدمی اپنے بیان میں رٹی رٹائی باتوں کے بجائے موقع محل کے مناسب اور وہاں کی موجودہ ضرورت کے مطابق اِخلاص کے ساتھ بات کرے گا تو بیان میں زور خود بخود پیدا ہوجائے گا۔ لوگ ایسی باتوں کو جو اِن کے موجودہ حالات سے متعلق رہنمائی

کرتی ہوں زیادہ توجہ،شوق اور دِلچسپی سے سنیں گے،اور اللہ تعالیٰ آپ کے کلام میں اثر پیدا فرمادیں گے۔

دعوتِ دین کے کام میں انبیائے کرام کا اُسلوب اِختیار کرو

داعی کے لئے ایک بنیادی ضرورت یہ ہے کہ وعظ و نصیحت اور تقریر و تحریر میں وہ اُسلوب اختیار کیا جائے جسے قرآنِ حکیم نے بیان کیا ہے،اور انبیائے کرام علیہم السلام کے واقعات میں بطورِ مثال بھی جگہ جگہ پیش کیا ہے۔قرآنِ حکیم نے طریقۂ نماز کی اتنی تفصیل بیان نہیں کی جتنی تفصیلات دعوت و اِرشاد کے لئے بیان فرمائی ہیں۔

یہ اُسلوب اِن شاء اللہ آپ "تخصُّص فی الدعوۃ والارشاد" کے دوران تفصیل سے پڑھیں گے۔

خلاصہ یہ کہ دعوت و اِرشاد کی عظیم الشان خدمت کے لئے پانچ چیزوں کی بنیادی طور پر ضرورت ہے:

۱- ایک تقریر و تحریر کی اچھی صلاحیت۔

۲- دوسرے اپنے عمل و کردار کی اصلاح اور اِتباعِ سنت۔

۳- تیسرے دعوتِ دین کی دُھن اور لگن۔

۴- چوتھے ''جہاں زخم ہو وہاں مرہم لگاؤ'' کا اُصول۔

۵- پانچویں انبیائے کرام علیہم السلام کا اُسلوبِ دعوت۔

اِن شاء اللہ ان پانچوں اُصولوں کی تفصیلات اور تربیت آپ "تخصُّص فی الدعوۃ والارشاد" میں حاصل کریں گے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مقدّمہ

دعوتِ دِین کے قرآنی اُصول

''قرآنِ کریم کا اُسلوبِ بیان بالعموم اِجمال اور اِختصار کے ساتھ اُصول وکلیات کو بیان کرنا ہے، چنانچہ قرآنِ کریم میں انسانی ہدایت وراہنمائی کے اُصول وکلیات بیان فرما کر ان کی تفصیل اور ان کی جزئیات کا بیان رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرما دیا ہے اور اِرشاد فرما دیا ہے کہ:-

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ

نماز، زکوٰۃ اور حج جیسے اَحکام جو اِسلامی نظامِ حیات میں ستون کا درجہ رکھتے ہیں اور انہی ستونوں پر اِسلام کی عظیم الشان عمارت اِستوار ہے، ان کے بارے میں بھی قرانِ کریم نے ''اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ'' کہنے پر اِکتفاء کیا ہے، اور ان اَحکام کی جزئیات اور تفصیلات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال واعمال سے بیان فرمائی ہیں، چنانچہ ارشاد فرمایا ہے کہ:-

صلُّوا کما رأیتمونی اُصلّی۔

لیکن بعض ایسے اَحکام بھی قرآنِ کریم میں مذکور ہوئے ہیں جن کے بیان اور توضیح میں قرآنِ کریم نے قدرے تفصیل اِختیار کی ہے، جیسا کہ میراث کا بیان اور اس کے حصص کی تفصیل قرآنِ کریم نے ایک مکمل رُکوع میں بیان فرما دی ہے، اور یہ قانونِ میراث اپنی اس مفصل صورت میں قرآنِ کریم کا اعجاز ہے۔

اسی طرح دعوت وتبلیغِ دِین کے موضوع سے متعلق قرآنِ کریم نے مفصل ہدایات دی ہیں، کیونکہ یہ موضوع ایسا تھا جس میں اِفراط وتفریط کا اندیشہ تھا کہ بعض لوگ تو اسے بالکلیہ ہی ترک کردیں گے، اور بعض اس میں اتنا غلو کریں گے کہ دعوت بجائے سودمند اور نافع ہونے کے مضر ہوجائے گی۔

اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے اَحکامات کو جزئیات کے ساتھ خوب کھول کھول کر متعدّد مقامات پر بیان فرمایا، اور صرف اسی پر اِکتفاء نہیں فرمایا بلکہ انبیائے کرام علیہم السلام کے طریقِ دعوت کو ذکر فرما کر ہر جزئی کی مثال بھی بیان فرمائی ہے۔''

ارشادِ ربانی

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿١٢٥﴾ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ ۖ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ ﴿١٢٦﴾ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ﴿١٢٧﴾ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ﴿١٢٨﴾ (النحل)

ترجمہ:- بلا اپنے رَبّ کی راہ پر پکی باتیں سمجھا کر اور نصیحت سنا کر بھلی طرح اور اِلزام دے ان کو جس طرح بہتر ہو، تیرا رَبّ ہی بہتر جانتا ہے اس کو جو بھول گیا اس کی راہ سے اور وہی بہتر جانتا ہے ان کو جو راہ پر ہیں۔ اور اگر بدلہ لو تو بدلہ لو اسی قدر جس قدر کہ تم کو تکلیف پہنچائی جائے، اور اگر صبر کرو تو یہ بہتر ہے صبر کرنے والوں کو۔ اور تو صبر کر اور تجھ سے صبر ہوسکے اللہ ہی کی مدد سے اور نہ اُن پر غم کھا اور

تنگ مت ہوان کے فریب سے، اللہ ساتھ ہے اُن کے جو پرہیز گار ہیں اور جو نیکی کرتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات

سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت و رسالت کے اِثبات سے مقصود یہ تھا کہ اُمت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اَحکام کی تعمیل کر کے رسالت کے حقوق ادا کریں، مذکورہ آیات میں خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اَدائے رسالت کے حقوق اور آداب کی تعلیم ہے، جس کے عموم میں تمام مؤمنین شریک ہیں، مختصر تفسیر یہ ہے:۔

آپ اپنے رَبّ کی راہ (یعنی دِینِ اسلام) کی طرف (لوگوں کو) حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے بلایئے (حکمت سے وہ طریقۂ دعوت مراد ہے جس میں مخاطب کے احوال کی رعایت سے ایسی تدبیر اِختیار کی گئی ہو جو مخاطب کے دِل پر اثر انداز ہو سکے اور نصیحت سے مراد یہ ہے کہ خیر خواہی و ہمدردی کے جذبے سے بات کہی جائے، اور اچھی نصیحت سے مراد یہ ہے کہ عنوان بھی نرم ہو، دِل خراش اور توہین آمیز نہ ہو) اور اُن کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے (یعنی اگر بحث مباحثے کی نوبت آ جائے تو وہ بھی شدّت اور خشونت سے اور مخاطب پر اِلزام تراشی اور بے انصافی سے خالی ہونا چاہئے، بس اتنا کام آپ کا ہے، پھر اس تحقیق میں نہ پڑیئے کہ کس نے مانا، کس نے نہیں مانا، یہ کام خدا تعالیٰ کا ہے، پس) آپ کا رَبّ خوب جانتا ہے (اس شخص کو بھی جو اس کے راستے سے گم ہو گیا اور وہی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے، اور (اگر کبھی مخاطب علمی بحث و مباحثے کی حد سے آگے بڑھ کر عملی جدال اور ہاتھ یا زبان سے ایذاء پہنچانے لگیں تو اس میں آپؐ کو اور آپؐ کے متبعین کو بدلہ لینا بھی جائز ہے اور صبر کرنا بھی، پس) اگر (پہلی صورت اختیار کرو یعنی) بدلہ لینے لگو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ برتاؤ کیا گیا ہے، (اس سے زیادتی نہ

کرو) اور اگر (دُوسری صورت یعنی ایذاؤں پر) صبر کرو تو وہ (صبر کرنا) صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھی بات ہے (کہ مخالف پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے اور دیکھنے والوں پر بھی اور آخرت میں موجبِ اَجرِ عظیم ہے) اور صبر کرنا اگرچہ سبھی کے لئے بہتر ہے، مگر آپؐ کی عظمتِ شان کے لحاظ سے آپؐ کو خصوصیت کے ساتھ حکم ہے کہ آپؐ اِنتقام کی صورت اختیار نہ کریں بلکہ) آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خدا ہی کی توفیقِ خاص سے ہے (اس لئے آپ اطمینان رکھیں کہ صبر میں آپ کو دُشواری نہ ہوگی) اور ان لوگوں (یعنی ان کے ایمان نہ لانے پر یا مسلمانوں کو ستانے) پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ تدبیریں کیا کرتے ہیں اس سے تنگ دِل نہ ہوجیے (ان کی مخالف تدبیروں سے آپ کا کوئی ضرر نہ ہوگا، کیونکہ آپؐ کو اِحسان اور تقویٰ کی صفات حاصل ہیں اور) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے (یعنی ان کا مددگار ہوتا ہے) جو پرہیزگار ہوتے ہیں اور نیک کردار ہوتے ہیں۔

معارف ومسائل

دعوت وتبلیغ کا مکمل نصاب

اس آیت میں دعوت وتبلیغ کا مکمل نصاب، اس کے اُصول اور آداب کی پوری تفصیل چند کلمات میں سموئی ہوئی ہے۔ تفسیرِ قرطبی میں ہے کہ حضرت ہرم ابن حیانؒ کی موت کا وقت آیا تو عزیزوں نے درخواست کی کہ ہمیں کچھ وصیت فرمایئے، تو فرمایا کہ: وصیت تو لوگ اَموال کی کیا کرتے ہیں، وہ میرے پاس ہے نہیں، لیکن میں تم کو اللہ کی آیات خصوصاً سورۂ نحل کی آخری آیتوں کی وصیت کرتا ہوں کہ ان پر مضبوطی سے قائم رہو، وہ آیات یہی ہیں جو اُوپر مذکور ہوئیں۔

دعوت کا مفہوم

''دعوۃ'' کے لفظی معنی بلانے کے ہیں، انبیاء علیہم السلام کا پہلا فرضِ منصبی لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا ہے، پھر تمام تعلیماتِ نبوّت ورسالت اسی دعوت کی تشریحات ہیں، قرآن

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صفت ''داعی الی اللہ'' ہونا ہے، ''وَدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا'' (احزاب: ۴۶)، ''یٰقَوْمَنَآ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰہِ'' (احقاف: ۳۱)۔

اُمت پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر دعوت الی اللہ کو فرض کیا گیا ہے، سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہے:-

وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ (آلِ عمران: ۱۰۴)

ترجمہ:- تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونا چاہئے جو لوگوں کو خیر کی طرف دعوت دیں (یعنی) نیک کاموں کا حکم کریں اور بُرے کاموں سے روکیں۔

اور ایک آیت میں ارشاد ہے:-

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ

ترجمہ:- گفتار کے اعتبار سے اس شخص سے اچھا کون ہوسکتا ہے جس نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا۔

تعبیر میں کبھی اس لفظ کو ''دعوت الی اللہ'' کا عنوان دیا جاتا ہے، اور کبھی ''دعوت الی الخیر'' کا اور کبھی ''دعوت الی سبیل اللہ'' کا، حاصل سب کا ایک ہے، کیونکہ اللہ کی طرف بلانے سے اس کے دِین اور صراطِ مستقیم ہی کی طرف بلانا مقصود ہے۔

''اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ'' اس میں اللہ جل شانہ کی خاص صفت رَبّ، اور پھر اُس کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اضافت میں اشارہ ہے کہ دعوت کا کام صفتِ رُبوبیت اور تربیت سے تعلق رکھتا ہے، جس طرح حق تعالیٰ شانہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت فرمائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تربیت کے انداز سے دعوت دینا چاہئے، جس میں مخاطب کے حالات کی رعایت کرکے وہ طرز اِختیار کیا جائے کہ مخاطب پر بار نہ ہو، اور اس کی تأثیر زیادہ سے زیادہ ہو، خود لفظ ''دعوت'' بھی اس مفہوم کو اَدا کرتا ہے کہ پیغمبر کا کام صرف اللہ

کے اَحکام پہنچادینا اور سنادینا نہیں بلکہ لوگوں کو اِن کی تعمیل کی طرف دعوت دینا ہے، اور ظاہر ہے کہ کسی کو دعوت دینے والا اس کے ساتھ ایسا خطاب نہیں کیا کرتا جس سے مخاطب کو وحشت ونفرت ہو یا جس میں اس کے ساتھ اِستہزاء وتمسخر کیا گیا ہو۔

حکمت کی تعریف

"بِالْحِكْمَةِ" لفظِ حکمت قرآنِ کریم میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوا ہے، اس جگہ بعض اَئمہ تفسیر نے حکمت سے مراد قرآنِ کریم، بعض نے قرآن وسنت، بعض نے حجتِ قطعیہ کو قرار دیا ہے، اور "رُوح المعانی" نے بحوالہ بحرِمحیط حکمت کی تفسیر یہ کی ہے:-

انها الكلام الصواب الواقع من النفس أجمل موقع۔ (روح)

یعنی حکمت اس دُرست کلام کا نام ہے جو اِنسان کے دِل میں اُتر جائے۔

اس تفسیر میں تمام اقوال جمع ہوجاتے ہیں، اور صاحبِ رُوح المعانی نے بھی تقریباً یہی مطلب ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ: "حکمت سے مراد وہ بصیرت ہے جس کے ذریعے انسان مقتضیاتِ احوال کو معلوم کرکے اس کے مناسب کلام کرے، وقت اور موقع ایسا تلاش کرے کہ مخاطب پر بار نہ ہو، نرمی کی جگہ نرمی، اور سختی کی جگہ سختی اختیار کرے، اور جہاں یہ سمجھے کہ صراحۃً کہنے میں مخاطب کو شرمندگی ہوگی، وہاں اشارات سے کلام کرے، یا کوئی ایسا عنوان اختیار کرے کہ مخاطب کو نہ شرمندگی ہو اور نہ اس کے دِل میں اپنے خیال پر جمنے کا تعصب پیدا ہو۔

موعظۂ حسنہ کی تعریف

"اَلْمَوْعِظَةُ" موعظۃ اور وعظ کے لغوی معنی یہ ہیں کہ کسی خیرخواہی کی بات کو ایسی طرح کہا جائے کہ اس سے مخاطب کا دِل قبولیت کے لئے نرم ہوجائے، مثلاً اس کے ساتھ قبول کرنے کے ثواب اور فوائد اور نہ کرنے کے عذاب ومفاسد ذکر کئے جائیں۔

(قاموس ومفرداتِ راغب)

"الْحَسَنَةُ" کے معنی یہ ہیں کہ بیان اور عنوان بھی ایسا ہو جس سے مخاطب کا قلب مطمئن ہو، اس کے شکوک وشبہات دُور ہوں، اور مخاطب یہ محسوس کر لے کہ آپ کی اس میں کوئی غرض نہیں، صرف اس کی خیر خواہی کے لئے کہہ رہے ہیں۔

''موعظہ'' کے لفظ سے خیر خواہی کی بات مؤثر انداز میں کہنا تو واضح ہو گیا تھا، مگر خیر خواہی کی بات بعض اوقات دِل خراش عنوان سے یا اس طرح بھی کہی جاتی ہے جس سے مخاطب اپنی اہانت محسوس کرے (رُوح المعانی)۔ اس طریقے کو چھوڑنے کے لئے لفظِ ''حسنہ'' کا اضافہ کر دیا گیا۔

مجادلۃ بالّتی ھی أحسن کا مفہوم

"وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ" لفظ ''جادل'' مجادلہ سے مشتق ہے، اس جگہ مجادلہ سے مراد بحث ومناظرہ ہے، اور "بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ" سے مراد یہ ہے کہ اگر دعوت میں کہیں بحث ومناظرے کی ضرورت پیش آجائے تو وہ مباحثہ بھی اچھے طریقے سے ہونا چاہئے۔ ''رُوح المعانی'' میں ہے کہ اچھے طریقے سے یہ مراد ہے کہ گفتگو میں لطف اور نرمی اختیار کی جائے، دلائل ایسے پیش کئے جائیں جو مخاطب آسانی سے سمجھ سکے، دلیل میں وہ مقدمات پیش کئے جائیں جو مشہور ومعروف ہوں، تاکہ مخاطب کے شکوک دُور ہوں اور وہ ہٹ دھرمی کے راستے پر نہ پڑ جائے۔ اور قرآنِ کریم کی دُوسری آیات اس پر شاہد ہیں کہ یہ احسان فی المجادلہ صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں، اہلِ کتاب کے بارے میں تو خصوصیت کے ساتھ قرآن کا ارشاد ہے: "وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ"، اور دُوسری آیت میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو "قُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا" کی ہدایت دے کر یہ بھی بتلا دیا کہ فرعون جیسے سرکش کافر کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرنا ہے۔

مروّجہ مجادلہ کے نقصانات

آیتِ مذکورہ کی تفسیر میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اصل مقصودِ شرع دعوت الی اللہ

ہے، جس کے دو اُصول ہیں، حکمت اور موعظۂ حسنہ، مجادلہ کی صورت کبھی سر پر آپڑے تو اس کے لئے بھی ''اَحسن'' کی قید لگا کر اِجازت دے دی گئی ہے، مگر وہ حقیقۃً دعوت کا کوئی شعبہ نہیں، بلکہ اس کے منفی پہلو کی ایک تدبیر ہے جس میں قرآنِ کریم نے "بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ" کی قید لگا کر جس طرح یہ بتلا دیا کہ وہ نرمی، خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبے سے ہونا چاہئے اور اس میں دلائلِ واضحہ مخاطب کے مناسبِ حال بیان کرنے چاہئیں، مخاطب کی توہین وتحقیر سے کلی اجتناب کرنا چاہئے۔

اسی طرح اس کے اَحسن ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خود متکلم کے لئے مضر نہ ہو جائے، کہ اس میں اخلاقِ رذیلہ، حسد، بغض، تکبر، جاہ پسندی وغیرہ پیدا نہ ہو جائیں، جو باطنی گناہِ کبیرہ ہیں، اور آج کل کے بحث ومباحثہ، مناظرہ، مجادلہ میں شاذ ونادر ہی کوئی اللہ کا بندہ ان سے نجات پائے تو ممکن ہے، ورنہ عادۃً ان سے بچنا سخت دُشوار ہے۔

اِمام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: جس طرح شراب اُمّ الخبائث ہے کہ خود بھی بڑا گناہ ہے اور دُوسرے بڑے بڑے جسمانی گناہوں کا ذریعہ بھی ہے، اسی طرح بحث ومباحثے میں جب مقصود مخاطب پر غلبہ پانا اور اپنا علمی تفوّق لوگوں پر ظاہر کرنا ہو جائے تو وہ بھی باطن کے لئے اُمّ الخبائث ہے جس کے نتیجے میں بہت سے رُوحانی جرائم پیدا ہوتے ہیں، مثلاً حسد، بغض، تکبر، غیبت، دُوسرے کے عیوب کا تجسّس، اس کی بُرائی سے خوش اور بھلائی سے رنجیدہ ہونا، قبولِ حق سے اِستکبار، دُوسرے کے قول پر اِنصاف و اِعتدال کے ساتھ غور کرنے کے بجائے جواب دہی کی فکر، خواہ اس میں قرآن وسنت میں کیسی ہی تأویلات کرنا پڑیں۔

یہ تو وہ مہلکات ہیں جن میں باوقار علماء ہی مبتلا ہوتے ہیں، اور معاملہ جب ان کے متبعین میں پہنچتا ہے تو دست وگریبان اور جنگ وجدال کے معرکے گرم ہو جاتے ہیں، اِناللہ، حضرت اِمام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا:-

علم تو اہلِ علم وفضل کے مابین ایک رحم متصل (رشتۂ اُخوّت وبرادری)

ہے، تو وہ لوگ جنھوں نے علم ہی کو عداوت بنالیا ہے، وہ دُوسروں کو اپنے مذہب کی اقتداء کی دعوت کس طرح دیتے ہیں، اُن کے پیشِ نظر دُوسرے پر غلبہ پانا ہی ہے تو پھر اُن سے باہمی اُنس ومودّت اور مروّت کا تصوّر کیسے کیا جاسکتا ہے؟ اور ایک انسان کے لئے اس سے بڑھ کر شر اور بُرائی اور کیا ہوگی کہ وہ اس کو منافقین کے اخلاق میں مبتلا کردے اور مؤمنین ومتقین کے اخلاق سے محروم کردے۔

اِمام غزالی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ علمِ دِین اور دعوتِ حق میں اِشتغال رکھنے والا یا تو اُصولِ صحیحہ کے تابع اور مہلک خطرات سے مجتنب رہ کر سعادتِ اَبدی حاصل کرلیتا ہے، یا پھر اس مقام سے گرتا ہے تو شقاوتِ اَبدی کی طرف جاتا ہے، اُس کا درمیان میں رہنا بہت مستبعد ہے، کیونکہ جو علم نافع نہ ہو وہ عذاب ہی ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا یَوْمَ الْقِیَامَةِ عَالِمٌ لَّمْ یَنْفَعْهُ اللهُ بِعِلْمِهٖ۔

ترجمہ:- سب سے زیادہ سخت عذاب میں قیامت کے دن وہ عالم ہوگا جس کے علم سے اللہ تعالیٰ نے اس کو نفع نہ بخشا ہو۔

ایک دُوسری حدیث صحیح میں ہے:-

لَا تَتَعَلَّمُوا الْعِلْمَ لِتُبَاهُوْا بِهِ الْعُلَمَآءَ وَلِتُمَارُوْا بِهِ السُّفَهَآءَ وَلِتَصْرِفُوْا بِهٖ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَیْکُمْ، فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِکَ فَهُوَ فِی النَّارِ۔ (ابنِ ماجہ من حدیث جابر باسناد صحیح وکذا فی تخریج العراقی علی الاحیاء)

ترجمہ:- علمِ دِین کو اس غرض سے نہ سیکھو کہ اس کے ذریعے دُوسرے علماء کے مقابلے میں فخر وعزّت حاصل کرو، یا کم علم لوگوں سے جھگڑے کرو، یا اس کے ذریعے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کرلو، اور جو ایسا کرے گا وہ آگ میں ہے۔

آیتِ مذکورہ میں دعوت کے لئے تین چیزوں کا ذکر ہے، اوّل حکمت، دُوسرے موعظۃ حسنہ، تیسرے مجادلۃ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ۔ بعض حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ یہ تین چیزیں مخاطبین کی تین قسموں کی بنا پر ہیں، دعوت بالحکمۃ، اہلِ علم وفہم کے لئے، دعوت بالموعظہ، عوام کے لئے، مجادلہ ان لوگوں کے لئے جن کے دِلوں میں شکوک وشبہات ہوں یا جو عناد اور ہٹ دھرمی کے سبب بات ماننے سے منکر ہوں۔

سیّدی حضرت حکیم الاُمۃ نے ''بیان القرآن'' میں فرمایا کہ: ان تین چیزوں کے مخاطب الگ الگ تین قسم کی جماعتیں ہونا سیاقِ آیات کے لحاظ سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ (انتہیٰ)

ظاہر یہ ہے کہ یہ آدابِ دعوت ہر ایک کے لئے استعمال کرنے ہیں، کہ دعوت میں سب سے پہلے حکمت سے مخاطب کے حالات کا جائزہ لے کر اس کے مناسب کلام تجویز کرنا ہے، پھر اس کلام میں خیرخواہی و ہمدردی کے جذبے کے ساتھ ایسے شواہد اور دلائل سامنے لانا ہے جن سے مخاطب مطمئن ہو سکے، اور طرزِ بیان وکلام ایسا مشفقانہ اور نرم رکھنا ہے کہ مخاطب کو اس کا یقین ہو جائے کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں میری ہی مصلحت اور خیرخواہی کے لئے کہہ رہے ہیں، مجھے شرمندہ کرنا یا میری حیثیت کو مجروح کرنا ان کا مقصد نہیں۔

ایک اہم نکتہ

البتہ صاحبِ رُوح المعانی نے اس جگہ ایک نہایت لطیف نکتہ یہ بیان فرمایا کہ آیت کے نسق سے معلوم ہوتا ہے کہ اُصولِ دعوت اصل میں دو ہی چیزیں ہیں، حکمت اور موعظت۔ تیسری چیز مجادلہ، اُصولِ دعوت میں داخل نہیں، ہاں طریقِ دعوت میں کبھی اس کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے۔

صاحبِ رُوح المعانی کا استدلال اس پر یہ ہے کہ اگر یہ تینوں چیزیں اُصولِ دعوت ہوتیں تو مقتضائے مقام یہ تھا کہ تینوں چیزوں کو عطف کے ساتھ اس طرح بیان کیا

جاتا:"بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ والجدال الأحسن"،مگر قرآنِ حکیم نے حکمت وموعظت کوتو عطف کے ساتھ ایک ہی نسق میں بیان فرمایا، اور مجادلہ کے لئے الگ جملہ "جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ" اختیار کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجادلہ فی العلم، دراصل دعوت الی اللہ کا رُکن یا شرط نہیں، بلکہ طریقِ دعوت میں پیش آنے والے معاملات کے متعلق ایک ہدایت ہے، جیسا کہ اس کے بعد کی آیت میں صبر کی تلقین فرمائی ہے، کیونکہ طریقِ دعوت میں لوگوں کی ایذاؤں پر صبر کرنا ناگزیر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اُصولِ دعوت دو چیزیں ہیں، حکمت اور موعظت، جن سے کوئی دعوت خالی نہ ہونا چاہئے، خواہ علماء وخواص کو ہو یا عوام الناس کو، البتہ دعوت میں کسی وقت ایسے لوگوں سے بھی سابقہ پڑ جاتا ہے جو شکوک واوہام میں مبتلا اور داعی کے ساتھ بحث مباحثے پر آمادہ ہیں تو ایسی حالت میں مجادلہ کی تعلیم دی گئی، مگر اس کے ساتھ "بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ" کی قید لگا کر بتلا دیا کہ جو مجادلہ اس شرط سے خالی ہو اس کی شریعت میں کوئی حیثیت نہیں۔

دعوت الی اللہ کے پیغمبرانہ آداب

دعوت الی اللہ دراصل انبیاء علیہم السلام کا منصب ہے، اُمت کے علماء اس منصب کو ان کا نائب ہونے کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں، تو لازم یہ ہے کہ اس کے آداب اور طریقے بھی انہی سے سیکھیں، جو دعوت اُن طریقوں پر نہ رہے وہ دعوت کے بجائے عداوت اور جنگ وجدال کا موجب ہوجاتی ہے۔

دعوتِ پیغمبرانہ کے اُصول میں جو ہدایت قرآنِ کریم میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے لئے نقل کی گئی ہے کہ: "فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾" (طٰہٰ) یعنی "فرعون سے نرم بات کرو، شاید وہ سمجھ لے یا ڈر جائے" یہ ہر داعیِ حق کو ہر وقت سامنے رکھنا ضروری ہے کہ فرعون جیسا سرکش کافر جس کی موت بھی علمِ الٰہی میں کفر ہی پر ہونے والی

تھی، اس کی طرف بھی جب اللہ تعالیٰ اپنے داعی کو بھیجتے ہیں تو نرم گفتار کی ہدایت کے ساتھ بھیجتے ہیں۔ آج ہم جن لوگوں کو دعوت دیتے ہیں وہ فرعون سے زیادہ گمراہ نہیں، اور ہم میں سے کوئی موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے برابر ہادی و داعی نہیں، تو جو حق اللہ تعالیٰ نے اپنے دونوں پیغمبروں کو نہیں دیا کہ مخاطب سے سخت کلامی کریں، اس پر فقرے کسیں، اس کی توہین کریں، وہ حق ہمیں کہاں سے حاصل ہو گیا۔

قرآنِ کریم انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ اور کفار کے مجادلات سے بھرا ہوا ہے، اس میں کہیں نظر نہیں آتا کہ کسی اللہ کے رسول نے حق کے خلاف ان پر طعنہ زنی کرنے والوں کے جواب میں کوئی ثقیل کلمہ بھی بولا ہو، اس کی چند مثالیں دیکھئے:-

سورۂ اَعراف کے ساتویں رُکوع میں آیات ۵۹ سے ۶۷ تک دو پیغمبر حضرت نوح اور حضرت ہود علیہما السلام کے ساتھ ان کی قوم کے مجادلے اور سخت سست اِلزامات کے جواب میں ان بزرگوں کے کلمات قابلِ ملاحظہ ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے وہ اُولوالعزم پیغمبر ہیں جن کی طولِ عمر دُنیا میں مشہور ہے، ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کی دعوت و تبلیغ، اصلاح وارشاد میں دن رات مشغول رہے، مگر اس بدبخت قوم میں سے معدودے چند کے علاوہ کسی نے ان کی بات نہ مانی، اور تو اور خود ان کا ایک لڑکا اور بیوی کافروں کے ساتھ لگے رہے، ان کی جگہ آج کا کوئی مدعیٔ دعوت و اصلاح ہوتا تو اس قوم کے ساتھ اس کا لب ولہجہ کیسا ہوتا، اندازہ لگایئے، پھر دیکھئے کہ ان کی تمام ہمدردی و خیر خواہی کی دعوت کے جواب میں قوم نے کیا کہا:-

اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾ (اَعراف)

ترجمہ:- ہم تو آپ کو کھلی ہوئی گمراہی میں پاتے ہیں۔

ادھر سے اللہ کے پیغمبر بجائے اس کے کہ اس سرکش قوم کی گمراہیوں، بدکاریوں کا پردہ چاک کرتے، جواب میں کیا فرماتے ہیں:-

يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۱﴾

ترجمہ:- میرے بھائیو! مجھ میں کوئی گمراہی نہیں میں تو ربّ العالمین کا رسول اور قاصد ہوں (تمہارے فائدے کی باتیں بتلاتا ہوں)۔

ان کے بعد آنے والے دُوسرے اللہ کے رسول حضرت ہود علیہ السلام کو ان کی قوم نے معجزات دیکھنے کے باوجود اَز راہِ عناد کہا کہ آپ نے اپنے دعوے پر کوئی دلیل پیش نہیں کی، اور ہم آپ کے کہنے سے اپنے معبودوں (بتوں) کو چھوڑنے والے نہیں، ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تم نے جو ہمارے معبودوں کی شان میں بے ادبی کی ہے، اس کی وجہ سے تم جنون میں مبتلا ہوگئے ہو۔ حضرت ہود علیہ السلام نے یہ سب کچھ سن کر جواب دیا:-

اِنِّیۡۤ اُشۡهِدُ اللّٰهَ وَاشۡهَدُوۡۤا اَنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِکُوۡنَ ﴿۵۴﴾ (سورۂ ہود)

یعنی میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں اُن بتوں سے بَری اور بیزار ہوں جن کو تم اللہ کا شریک مانتے ہو۔

اور سورۂ اَعراف میں ہے کہ ان کی قوم نے اُن کو کہا:-

اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیۡ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الۡكٰذِبِیۡنَ ﴿۶۶﴾ (اَعراف)

ترجمہ:- ہم تو آپ کو بیوقوفی میں مبتلا سمجھتے ہیں، اور ہمارا خیال یہ ہے کہ آپ جھوٹ بولنے والوں میں سے ہیں۔

قوم کے اس دِل آزار خطاب کے جواب میں اللہ کے رسول ہود علیہ السلام نہ اُن پر کوئی فقرہ کستے ہیں، نہ اُن کی بے راہی اور کذب و افتراء علی اللہ کی کوئی بات کہتے ہیں، جواب کیا ہے صرف یہ کہ:-

یٰقَوۡمِ لَیۡسَ بِیۡ سَفَاهَةٌ وَّلٰکِنِّیۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۶۷﴾ (اَعراف)

ترجمہ:- اے میری برادری کے لوگو! مجھ میں کوئی بے وقوفی یا کم عقلی نہیں، میں تو ربّ العالمین کا رسول ہوں۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم کو حسبِ دستورِ انبیاء، اللہ کی طرف دعوت دی اور ان میں جو بڑا عیب ناپ تول میں کمی کرنے کا تھا، اس سے باز آنے کی ہدایت فرمائی، تو

ان کی قوم نے تمسخر کیا، اورتوہین آمیز خطاب کیا:-

یٰشُعَیۡبُ اَصَلٰوتُكَ تَاۡمُرُكَ اَنۡ نَّتۡرُكَ مَا یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ اَوۡ اَنۡ نَّفۡعَلَ فِیۡۤ اَمۡوَالِنَا

مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنۡتَ الۡحَلِیۡمُ الرَّشِیۡدُ ﴿۸۷﴾ (سورۂ ہود)

ترجمہ:- اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں، اور یہ کہ جن اَموال کے ہم مالک ہیں ان میں اپنی مرضی کے موافق جو چاہیں نہ کریں، واقعی آپ ہیں بڑے عقل مند دِین پر چلنے والے۔

انہوں نے ایک تو یہ طعنہ دیا کہ تم جو نماز پڑھتے ہو، یہی تمہیں بے وقوفی کے کام سکھاتی ہے، دُوسرے یہ کہ مال ہمارے ہیں، اُن کی خرید وفروخت کے معاملات میں تمہارا یا خدا کا کیا دخل ہے؟ ہم جس طرح چاہیں ان میں تصرف کا حق رکھتے ہیں۔ تیسرا جملہ تمسخر واِستہزاء کا یہ کہا کہ آپ ہیں بڑے عقل مند بہت دِین پر چلنے والے۔

معلوم ہوا کہ یہ لادِینی معاشیات کے پچاری صرف آج نہیں پیدا ہوئے، ان کے بھی کچھ اسلاف ہیں جن کا نظریہ وہی تھا جو آج کے بعض نام کے مسلمان کہہ رہے ہیں، کہ ہم مسلمان ہیں، اسلام کو مانتے ہیں، مگر معاشیات میں ہم سوشل اِزم کو اِختیار کرتے ہیں، اس میں اسلام کا کیا دخل ہے؟ بہرحال اس ظالم قوم کے اس مسخرے پن اور دِل آزار گفتگو کا جواب اللہ کا رسول کیا دیتا ہے، دیکھئے:-

قَالَ یٰقَوۡمِ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ كُنۡتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّیۡ وَرَزَقَنِیۡ مِنۡهُ

رِزۡقًا حَسَنًا ؕ وَمَاۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اُخَالِفَكُمۡ اِلٰی مَاۤ اَنۡهٰىكُمۡ عَنۡهُ ؕ اِنۡ اُرِیۡدُ

اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ ؕ وَمَا تَوۡفِیۡقِیۡۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَیۡهِ تَوَكَّلۡتُ

وَاِلَیۡهِ اُنِیۡبُ ﴿۸۸﴾ (سورۂ ہود)

ترجمہ:- اے میری قوم! بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رَبّ کی طرف سے دلیل پر قائم ہوں اور اس نے مجھ کو اپنی طرف سے عمدہ

دولت یعنی نبوّت دی ہو تو پھر میں کیسے اس کی تبلیغ کروں، اور میں خود بھی تو اس کے خلاف کوئی عمل نہیں کرتا جو تمہیں بتلاتا ہوں، میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں، جہاں تک میری قدرت میں ہے اور مجھ کو جو کچھ اصلاح اور عمل کی توفیق ہو جاتی ہے وہ صرف اللہ ہی کی مدد سے ہے، میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں، اور تمام اُمور میں اُسی کی طرف رُجوع کرتا ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجنے کے وقت جو نرم گفتار کی ہدایت من جانب اللہ دی گئی تھی اس کی پوری تعمیل کرنے کے باوجود فرعون کا خطاب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ تھا:-

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿١٨﴾ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٩﴾ (سورۂ شعراء)

ترجمہ:- فرعون کہنے لگا (آہا تم ہو) کیا ہم نے تم کو بچپن میں پرورش نہیں کیا، اور تم اس عمر میں برسوں ہمارے پاس رہا سہا کئے، اور تم نے اپنی وہ حرکت بھی کی تھی جو کی تھی (یعنی قبطی کو قتل کیا تھا) اور تم بڑے ناشکرے ہو۔

اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اپنا یہ احسان بھی جتلایا کہ بچپن میں ہم نے تجھے پالا ہے، پھر یہ اِحسان بھی جتلایا کہ بڑے ہونے کے بعد بھی کافی مدّت تک تم ہمارے پاس رہے، پھر یہ عتاب کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے جو ایک قبطی بغیر ارادۂ قتل کے مارا گیا تھا، اس پر غصّے و ناراضی کا اظہار کر کے یہ بھی کہا ہے کہ تم کافروں میں سے ہو گئے۔

یہاں ''کافروں'' میں سے ہونے کے لغوی معنی بھی ہو سکتے ہیں، یعنی ناشکری کرنے والا، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے تو تم پر احسانات کئے اور تم نے ہمارے ایک آدمی کو مار ڈالا جو اِحسان کی ناشکری تھی، اور اصطلاحی معنی بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ فرعون خود

خدائی کا دعوے دار تھا، تو جو اس کی خدائی کا منکر ہوا وہ کافر ہوا۔

اب اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب سنئے، جو پیغمبرانہ آدابِ دعوت اور پیغمبرانہ اخلاق کا شاہکار ہے، کہ اس میں سب سے پہلے تو اس کمزوری اور کوتاہی کا اعتراف کرلیا جو اُن سے سرزد ہوگئی تھی، یعنی اسرائیلی آدمی سے لڑنے والے قبطی کو ہٹانے کے لئے ایک مکا اس کے مارا تھا، جس سے وہ مرگیا، تو گو یہ قتل عمداً اِرادۃً نہیں تھا، مگر کوئی دِینی تقاضا بھی نہیں تھا، بلکہ شریعتِ موسوی کے لحاظ سے بھی وہ شخص قتل کا مستحق نہیں تھا، اس لئے پہلے یہ اِعتراف فرمایا:-

فَعَلْتُهَآ إِذًا وَّأَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾ (سورۂ شعراء)

یعنی میں نے یہ کام اُس وقت کیا تھا، جبکہ میں ناواقف تھا۔

مراد یہ ہے کہ یہ فعل عطائے نبوّت سے پہلے سرزد ہوگیا تھا، جبکہ مجھے اس بارے میں اللہ کا کوئی حکم معلوم نہیں تھا، اس کے بعد فرمایا:-

فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾ (سورۂ شعراء)

ترجمہ:- پھر مجھ کو ڈر لگا تو میں تمہارے یہاں سے مفرور ہوگیا، پھر مجھ کو میرے رَبّ نے دانش مندی عطا فرمائی اور مجھ کو اپنے پیغمبروں میں شامل کردیا۔

پھر اس احسان کے جتلانے کا جواب یہ دیا کہ تمہارا یہ احسان جتانا صحیح نہیں، کیونکہ میری پرورِش کا معاملہ تمہارے ہی ظلم وعدوان کا نتیجہ تھا، کہ تم نے اسرائیلی بچوں کے قتل کا حکم دے رکھا تھا، اس لئے والدہ نے مجبور ہوکر مجھے دریا میں ڈالا اور تمہارے گھر تک پہنچنے کی نوبت آئی، فرمایا:-

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾ (سورۂ شعراء)

ترجمہ:- (رہا احسان جتلانا پرورِش کا) سو یہ وہ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر

اِحسان رکھتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو سخت ذِلت میں ڈال رکھا تھا۔

اس کے بعد فرعون نے جب سوال کیا: "وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ" یعنی رَبّ العالمین کون ہے اور کیا ہے؟ تو جواب میں فرمایا کہ: وہ رَبّ ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس سب کا، اس پر فرعون نے بطور اِستہزاء کے حاضرین سے کہا: "اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ" یعنی تم سن رہے ہو کہ یہ کیسی بے عقلی کی باتیں کہہ رہے ہیں، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:-

رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۶﴾

یعنی تمہارا اور تمہارے باپ دادوں کا بھی وہی رَبّ پروردگار ہے۔

اس پر فرعون نے جھنجھلا کر کہا:-

اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾

یعنی یہ جو تمہاری طرف اللہ کے رسول ہونے کا مدعی ہے وہ دیوانہ ہے۔

مجنون، دیوانہ کا خطاب دینے پر بھی موسیٰ علیہ السلام بجائے اس کے کہ ان کا دیوانہ ہونا اور اپنا عاقل ہونا ثابت کرتے، اس طرف کوئی اِلتفات ہی نہیں کیا، بلکہ اللہ رَبّ العالمین کی ایک اور صفت بیان فرمادی:-

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ (الشعراء)

ترجمہ:- وہ رَبّ ہے مشرق و مغرب کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اگر تم کو کچھ عقل ہو۔

یہ ایک طویل مکالمہ ہے جو فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ہو رہا ہے، جو سورۂ شعراء کے تین رُکوع میں بیان ہوا ہے، اللہ کے مقبول رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس مکالمے کو اوّل سے آخر تک دیکھئے، نہ کہیں جذبات کا اظہار ہے، نہ اس کی بدگوئی کا جواب ہے، نہ اس کی سخت کلامی کے جواب میں کوئی سخت کلمہ ہے، بلکہ مسلسل اللہ جل شانہٗ کی صفاتِ کمال کا بیان ہے، اور تبلیغ کا سلسلہ جاری ہے۔

یہ مختصر سا نمونہ ہے انبیاء علیہم السلام کے مجادلات کا جو اُنہوں نے اپنے معاند اور ضدی قوم کے مقابلے میں کئے گئے ہیں، اور مجادلہ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ جو قرآن کی تعلیم ہے اس کی عملی تشریح ہے۔

مجادلات کے علاوہ دعوت و تبلیغ میں ہر مخاطب اور ہر موقع کے مناسب کلام کرنے میں حکیمانہ اُصول اور عنوان و تعبیر میں حکمت و مصلحت کی رعایتیں بھی جو انبیاء علیہم السلام نے اختیار فرمائی ہیں، اور دعوت الی اللہ کو مقبول و مؤثر اور پائیدار بنانے کے لئے جو طرزِ عمل اختیار فرمایا ہے وہی دراصل دعوت کی رُوح ہے، اس کی تفصیلات تو تمام تعلیماتِ نبوی علیہ السلام میں پھیلی ہوئی ہیں، نمونے کے طور پر چند چیزیں دیکھئے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت میں اس کا بڑا لحاظ رہتا تھا کہ مخاطب پر بار نہ ہونے پائے، صحابہ کرامؓ جیسے عشاقِ رسول جن سے کسی وقت بھی اس کا احتمال نہ تھا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سننے سے اُکتا جائیں گے، اُن کے لئے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ وعظ و نصیحت روزانہ نہیں بلکہ ہفتے کے بعض دنوں میں فرماتے تھے، تاکہ لوگوں کے کاروبار کا حرج اور ان کی طبیعت پر بار نہ ہو۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہفتے کے بعض ایام ہی میں وعظ فرماتے تھے تاکہ ہم اُکتا نہ جائیں، اور دُوسروں کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہی ہدایت تھی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا۔ (صحیح بخاری، کتاب العلم)

ترجمہ:- لوگوں پر آسانی کرو، دُشواری نہ پیدا کرو، اور ان کو اللہ کی رحمت کی خوشخبری سناؤ، مایوس یا متنفر نہ کرو۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ تمہیں چاہئے کہ ربانی

حکماء، علماء اور فقہاء بنو۔ صحیح بخاری میں یہ قول نقل کر کے لفظ ''ربانی'' کی یہ تفسیر فرمائی کہ جو شخص دعوت و تبلیغ اور تعلیم میں تربیت کے اُصول کو ملحوظ رکھ کر پہلے آسان آسان باتیں بتلائے، جب لوگ اس کے عادی ہو جائیں تو اس وقت دُوسرے اَحکام بتلائے جو اِبتدائی مرحلے میں مشکل ہوتے ہیں، وہ عالمِ ربانی ہے۔ آج کل جو وعظ و تبلیغ کا اثر بہت کم ہوتا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عموماً اس کام کے کرنے والے ان اُصول و آداب کی رعایت نہیں کرتے، لمبی تقریریں، وقت بے وقت نصیحت، مخاطب کے حالات کو معلوم کئے بغیر اس کو کسی کام پر مجبور کرنا ان کی عادت بن گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و اصلاح کے کام میں اس کا بھی بڑا اہتمام تھا کہ مخاطب کی سبکی یا رُسوائی نہ ہو، اسی لئے جب کسی شخص کو دیکھتے کہ کسی غلط اور بُرے کام میں مبتلا ہے تو اس کو براہِ راست خطاب کرنے کے بجائے مجمعِ عام کو مخاطب کر کے فرماتے تھے:-

مَا بَالُ اَقْوَامٍ يَّفْعَلُوْنَ كَذَا

ترجمہ:- لوگوں کو کیا ہو گیا کہ فلاں کام کرتے ہیں۔

اس عام خطاب میں جس کو سنانا اصل مقصود ہوتا وہ بھی سن لیتا، اور دِل میں شرمندہ ہو کر اس کے چھوڑنے کی فکر میں لگ جاتا تھا۔

انبیاء علیہم السلام کی عام عادت یہی تھی کہ مخاطب کو شرمندگی سے بچاتے تھے، اسی لئے بعض اوقات جو کام مخاطب سے سرزد ہوا ہے اس کو اپنی طرف منسوب کر کے اصلاح کی کوشش فرماتے۔ سورۂ یٰسین میں ہے: ''وَمَالِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ'' یعنی ''مجھے کیا ہو گیا کہ میں اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت نہ کروں'' ظاہر ہے کہ یہ قاصدِ رسول تو ہر وقت عبادت میں مشغول تھے، سنانا اس مخاطب کو تھا جو مشغولِ عبادت نہیں ہے، مگر اس کام کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔

اور دعوت کے معنی دُوسرے کو اپنے پاس بلانا ہے، محض اس کے عیب بیان کرنا

نہیں، اور یہ بلانا بھی اُسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ متکلم اور مخاطب میں کوئی اشتراک ہو، اسی لئے قرآنِ عزیز میں انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا عنوان اکثر "یٰقَوْمِ" سے شروع ہوتا ہے، جس میں برادرانہ رشتے کا اشتراک پہلے جتلا کر آگے اصلاحی کلام کیا جاتا ہے کہ ہم تم تو ایک ہی برادری کے آدمی ہیں، کوئی منافرت نہیں ہونی چاہئے، یہ کہہ کر ان کی اصلاح کا کام شروع فرماتے ہیں۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوت کا خط ہرقل شاہِ رُوم کے نام بھیجا، اس میں اوّل تو شاہِ رُوم کو "عظیم الروم" کے لقب سے یاد فرمایا، جس میں اس کا جائز اِکرام ہے، کیونکہ اس میں اس کے عظیم ہونے کا اقرار بھی ہے، مگر رُومیوں کے لئے، اپنے لئے نہیں، اس کے بعد ایمان کی دعوت اس عنوان سے دی گئی:-

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ

(آلِ عمران: ۶۴)

ترجمہ:- اے اہلِ کتاب! اس کلمے کی طرف جلدی سے آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، یعنی یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔

جس میں پہلے آپس کا ایک مشترک نقطۂ وحدت ذکر کیا کہ توحید کا عقیدہ ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، اس کے بعد عیسائیوں کی غلطی پر متنبہ فرمایا۔

تعلیماتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دھیان دیا جائے تو ہر تعلیم و دعوت میں اسی طرح کے آداب و اُصول ملیں گے، آج کل اوّل تو دعوت و اصلاح اور اَمر بالمعروف و نہی عن المنکر کی طرف دھیان ہی نہ رہا، اور جو اس میں مشغول بھی ہیں انہوں نے صرف بحث ومباحثہ اور مخالف پر اِلزام تراشی، فقرے کسنے اور اس کی تحقیر و توہین کرنے کو دعوت و تبلیغ سمجھ لیا ہے، جو خلافِ سنت ہونے کی وجہ سے کبھی مؤثر و مفید نہیں ہوتا، وہ سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم

نے اسلام کی بڑی خدمت کی، اور حقیقت میں وہ لوگوں کو متنفر کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔

اِجتہادی اِختلاف

اسی لئے اَئمہ فقہاء اور اہلِ حق کا مسلک اس معاملے میں یہ تھا کہ علمی مسائل میں جھگڑا اور جدال ہرگز جائز نہیں سمجھتے تھے، دعوتِ حق کے لئے اتنا کافی ہے کہ جس کو خطا پر سمجھے، اس کو نرمی اور خیر خواہی کے عنوان سے دلائل کے ساتھ اس کی خطا پر متنبہ کردے، پھر وہ قبول کرلے تو بہتر ورنہ سکوت اختیار کرے، جھگڑے اور بدگوئی سے کلّی احتراز کرے، حضرت اِمام مالک رحمہ اللہ کا ارشاد ہے:-

كَانَ مَالِكٌ يَقُوْلُ: اَلْمِرَاءُ وَالْجِدَالُ فِي الْعِلْمِ يَذْهَبُ بِنُوْرِ الْعِلْمِ عَنْ قَلْبِ الْعَبْدِ، وَقِيْلَ لَهُ: رَجُلٌ لَهُ عِلْمٌ بِالسُّنَّةِ فَهَلْ يُجَادِلُ عَنْهَا؟ قَالَ: لَا، وَلٰكِنْ يُخْبِرُ بِالسُّنَّةِ فَإِنْ قُبِلَ مِنْهُ وَإِلَّا سَكَتَ۔ (اوجز المسالک شرح مؤطا ج:۱ ص:۱۵)

ترجمہ:- اِمام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: علم میں جھگڑا اور جدال نورِ علم کو اِنسان کے قلب سے نکال دیتا ہے، کسی نے عرض کیا کہ: ایک شخص جس کو سنت کا علم ہو، کیا وہ حفاظتِ سنت کے لئے جدال کرسکتا ہے؟ فرمایا: نہیں، بلکہ اس کو چاہئے کہ مخاطب کو صحیح بات سے آگاہ کردے، پھر وہ قبول کرلے تو بہتر ورنہ سکوت اِختیار کرے۔

دعوتِ دِین کی عدمِ تأثیر کے اسباب

اس زمانے میں دعوت و اصلاح کا کام پوری طرح مؤثر نہ ہونے کے دو سبب ہیں، ایک تو یہ کہ فسادِ زمانہ اور حرام چیزوں کی کثرت کے سبب عام طور پر لوگوں کے قلوب سخت اور آخرت سے غافل ہوگئے ہیں، اور قبولِ حق کی توفیق کم ہوگئی ہے، اور بعض تو اس قہر

میں مبتلا ہیں جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی کہ آخر زمانے میں بہت سے لوگوں کے قلوب اوندھے ہو جائیں گے، بھلے بُرے کی پہچان اور جائز و ناجائز کا امتیاز ان کے دِل سے اُٹھ جائے گا۔

اور دُوسرا سبب یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دعوتِ حق کے فرائض سے غفلت عام ہوگئی ہے، عوام کا تو کیا ذکر، خواص علماء و صلحاء میں اس ضرورت کا احساس بہت کم ہے، یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اپنے اعمال دُرست کر لئے جائیں تو یہ کافی ہے، خواہ اُن کی اولاد، بیوی، بھائی، دوست احباب کیسے ہی گناہوں میں مبتلا رہیں ان کی اصلاح کی فکر گویا ان کے ذمے ہی نہیں، حالانکہ قرآن و حدیث کی نصوصِ صریحہ ہر شخص کے ذمے اپنے اہل و عیال اور متعلقین کی اصلاح کو فرض قرار دے رہی ہیں، "قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا" اور پھر اگر کچھ لوگ دعوت و اصلاح کے فریضے کی طرف توجہ دیتے بھی ہیں تو وہ قرآنی تعلیمات اور دعوتِ پیغمبرانہ کے اُصول و آداب سے ناآشنا ہیں، بے سوچے سمجھے جس کو، جس وقت، جو چاہا کہہ ڈالا، اور یہ سمجھ بیٹھے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے، حالانکہ یہ طرزِ عمل سنتِ انبیاء کے خلاف ہونے کی وجہ سے لوگوں کو دِین اور اَحکامِ دِین پر عمل کرنے سے اور زیادہ دُور پھینک دیتا ہے۔

خصوصاً جہاں کسی دُوسرے پر تنقید کی نوبت آئے تو تنقید کا نام لے کر تنقیص اور اِستہزاء و تمسخر تک پہنچ جاتے ہیں، حضرت اِمام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا:-

> جس شخص کو کسی غلطی پر متنبہ کرنا ہے، اگر تم نے اس کو تنہائی میں نرمی کے ساتھ سمجھایا تو یہ نصیحت ہے، اور اگر علانیہ لوگوں کے سامنے اس کو رُسوا کیا تو یہ فضیحت ہے۔

آج کل تو ایک دُوسرے کے عیوب کو اَخباروں، اِشتہاروں کے ذریعے منظرِ عام پر لانے کو دِین کی خدمت سمجھ لیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دِین اور اس کی دعوت کی صحیح بصیرت اور آداب کے مطابق اس کی خدمت کی توفیق عطا فرمائیں۔

داعیانِ حق کی تسلی

یہاں تک دعوت کے اُصول اور آداب کا بیان ہوا، اس کے بعد فرمایا: "اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ" یہ جملہ داعیانِ دین کی تسلی کے لئے ارشاد فرمایا ہے، کیونکہ مذکور الصدر آدابِ دعوت کو اِستعمال کرنے کے باوجود جب مخاطب حق بات کو قبول نہ کرے تو طبعی طور پر اِنسان کو سخت صدمہ پہنچتا ہے، اور بعض اوقات اس کا یہ اثر بھی ہوسکتا ہے کہ دعوت کا فائدہ نہ دیکھ کر آدمی پر مایوسی طاری ہو جائے اور کام ہی چھوڑ بیٹھے، اس لئے اس جملے میں یہ فرمایا کہ آپ کا کام صرف دعوتِ حق کو اُصولِ صحیحہ کے مطابق ادا کر لینا ہے، آگے اس کو قبول کرنا یا نہ کرنا اس میں نہ آپ کا کوئی دخل ہے، نہ آپ کی ذمہ داری، وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، وہی جانتا ہے کہ کون گمراہ رہے گا، اور کون ہدایت پائے گا، آپ اس فکر میں نہ پڑیں، اپنا کام کرتے رہیں اس میں ہمت نہ ہاریں، مایوس نہ ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ جملہ بھی آدابِ دعوت ہی کا تکملہ ہے۔

داعیٔ حق اور صبر

اس کے بعد کی تین آیتوں میں داعیانِ حق کے لئے ایک اور اہم ہدایت ہے، وہ یہ کہ بعض اوقات ایسے سخت دِل جاہلوں سے سابقہ پڑتا ہے کہ ان کو کتنی ہی نرمی اور خیرخواہی سے بات سمجھائی جائے وہ اس پر بھی مشتعل ہوجاتے ہیں، زبان درازی کرکے ایذا پہنچاتے ہیں، اور بعض اوقات اس سے بھی تجاوز کرکے ان کو جسمانی تکلیف پہنچانے بلکہ قتل تک سے بھی گریز نہیں کرتے، ایسے حالات میں دعوتِ حق دینے والوں کو کیا کرنا چاہئے؟

اس سے "وَاِنْ عَاقَبْتُمْ... الخ" میں ایک تو ان حضرات کو قانونی حق دیا گیا کہ جو آپ پر ظلم کرے، آپ کو بھی اس سے اپنا بدلہ لینا جائز ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ بدلہ لینے میں مقدارِ ظلم سے تجاوز نہ ہو، جتنا ظلم اس نے کیا ہے، اتنا ہی بدلہ لیا جائے اس میں زیادتی نہ ہونے پائے۔

اور آخرِ آیت میں مشورہ دیا کہ اگرچہ آپ کو اِنتقام لینے کا حق ہے، لیکن صبر کریں اور اِنتقام نہ لیں تو یہ بہتر ہے۔

آیت "وَاِنْ عَاقَبْتُمْ" کا شانِ نزول

جمہور مفسرین کے نزدیک یہ آیت مدنی ہے، غزوۂ اُحد میں ستّر صحابہؓ کی شہادت اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کر کے مثلہ کرنے کے واقعے میں نازل ہوئی، صحیح بخاری کی روایت اسی کے مطابق ہے، دارقطنی نے بروایت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے کہ:-

غزوۂ اُحد میں جب مشرکین لَوٹ گئے تو صحابہ کرامؓ میں سے ستّر اکابر کی لاشیں سامنے آئیں، جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمِ محترم حضرت حمزہؓ بھی تھے، چونکہ مشرکین کو اُن پر بڑا غیظ تھا، اس لئے ان کو قتل کرنے کے بعد اُن کی لاش پر اپنا غصہ اس طرح نکالا کہ ان کی ناک، کان اور دُوسرے اعضاء کاٹے گئے، پیٹ چاک کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منظر سے سخت صدمہ پہنچا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں حمزہ کے بدلے میں مشرکین کے ستّر آدمیوں کا اسی طرح مثلہ کروں گا جیسا انہوں نے حمزہ کو کیا ہے۔ اس واقعے میں یہ تین آیات نازل ہوئیں: "وَاِنْ عَاقَبْتُمْ.... الخ" (تفسیر قرطبی) بعض روایات میں ہے کہ دُوسرے حضراتِ صحابہؓ کے ساتھ بھی اِن ظالموں نے اسی طرح کا معاملہ مثلہ کرنے کا کیا تھا، (کما رواه الترمذی واحمد وابن خزيمة وابن حبان فی صحيحهما عن أبیّ بن كعب رضی الله عنه)۔

اس میں چونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرطِ غم سے بلالحاظ تعداد ان صحابہ کے بدلے میں ستّر مشرکین کے مثلہ کرنے کا عزم فرمایا تھا، جو اللہ کے نزدیک اس اُصولِ

عدل و مساوات کے مطابق نہ تھا جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے دُنیا میں قائم کرنا منظور تھا، اس لئے ایک تو اس پر متنبہ فرمایا گیا کہ بدلہ لینے کا حق تو ہے، مگر اسی مقدار اور پیمانے پر جس مقدار کا ظلم ہے، بلالحاظِ تعداد چند کا بدلہ ستّر سے لینا دُرست نہیں، دُوسرے آپ کو مکارمِ اخلاق کا نمونہ بنانا مقصود تھا، اس لئے یہ نصیحت کی گئی کہ برابر سرابر بدلہ لینے کی اگرچہ اجازت ہے، مگر وہ بھی چھوڑ دو اور مجرموں پر اِحسان کرو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

اس پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب ہم صبر ہی کریں گے، کسی ایک سے بھی بدلہ نہیں لیں گے، اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دیا (مظہری عن البغوی)۔ فتحِ مکہ کے موقع پر جب یہ تمام مشرکین مغلوب ہو کر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے قبضے میں تھے، یہ موقع تھا کہ اپنا وہ عزم و ارادہ پورا کر لیتے جو غزوۂ اُحد کے وقت کیا تھا، مگر آیاتِ مذکورہ کے نزول کے وقت ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ارادے کو چھوڑ کر صبر کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے، اس لئے فتحِ مکہ کے وقت ان آیات کے مطابق صبر کا عمل اختیار کیا گیا، شاید اسی بناء پر بعض روایات میں یہ مذکور ہوا ہے کہ یہ آیتیں فتحِ مکہ کے وقت نازل ہوئی تھیں، اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ ان آیات کا نزول مکرّر ہوا ہو، اوّل غزوۂ اُحد میں نازل ہوئیں اور پھر فتحِ مکہ کے وقت دوبارہ نازل ہوئیں (کما حکاہ المظہری عن ابن الحصار)۔

مسئلہ:- اس آیت نے بدلہ لینے میں مساوات کا قانون بتایا ہے، اسی لئے حضراتِ فقہاء نے فرمایا کہ جو شخص کسی کو قتل کر دے اس کے بدلے میں قاتل کو قتل کیا جائے گا، جو زخمی کر دے تو اتنا ہی زخم اس کرنے والے کو لگایا جائے گا، جو کسی کا ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے پھر قتل کر ڈالے تو ولیٔ مقتول کو حق دیا جائے گا کہ وہ بھی پہلے قاتل کا ہاتھ یا پاؤں کاٹے پھر قتل کر دے۔

البتہ اگر کسی نے پتھر مار کر کسی کو قتل کیا یا تیروں سے زخمی کر کے قتل کیا تو اس میں نوعیتِ قتل کی صحیح مقدار متعین نہیں کی جا سکتی کہ کتنی ضربوں سے یہ قتل واقع ہوا ہے، اور مقتول کو کتنی تکلیف پہنچی ہے، اس معاملے میں حقیقی مساوات کا کوئی پیمانہ نہیں ہے، اس لئے اس کو

تلوار ہی سے قتل کیا جائے گا۔ (جصاص)

مسئلہ:- آیت کا نزول اگرچہ جسمانی تکالیف اور جسمانی نقصان پہنچانے کے متعلق ہوا ہے، مگر اَلفاظ عام ہیں، جس میں مالی نقصان پہنچانا بھی داخل ہے، اسی لئے حضراتِ فقہاء نے فرمایا کہ جو شخص کسی سے اس کا مال غصب کرے تو اس کو بھی حق حاصل ہے کہ اپنے حق کے مطابق اس سے مال چھین لے، یا چوری کر کے لے لے، بشرطیکہ جو مال لیا ہے وہ اپنے حق کی جنس سے ہو، مثلاً نقد روپیہ لیا ہو تو اس کے بدلے میں اتنا ہی نقد روپیہ اس سے غصب یا چوری کے ذریعے لے سکتا ہے، غلہ، کپڑا وغیرہ لیا ہے تو اسی طرح کا غلہ، کپڑا لے سکتا ہے، مگر ایک جنس کے بدلے میں دُوسری جنس نہیں لے سکتا، مثلاً روپے کے بدلے میں کپڑا یا کوئی دُوسری استعمالی چیز زبردستی نہیں لے سکتا، اور بعض فقہاء نے مطلقاً اجازت دی ہے، خواہ جنسِ حق سے ہو یا کسی دُوسری جنس سے، اس مسئلے کی کچھ تفصیل قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھی ہے، اور تفصیلی بحث کتبِ فقہ میں مذکور ہے۔

صبر وتقویٰ کی فضیلت

آیت "وَاِنْ عَاقَبْتُمْ" میں عام قانون مذکور تھا جس میں سب مسلمانوں کے لئے برابر کا بدلہ لینا جائز مگر صبر کرنا افضل و بہتر بتلایا گیا ہے، اس کے بعد کی آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی خطاب فرما کر صبر کرنے کی تلقین وترغیب دی گئی ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عظیم اور منصبِ بلند کے لئے دُوسروں کی نسبت سے وہی زیادہ موزوں ومناسب ہے، اس لئے فرمایا: "وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ" یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو اِنتقام کا ارادہ ہی نہ کریں، صبر ہی کو اِختیار کریں، اور ساتھ ہی یہ بھی بتلادیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر اللہ ہی کی مدد سے ہوا، یعنی صبر کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے آسان کردیا جائے گا۔

آخری آیت میں پھر ایک عام قاعدہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و اِمداد حاصل ہونے کا

یہ بتلا دیا: "اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّالَّذِیۡنَ ھُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ"۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو دو صفتوں کے حامل ہوں، ایک تقویٰ، دُوسرے اِحسان۔ تقویٰ کا حاصل نیک عمل کرنا اور اِحسان کا مفہوم اس جگہ خلقِ خدا تعالیٰ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے، یعنی جو لوگ شریعت کے تابع اعمالِ صالحہ کے پابند ہوں اور دُوسروں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرتے ہوں، حق تعالیٰ اُن کے ساتھ ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ کی معیت (نصرت) حاصل ہو اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ (معارف القرآن ج:۵ ص:۴۱۸ تا ۴۳۵)

***

پہلا باب

دعوتِ دین کے فضائل

"دعوت وتبلیغ کا کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کے واسطے سے اس اُمت پر فرض کیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کے اَحکامات اور اُسلوبِ دعوت کو قرآنِ پاک میں وضاحت سے بیان فرمایا ہے، اور ساتھ ہی اس کام کے فضائل بھی بیان فرمائے، تاکہ اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دِلوں میں اس کام کی اہمیت جاں گزین ہو جائے۔"

ارشادِ ربانی

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾ (الفرقان)

ترجمہ:- سو تو کہنا مت مان منکروں کا اور مقابلہ کر اُن کا اس کے ساتھ بڑے زور سے۔

خلاصۂ تفسیر

سو (اس نعمت کے شکریہ میں) آپ کافروں کی خوشی کا کام نہ کیجئے (یعنی کافر تو اس سے خوش ہوں گے کہ تبلیغ نہ ہو، یا کمی ہو جائے، اور ان کی آزادی سے تعرض نہ کیا جاوے) اور قرآن (میں جو دلائل حق کے مذکور ہیں جیسا اسی مقام پر دلائل توحید کے ارشاد ہوئے ہیں اُن) سے اُن کا زور شور سے مقابلہ کیجئے (یعنی عام اور مکمل دعوت وتبلیغ کیجئے، یعنی سب سے کہئے اور بار بار کہئے اور ہمت قوی رکھئے جیسا اب تک آپ کرتے رہے ہیں اس پر قائم رہئے)۔

جہاد بالقرآن یعنی قرآن کی دعوت کو پھیلانا جہادِ کبیر ہے

"وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا" یہ آیت مکی ہے، جبکہ اَحکام، کفار سے قتال و جنگ کے نازل نہیں ہوئے تھے، اسی لئے یہاں جہاد کو "بِهٖ" کے ساتھ مقید کیا گیا، "بِهٖ" کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کے ذریعہ مخالفینِ اسلام سے جہاد کرو بڑا جہاد، قرآن کے ذریعے اس جہاد کا حاصل اس کے اَحکام کی تبلیغ اور خلقِ خدا کو اس کی طرف توجہ دینے کی ہر کوشش ہے خواہ زبان سے ہو یا قلم سے یا دُوسرے طریقوں سے، اس سب کو یہاں جہادِ کبیر فرمایا ہے۔ (معارف القرآن ج:٦ ص:٤٧٧)

احسن قول

''اللہ تعالیٰ کی طرف لوگوں کو بلانا اور اس کے دِین کی طرف تمام انسانوں کو دعوت دینا نہ صرف یہ کہ ہر مسلمان کا ایک اہم فریضہ ہے بلکہ اس کی زندگی کی ایک متاعِ گراں بہا ہے، یہاں تک کہ دعوتِ دِین کی کوئی بھی بات دُنیا کی تمام باتوں سے افضل اور بہترین ہے۔''

ارشادِ ربانی

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٣٣﴾

(حٰمٓ السجدۃ)

ترجمہ:- اور اس سے بہتر کس کی بات جس نے بلایا اللہ کی طرف اور کیا نیک کام اور کہا میں حکم بردار ہوں۔

خلاصۂ تفسیر

اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو (لوگوں کو) خدا کی طرف بلائے اور (خود بھی) نیک عمل کرے اور (اظہارِ اطاعت کے لئے) کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں (یعنی بندگی کو اپنا فخر سمجھے، متکبرین کی طرح اس سے عار نہ کرے)۔

"وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ" یہ مؤمنینِ کاملین کا دُوسرا حصہ احوال ہے کہ وہ صرف خود ہی اپنے ایمان و عمل پر قناعت نہیں کرتے بلکہ دُوسرے لوگوں کو بھی اس کی دعوت دیتے ہیں، اور فرمایا کہ اُس سے اچھا کس کا قول ہوسکتا ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے۔ معلوم ہوا کہ انسان کے کلام میں سب سے افضل و اَحسن وہ کلام ہے جس میں دُوسروں کو دعوتِ حق دی گئی ہو، اس میں دعوت الی اللہ کی سب صورتیں داخل ہیں، زبان سے، تحریر سے یا کسی اور عنوان سے، اَذان دینے والا بھی اس میں داخل ہے کیونکہ وہ دُوسروں کو نماز کی طرف بلاتا ہے، اسی لئے حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ: یہ آیت مؤذِّنوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور اس "دَعَآ اِلَى اللّٰهِ" کے بعد "عَمِلَ صَالِحًا" آیا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ اَذان و اِقامت کے درمیان دو رکعت نماز پڑھ لے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اَذان و اِقامت کے درمیان جو دُعا کی جاتی ہے وہ رد نہیں ہوتی۔

(رواہ ابوداؤد والترمذی عن انس رضی اللہ عنہ، مظہری)

اَذان اور جوابِ اَذان کے فضائل و برکات احادیثِ صحیحہ میں بہت بڑے ہیں، بشرطیکہ اِخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے اَذان دے، اُجرت و معاوضہ پیشِ نظر نہ ہو۔ یہ احادیث اس جگہ تفسیر مظہری میں جمع کردی ہیں۔　　(معارف القرآن ج:۷ ص:۶۵۲)

تعاون علی البر والتقویٰ

"ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ اس کی سیرت و کردار پاکیزہ ہو اور اس کی زندگی کے تمام اعمال اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے مطابق ہوں اور اس کی نجی زندگی کا طرزِ عمل تقویٰ پر مبنی ہو، اور اس کی اجتماعی زندگی تعاون علی البر والتقویٰ کا نمونہ ہو کہ خود بھی اچھے اعمال کرنا اور دُوسروں کو بھی اعمالِ صالحہ کی ترغیب دِلانا اور ان فرائض و اعمال کی ادائیگی میں

ان کی مدد کرنا، چنانچہ قرآنِ کریم نے اس موضوع کو اِنتہائی دِلکش اُسلوب میں حسبِ ذیل آیت میں بیان فرمایا ہے۔''

ارشادِ ربانی

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْیَ وَ لَا الْقَلَآىِٕدَ وَ لَاۤ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًاؕ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْاؕ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْاۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲﴾ (المائدۃ)

ترجمہ:- اے ایمان والو! حلال نہ سمجھو اللہ کی نشانیوں کو اور نہ ادب والے مہینے کو اور نہ اس جانور کو جو نیاز کعبہ کی ہو اور نہ جن کے گلے پٹا ڈال کر لے جائیں کعبہ کو اور نہ آنے والوں کو حرمت والے گھر کی طرف جو ڈھونڈ ھتے ہیں فضل اپنے رَبّ کا اور اس کی خوشی، اور جب اِحرام سے نکلو تو شکار کرلو، اور باعث نہ ہو تم کو اس قوم کی دُشمنی جو کہ تم کو روکتی تھی حرمت والی مسجد سے اس پر کہ زیادتی کرنے لگو اور آپس میں مدد کرو نیک کام پر اور پرہیزگاری پر اور مدد نہ کرو گناہ پر اور ظلم پر، اور ڈرتے رہو اللہ سے، بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! بےحرمتی نہ کرو خدا تعالیٰ (کے دِین) کی نشانیوں کی (یعنی جن چیزوں کے ادب کی حفاظت کے واسطے خدا تعالیٰ نے کچھ اَحکام مقرّر کئے ہیں، ان اَحکام کے خلاف کر کے ان کی بےادبی نہ کرو، مثلاً حرم اور اِحرام کا یہ ادب مقرّر کیا ہے کہ اس میں شکار نہ کرو تو شکار کرنا بےادبی اور حرام ہوگا) اور نہ حرمت والے مہینے کی (بےادبی کرو کہ اس

میں کافروں سے لڑنے لگو) اور نہ حرم میں قربانی ہونے والے جانور کی (بے ادبی کرو کہ اِس سے تعرض کرنے لگو) اور نہ ان جانوروں کی (بے ادبی کرو) جن کے گلے میں (اس نشانی کے لئے) پٹے پڑے ہوں (کہ یہ اللہ کی نیاز ہیں حرم میں ذبح ہوں گے) اور نہ ان لوگوں کی (بے حرمتی کرو) جو کہ بیت الحرام (یعنی بیت اللہ) کے قصد سے جارہے ہوں (اور اپنے رَبّ کے فضل اور رضامندی کے طالب ہوں (یعنی ان چیزوں کے ادب سے کافروں کے ساتھ بھی تعرض مت کرو) اور (اُوپر کی آیت میں جو اِحرام کے ادب سے شکار کو حرام فرمایا گیا ہے وہ اِحرام ہی تک ہے ورنہ) جس وقت تم اِحرام سے باہر آجاؤ تو (اجازت ہے کہ) شکار کیا کرو (بشرطیکہ وہ شکار حرم میں نہ ہو) اور (اُوپر جن چیزوں کے تعرض سے منع کیا گیا ہے اس میں) ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم سے جن سے اس سبب سے بغض رکھتے ہو کہ انہوں نے (تم کو سالِ حدیبیہ میں) مسجدِ حرام (میں جانے) سے روک دیا تھا (مراد کفارِ قریش ہیں) وہ (بغض) تمہارے لئے اس کا باعث ہوجاوے کہ تم (شرع کی) حد سے نکل جاؤ (یعنی اَحکامِ مذکورہ کے خلاف کر بیٹھو، ایسا نہ کرنا) اور نیکی اور تقویٰ (کی باتوں میں) ایک دُوسرے کی اعانت کرتے رہو (مثلاً یہ اَحکام ہیں کہ ان میں دُوسروں کو بھی عمل کرنے کی ترغیب دو) اور گناہ اور زیادتی (کی باتوں میں) ایک دُوسرے کی اعانت مت کرو (مثلاً یہی اَحکام ہیں اگر کوئی ان کے خلاف کرنے لگے تو تم اس کی اعانت مت کرو) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو (کہ اس سے سب اَحکام کی پابندی سہل ہوجاتی ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ (اَحکام کی مخالفت کرنے والے کو) سخت سزا دینے والے ہیں۔

''اس آیتِ مبارکہ کا آخری جزء ''وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى.... الخ'' انتہائی وضاحت سے اس اہم قرآنی تعلیم کو بیان فرما رہا ہے۔ چنانچہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ آیتِ مبارکہ کے اس جزء کی تفسیر میں رقم طراز ہیں:۔''

برّ و تقویٰ پر تعاون اور اِمداد کرنے کے لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا: "الدال علی الخیر کفاعله" یعنی جو شخص کسی کو نیکی کا راستہ بتادے تو اس کا ثواب ایسا ہی ہے جیسے اس نیکی کو اُس نے خود کیا ہو۔ یہ حدیث ابنِ کثیر نے بحوالہ بزار نقل فرمائی ہے، اور صحیح بخاری میں ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جو شخص لوگوں کو ہدایت اور نیکی کی طرف دعوت دے تو جتنے آدمی اس کی دعوت پر نیک عمل کریں گے، ان سب کے برابر اس کو بھی ثواب ملے گا، بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے ثواب میں سے کچھ کم کیا جائے۔ اور جس شخص نے لوگوں کو کسی گمراہی یا گناہ کی طرف بلایا، تو جتنے لوگ اس کے بلانے سے گناہ میں مبتلا ہوئے ان سب کے گناہوں کے برابر اس کو بھی گناہ ہوگا، بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں کچھ کمی کی جائے۔

اور ابنِ کثیرؒ نے بروایت طبرانی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جو شخص کسی ظالم کے ساتھ اس کی مدد کرنے کے لئے چلا وہ اسلام سے نکل گیا۔ اسی پر سلف صالحین نے ظالم بادشاہوں کی ملازمت اور کوئی عہدہ قبول کرنے سے سخت احتراز کیا ہے کہ اس میں ان کے ظلم کی امداد و اِعانت ہے۔ تفسیر رُوح المعانی میں آیتِ کریمہ: "فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ" کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: قیامت کے روز آواز دی جائے گی کہ کہاں ہیں ظالم لوگ اور ان کے مددگار؟ یہاں تک کہ وہ لوگ جنھوں نے ظالموں کے دوات، قلم کو دُرست کیا ہے، وہ بھی سب ایک لوہے کے تابوت میں جمع کرکے جہنم میں پھینک دیئے جائیں گے۔

یہ ہے قرآن وسنت کی وہ تعلیم جس نے دُنیا میں نیکی، انصاف، ہمدردی اور خوش خلقی پھیلانے کے لئے ملت کے ہر فرد کو ایک داعی بناکر کھڑا کردیا تھا، اور جرائم وظلم وجور کے انسداد کے لئے ہر فردِ ملت کو ایک ایسا سپاہی بنادیا تھا جو خفیہ اور علانیہ اپنی ڈیوٹی بجالانے پر خوفِ خدا تعالیٰ کی وجہ سے مجبور تھا، اسی حکیمانہ تعلیم وتربیت کا نتیجہ تھا جو دُنیا نے صحابہؓ وتابعینؒ کے قرن میں دیکھا۔ آج بھی جب کسی ملک میں جنگ کا خطرہ لاحق ہوتا ہے تو شہری

دفاع کے محکمے قائم کر کے ہر فردِ قوم کو کچھ فنون کی تعلیم کا تو اہتمام کیا جاتا ہے مگر جرائم کے انسداد کے لئے اس کا کہیں اہتمام نہیں ہے کہ لوگوں کو خیر کا داعی اور شر کو روکنے والا سپاہی بنانے کی کوشش کریں، اور ظاہر ہے کہ اس کی مشق نہ فوجی پریڈ سے ہوتی ہے، نہ شہری دفاع کے طریقوں سے، یہ ہنر تو تعلیم گاہوں میں سیکھنے سکھانے کا ہے جو آج کل بدقسمتی سے ان چیزوں کے نام سے ناآشنا ہے۔ برّوتقویٰ اور ان کی تعلیمات کا داخلہ آج کل کی عام تعلیم گاہوں میں ممنوع ہے۔ اور ''اِثم وعدوان'' کا ہر راستہ کھلا ہوا ہے، پھر یہ بیچاری پولیس کہاں تک جرائم کی روک تھام کرے، جب ساری قوم حلال وحرام اور حق وناحق سے بیگانہ ہوکر جرائم پیشہ بن جائے۔ آج جو جرائم کی کثرت، چوری، ڈاکہ، فواحش، قتل وغارت گری کی فراوانی ہر جگہ اور ہر ملک میں روز بروز زیادہ تر ہوتی جاتی ہے، اور قانونی مشینری ان کے انسداد سے عاجز ہے۔

اس کے یہی دو سبب ہیں کہ ایک طرف تو حکومتیں اس قرآنی نظام سے دُور ہیں، اُن کے اربابِ اقتدار اپنی زندگی کو برّوتقویٰ کے اُصول پر ڈالتے ہوئے جھجکتے ہیں، اگرچہ اس کے نتیجے میں ہزاروں تلخیاں جھیلنی پڑتی ہیں، کاش! وہ اس تلخ گھونٹ کو ایک دفعہ تجربے کے لئے ہی پی جائیں، اور خدا تعالیٰ کی قدرت کا تماشا دیکھیں کہ کس طرح ان کو اور عوام کو امن وسکون اور چین وراحت کی حیاتِ طیبہ عطا ہوتی ہے۔

دُوسری طرف عوام نے یہ سمجھ لیا کہ اِنسدادِ جرائم صرف حکومت کا کام ہے، وہ ہر جرائم پیشہ کے جرائم پر پردہ ڈالنے کے عادی ہوگئے ہیں، محض اِحقاقِ حق اور اِنسدادِ جرائم کے لئے سچی شہادت دینے کا رواج ہی ان میں نہ رہا، ان کو یہ سمجھنا چاہئے کہ مجرم کے جرم پر پردہ ڈالنا اور شہادت سے گریز کرنا جرم کی اعانت ہے، جو اَز رُوئے قرآنِ کریم حرام اور سخت گناہ ہے، اور ''وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ'' کے حکم سے بغاوت ہے۔

(معارف القرآن ج:۳ ص:۱۵)

داعیٔ دِین اور اللہ کی حفاظت

''دعوتِ دِین ایک انتہائی اہم فریضہ ہے اور اس فریضے کی ادائیگی کے لئے جو اہلیت وصلاحیت درکار ہے اور اس فریضے کی ادائیگی کے راستے میں جو دُشواریاں اور تکالیف پیش آتی ہیں، ان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کوئی سہل اور آسان کام نہیں ہے، بلکہ بے حد دُشوار اور پُر مشقت اُمر ہے، اور اسی صورت میں اس کی انجام دہی ہوسکتی ہے جب داعی کو اللہ کی تائید اور اس کی نصرت حاصل ہو اور جب داعی نیتِ صالحہ کے ساتھ اس کام میں منہمک ہو جاتا ہے تو اسے اللہ کی رحمت سے نصرت وحمایت بھی حاصل ہوتی ہے اور اس کی دُشمنوں سے حفاظت بھی کی جاتی ہے۔

آیتِ ذیل میں اس موضوع پر بہت خوبصورت انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔''

ارشادِ ربانی

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٧﴾ (المائدۃ)

ترجمہ:- اے رسول! پہنچادے جو تجھ پر اُترا تیرے رَبّ کی طرف سے، اور اگر ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام، اور اللہ تجھ کو بچالے گا لوگوں سے، بے شک اللہ راستہ نہیں دِکھاتا قومِ کفار کو۔

خلاصۂ تفسیر

اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ آپ کے رَبّ کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ (لوگوں کو) سب پہنچادیجئے اور اگر (بفرضِ محال) آپ ایسا نہ کریں گے تو (ایسا سمجھا جاوے گا جیسے) آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام بھی نہیں پہنچایا (کیونکہ یہ مجموعہ فرض

ہے،تو جیسا کُل کے اِخفاء سے یہ فرض فوت ہوتا ہے اسی طرح بعض کے اِخفاء سے بھی وہ فرض فوت ہوتا ہے) اور (تبلیغ کے باب میں کفار کا کچھ خوف نہ کیجئے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے (یعنی اس سے کہ آپ کے مقابل ہو کر قتل و ہلاک کر ڈالیں) محفوظ رکھے گا (اور) یقیناً اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو (اس طرح قتل و ہلاک کر ڈالنے کے واسطے آپ تک) راہ نہ دیں گے۔

دعوتِ دِین کی تاکید

اس کا ایک اَثر طبعی طور پر بتقاضائے بشریت یہ بھی ہوسکتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مایوس ہو کر یا مجبور ہو کر تبلیغ و رسالت میں کچھ کمی ہو جائے، اور دُوسرا اَثر یہ بھی ہوسکتا تھا کہ آپ مخالفت اور دُشمنی اور اِیذاء رسانی کی پروا کئے بغیر تبلیغِ رسالت میں لگے رہیں اور اس کے نتیجے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دُشمنوں کے ہاتھ سے تکالیف و مصائب کا سامنا ہو، اس لئے تیسری آیت میں ایک طرف تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکیدی حکم دے دیا گیا کہ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا جائے وہ سب کا سب بغیر کسی جھجک کے آپ لوگوں کو پہنچادیں، کوئی بُرا مانے یا بھلا، اور مخالفت کرے یا قبول کرے، اور دُوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خوشخبری دے کر مطمئن بھی کر دیا گیا کہ تبلیغِ رسالت کے سلسلے میں یہ کفار آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، اللہ تعالیٰ خود آپ کی حفاظت فرمائیں گے۔

اس آیت میں ایک جملہ تو یہ قابلِ غور ہے کہ "وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ" مراد اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی ایک حکمِ خداوندی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو نہ پہنچایا تو آپ اپنے فرضِ پیغمبری سے سبکدوش نہیں ہوں گے، یہی وجہ تھی کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمر اس فریضے کی ادائیگی میں اپنی پوری ہمت وقوت صَرف فرمائی اور حجۃ الوداع کا مشہور خطبہ جو ایک حیثیت سے اسلام کا آئین و دستور تھا اور دُوسری حیثیت سے ایک

رؤف ورحیم اور ماں باپ سے زیادہ شفیق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت تھی۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نصیحت

اس خطبے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے ایک عظیم مجمع کے سامنے اہم ہدایات فرمانے کے بعد مجمع سے سوال فرمایا: "اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟" دیکھو! کیا میں نے آپ کو دِین پہنچادیا؟ صحابہ کرامؓ نے اِقرار فرمایا کہ ضرور پہنچایا، اس پر ارشاد فرمایا کہ آپ اس پر گواہ رہو، اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: "فَلْيُبَلِّغَ الشَّاهِدَ الْغَآئِبَ" یعنی "جو لوگ اس مجمع میں حاضر ہیں وہ غائبوں تک میری بات پہنچادیں۔" غائبین میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو اس وقت دُنیا میں موجود تھے، مگر مجمع میں حاضر نہ تھے، اور وہ لوگ بھی داخل ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئے، ان کو پیغام پہنچانے کا طریقہ علمِ دِین کی نشر واشاعت تھی جس کو حضراتِ صحابہؓ وتابعینؒ نے پوری کوشش سے انجام دیا۔

اسی کا یہ اثر تھا کہ عام حالات میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات وکلمات کو اللہ کی ایک بھاری امانت کی طرح محسوس فرمایا اور مقدور بھر اس کی کوشش کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سنا ہوا کوئی جملہ ایسا نہ رہ جائے جو اُمت کو نہ پہنچے، اگر کسی خاص سبب یا مجبوری سے کسی نے کسی خاص حدیث کو لوگوں سے بیان نہیں کی تو اپنی موت سے پہلے دو چار آدمیوں کو ضرور سنادی، تاکہ وہ اس امانت سے سبکدوش ہوجائیں۔ صحیح بخاری میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث کے متعلق ایسا ہی واقعہ مذکور ہے کہ "اخبر به معاذ عند موته تاثمًا"، یعنی حضرت معاذؓ نے یہ حدیث اپنی موت کے وقت بیان فرمائی، تاکہ اس امانت کے نہ پہنچانے کی وجہ سے گنہگار نہ ہوجائیں۔

آیت کے دُوسرے جملے "وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" میں بشارت دی گئی ہے کہ

ہزاروں مخالفتوں کے باوجود دُشمن آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

حدیث میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے چند صحابہ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے عام طور پر ساتھ لگے رہتے تھے، اور سفر و حضر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے تھے، اس آیت کے نزول کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو رُخصت کر دیا کہ اب کسی پہرے اور حفاظت کی ضرورت نہیں رہی، اللہ تعالیٰ نے یہ کام خود اپنے ذمے لے لیا ہے۔

ایک حدیث میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب مجھے تبلیغ و رسالت کے اَحکام ملے تو میرے دِل میں اس کی بڑی ہیبت تھی کہ ہر طرف سے لوگ میری تکذیب اور مخالفت کریں گے، پھر جب یہ آیت نازل ہوئی تو سکون و اطمینان حاصل ہوگیا۔ (تفسیر کبیر)

چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد کسی کی مجال نہیں ہوئی کہ تبلیغ و رسالت کے مقابلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی گزند پہنچا سکے، جنگ و جہاد میں عارضی طور سے کوئی تکلیف پہنچ جانا اس کے منافی نہیں۔ (معارف القرآن ج:٣ ص:١٩٣)

***

یعنی آخرت کے خسارے سے صرف وہ لوگ محفوظ ہیں جو خود بھی
ایمان اور عملِ صالح کے پابند ہیں اور دُوسروں کو بھی عقائدِ صحیحہ اور
اعمالِ صالحہ کی ہدایت کرتے رہتے ہیں۔

قومی اور اِجتماعی زندگی کے لئے جس طرح یہ ضروری تھا کہ ان کا کوئی مضبوط ومستحکم رشتۂ وحدت ہو، جس کو پہلی آیت میں اعتصام بحبل اللہ کے الفاظ سے واضح فرمایا گیا ہے، اسی طرح رشتے کو قائم اور باقی رکھنے کے لئے یہ دُوسرا عمل بھی ضروری ہے جو اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے (یعنی دُوسرے بھائیوں کو اَحکامِ قرآن وسنت کے مطابق اچھے کاموں کی ہدایت اور بُرے کاموں سے روکنے کو ہر شخص اپنا فریضہ سمجھے تاکہ یہ حبل اللہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے، کیونکہ بقول اُستاذ مرحوم شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ: ''اللہ تعالیٰ کی یہ رسّی ٹوٹ تو نہیں سکتی ہاں چھوٹ سکتی ہے'' اس لئے قرآنِ کریم نے اس رَسّی کے چھوٹ جانے کے خطرے کے پیشِ نظر یہ ہدایت جاری فرمائی) کہ ہر مسلمان جس طرح خود نیک عمل کرنے کو اور گناہ سے بچنے کو اپنا فرض سمجھتا ہے، اس کو بھی ضروری سمجھے کہ دُوسرے لوگوں کو بھی نیک عمل کی ہدایت اور بُرے اعمال سے روکنے کی کوشش کرتا رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ سب مل کر مضبوطی کے ساتھ حبلِ متین کو تھامے رہیں گے اور اس کے نتیجے میں فلاحِ دُنیا وآخرت ان کے ساتھ ہوگی، اپنی اصلاح کے ساتھ دُوسروں کی اصلاح کی ذمہ داری ہر مسلمان پر ڈالنے کے لئے قرآنِ کریم میں بہت سے واضح ارشادات وارِد ہیں، سورۃ العصر کا مضمون ابھی آپ دیکھ چکے ہیں، اور اسی سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہے:-

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

(آل عمران:۱۱۰)

ترجمہ:- تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لئے نکالی گئی ہے، کیونکہ تم
نیک کاموں کا لوگوں کو حکم کرتے ہو اور بُرے کاموں سے روکتے ہو۔

اس میں بھی پوری اُمت پر اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ عائد کیا گیا ہے، اور دُوسری اُمتوں پر اس کی فضیلت کا سبب ہی اس خاص کام کو بتلایا ہے، اسی طرح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس بارے میں بے شمار ہیں، ترمذی اور ابنِ ماجہ وغیرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

والذی نفسی بیدہ! لتأمرنَّ بالمعروف ولتنهَوُنَّ عن المنکر أو لیوشکنّ الله أن یبعث علیکم عقابًا من عندہ ثمّ لتدعنّہ فلا یستجیب لکم۔

ترجمہ:- قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے! کہ تم ضرور اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو، ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ گنہگاروں کے ساتھ تم سب پر بھی اپنا عذاب بھیج دے، اس وقت تم خدا تعالیٰ سے دُعا مانگو گے تو قبول نہ ہوگی۔

ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

من رأی منکم منکرًا فلیغیّرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ وان لم یستطع فبقلبہ وذٰلك أضعف الایمان۔

یعنی تم میں سے جو شخص کوئی گناہ ہوتا ہوا دیکھے تو اس کو چاہئے کہ اپنے ہاتھ اور قوت سے اس کو روک دے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو زبان سے روکے، اور یہ بھی نہ کر سکے تو کم از کم دِل میں اس فعل کو بُرا سمجھے، اور یہ ادنیٰ درجے کا ایمان ہے۔

ان تمام آیات اور روایات سے یہی ثابت ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اُمت کے ہر فرد پر لازم ہے، البتہ تمام اَحکامِ شرعیہ کی طرح اس میں بھی ہر شخص کی قدرت واِستطاعت پر اَحکام دائر ہوں گے، جس کو جتنی قدرت ہو، اتنا ہی اَمر بالمعروف کا فریضہ اس پر عائد ہوگا، ابھی جو حدیث آپ نے دیکھی ہے اس میں اِستطاعت پر ہی مدار رکھا گیا ہے۔

تبلیغِ دین بقدرِ استطاعت

پھر استطاعت وقدرت ہر کام کی جدا ہوتی ہے، اَمر بالمعروف کی قدرت پہلے تو اس پر موقوف ہے کہ وہ معروف ومُنکَر اس شخص کو پوری طرح صحیح صحیح معلوم ہو۔ جس کو خود ہی معروف ومُنکَر کی تمییز نہ ہو، یا اس مسئلے کا پورا علم نہ ہو، وہ اگر دُوسروں کو اَمر بالمعروف یا نہی عن المُنکَر کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ بجائے اصلاح ہونے کے فساد ہوگا، اور بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی ناواقفیت کی بناء پر کسی معروف کو منع کردے یا مُنکَر کا حکم کرنے لگے، اس لئے جو شخص خود معروف ومُنکَر سے واقف نہیں اس پر یہ فریضہ تو عائد ہے کہ واقفیت پیدا کرے اور اَحکامِ شرعیہ کے معروف ومُنکَر کا علم حاصل کرے، اور پھر اس کے مطابق اَمر بالمعروف اور نہی عن المُنکَر کی خدمت انجام دے۔

لیکن جب تک اس کو واقفیت نہیں، اس کا اس خدمت کے لئے کھڑا ہونا جائز نہیں، جیسے اس زمانے میں بہت سے جاہل وعظ کہنے کے لئے کھڑے ہوجاتے ہیں، نہ انہیں قرآن کا علم ہے، نہ حدیث کا، یا بہت سے عوام سنی سنائی غلط باتوں کو لے کر لوگوں سے جھگڑنے لگتے ہیں کہ ایسا کرو، ایسا نہ کرو، یہ طریقِ کار بجائے معاشرے کے دُرست کرنے کے اور زیادہ ہلاکت اور جنگ وجدل کا سبب ہوتا ہے۔

اسی طرح اَمر بالمعروف کی قدرت میں یہ بھی داخل ہے کہ اپنے آپ کو کوئی ناقابلِ برداشت ضرر پہنچنے کا قوی خطرہ نہ ہو، اسی لئے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ گناہ کو ہاتھ اور قوّت سے نہ روک سکے تو زبان سے روکے، اور زبان سے روکنے پر قدرت نہ ہو تو دِل ہی سے بُرا سمجھے، ظاہر ہے کہ زبان سے روکنے پر قدرت نہ ہونے کے یہ معنی تو ہیں نہیں کہ اس کی زبان حرکت نہیں کرسکتی، بلکہ مراد یہی ہے کہ اس کو یہ خطرہ قوی ہے کہ اس نے حق بات کی تلقین کی تو اس کی جان جائے گی، یا کوئی دُوسرا شدید نقصان پہنچ جائے گا، ایسی حالت میں اس شخص کو قادر نہ سمجھا جائے گا، اور اَمر بالمعروف اور نہی عن المُنکَر کے ترک پر

اس کو گنہگار نہ کہا جائے گا، یہ دُوسری بات ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال کی پروا نہ کرے اور نقصان برداشت کرکے بھی اَمر بالمعروف نہی عن المنکر کی خدمت انجام دے، جیسے بہت سے صحابہؓ وتابعینؒ اور ائمۂ اِسلام کے واقعات منقول ہیں، یہ ان کی اُولوا العزمی اور بڑی فضیلت ہے، جس سے ان کا مقام دُنیا و آخرت میں بلند ہوا، مگر ان کے ذمے ایسا کرنا فرض وواجب نہ تھا۔

واجب اور مستحب اُمور

سورۂ والعصر کی آیت اور "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ" وغیرہ آیات سے، نیز اَحادیثِ مذکورہ سے اُمت کے ہر فرد پر اس کی قدرت کے مطابق اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب کیا جارہا ہے، لیکن اس کے وجوب میں یہ تفصیل ہے کہ اُمورِ واجبہ میں معروف کا اَمر اور منکر سے نہی کرنا واجب، اور اُمورِ مستحبہ میں مستحب ہے، مثلاً نماز پنج گانہ فرض ہے تو ہر شخص پر واجب ہوگا کہ بے نمازی کو نصیحت کرے، اور نوافل مستحب ہیں، اس کی نصیحت کرنا مستحب ہوگا، اس کے علاوہ ایک ضروری ادب یہ بھی پیشِ نظر رکھنا ہوگا کہ مستحبات میں مطلقاً نرمی سے اظہار کرے، اور واجبات میں اوّلاً نرمی اور نہ ماننے پر سختی کی بھی گنجائش ہے، آج کل لوگ مستحبات میں یا مباحات میں تو سختی سے روک ٹوک کرتے ہیں لیکن اُمورِ واجبہ اور فرائض کے ترک پر کوئی ملامت نہیں کرتے۔

نیز ہر شخص پر اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اس وقت عائد ہوگا جبکہ وہ اپنے سامنے کسی منکر کو ہوتے ہوئے دیکھے، مثلاً ایک شخص دیکھ رہا ہے کہ کوئی مسلمان شراب پی رہا ہے یا چوری کر رہا ہے یا کسی غیر عورت سے مجرمانہ اختلاط کر رہا ہے، تو اس کے ذمہ واجب ہوگا کہ اپنی استطاعت وقدرت کے مطابق اس کو روکے، اور اگر اس کے سامنے یہ سب کچھ نہیں ہورہا ہے تو یہ فریضہ اس کے ذمہ نہیں، بلکہ اب یہ فریضہ اسلامی حکومت کا ہے کہ مجرم کے جرم کی تفتیش وتحقیق کرکے اس کو سزا دے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "من رای منکم" میں اسی طرف اشارہ ہے، کیونکہ اس میں ارشاد ہے کہ جو شخص تم میں سے کسی مُنکَر کو دیکھے۔

اجتماعی تبلیغ

اَمر بالمعروف کا دُوسرا درجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک جماعت خاص دعوت وارشاد ہی کے لئے قائم رہے، اس کا وظیفہ ہی یہ ہو کہ اپنے قول وعمل سے لوگوں کو قرآن وسنت کی طرف بلائے، اور جب لوگوں کو اچھے کاموں میں سست یا بُرائیوں میں مبتلا دیکھے اس وقت بھلائی کی طرف متوجہ کرنے اور بُرائی سے روکنے کی اپنے مقدور کے موافق کوتاہی نہ کرے، اور چونکہ اس اہم فریضے یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المُنکَر کو پوری طرح اسی وقت ادا کیا جاسکتا ہے جبکہ اس کو مسائل کا پورا علم بھی ہو، اور اَمر بالمعروف کو مؤثر بنانے کے آداب اور طریقے بھی سنت کے مطابق اس کو معلوم ہوں، اس لئے مکمل طور پر اَمر بالمعروف اور نہی عن المُنکَر کا فریضہ ادا کرنے کے لئے مسلمانوں میں سے ایک مخصوص جماعت کو اس منصب پر مأمور کیا گیا، جو ہر طرح دعوت الی الخیر اَمر بالمعروف اور نہی عن المُنکَر کی اہل ہو، چنانچہ اسی آیت میں ایسی جماعت کی ضرورت اور اہمیت کو بتلاتے ہوئے فرمایا: "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" یعنی تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور بُرے کاموں سے روکا کریں۔ "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ" میں اشارہ ہے کہ اس جماعت کا وجود ضروری ہے، اگر کوئی حکومت یہ فریضہ انجام نہ دے تو تمام مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ ایسی جماعت قائم کریں، کیونکہ ان کی حیاتِ ملّی اسی وقت محفوظ رہے گی جب تک یہ جماعت باقی ہے، پھر اس جماعت کے بعض اہم اوصاف اور امتیازات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "يَدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ" یعنی اس جماعت کا پہلا امتیازِ خصوصی یہ ہوگا کہ وہ خیر کی طرف دعوت دیا کرے گی، گویا دعوت الی الخیر اس کا مقصدِ اعلیٰ ہوگا۔ "خیر"

سے مراد کیا ہے؟ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ: "الخیر ھو اتباع القراٰن وسُنّتی" یعنی خیر سے مراد قرآن اور میری سنت کا اِتباع ہے۔ (ابنِ کثیر)

''خیر'' کی اس سے زیادہ جامع اور مانع تعریف نہیں ہوسکتی، پورا دِین شریعت اس میں آ گیا، پھر "یَدْعُوْنَ" کو صیغۂ مضارع سے لا کر بتلایا کہ اس جماعت کا وظیفہ ہی دعوت الی الخیر ہوگا، یعنی دعوت الی الخیر کی مسلسل اور لگاتار کوشش ان کا فریضہ ہوگا۔

اُمر بالمعروف اور نہی عن المُنکر سے تو یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ اس کی ضرورت خاص مواقع پر ہوگی، جب وہ منکرات دیکھے جائیں، لیکن ''یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ'' کہہ کر بتلا دیا کہ اس جماعت کا کام دعوت الی الخیر ہوگا، اگرچہ اس وقت مُنکَرات موجود نہ ہوں، یا کسی فرض کی ادائیگی کا وقت نہ ہو، مثلاً آفتاب نکلنے کے بعد زوال تک نماز کا وقت نہیں ہے، لیکن وہ جماعت اس وقت بھی نماز پڑھنے کی تلقین کرے گی کہ وقتِ نماز آنے کے بعد نماز ادا کرنا ضروری ہے، یا روزے کا وقت نہیں آیا، ابھی رمضان کا مہینہ دُور ہے، لیکن وہ جماعت اپنے فرض سے غافل نہیں رہے گی، بلکہ وہ پہلے سے لوگوں کو بتلاتی رہے گی کہ جب رمضان کا مہینہ آئے تو روزہ رکھنا فرض ہوگا، غرضیکہ اس جماعت کا فریضہ دعوت الی الخیر ہوگا۔

دعوتِ دِین کے درجات

پھر اس دعوت الی الخیر کے بھی دو درجے ہیں، پہلا یہ کہ غیر مسلموں کو خیر یعنی اسلام کی طرف دعوت دینا ہے، مسلمانوں کا ہر فرد عموماً اور یہ جماعت خصوصاً دُنیا کی تمام قوموں کو خیر یعنی اسلام کی دعوت دے، زبان سے بھی اور عمل سے بھی، چنانچہ مسلمانوں کو جس آیت میں قتال و جہاد کا حکم دیا وہاں سچے مؤمنین کی اس طرح تعریف کی: "اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ" یعنی سچے مسلمان وہ ہیں کہ جب ہم ان کو زمین کی تمکین وقدرت یعنی حکومت دیتے ہیں تو ان کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی زمین میں نظامِ اطاعت قائم کرتے ہیں، جس کا ایک مظہر نماز ہے،

اور اپنا مالیاتی نظام زکوٰۃ کے اُصولوں پر قائم کرتے ہیں، نیز اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اَپنا مقصدِ حیات بناتے ہیں۔ اگر آج اُمتِ مسلمہ اپنا مقصد دیگر اَقوام کو خیر کی طرف دعوت دینا بنالیں تو وہ سب بیماریاں ختم ہو جائیں گی جو دُوسری قوموں کی نقالی سے ہمارے اندر پھیلی ہیں، کیونکہ جب کوئی قوم اس عظیم مقصد (دعوت الی الخیر) پر مجتمع ہو جائے اور یہ سمجھ لے کہ ہمیں علمی اور عملی حیثیت سے اَقوامِ عالم پر غالب آنا ہے اور اَقوام کی تربیت وتہذیب ہمارے ذمہ ہے تو اس کی نااتفاقیاں بھی یکسر ختم ہو جائیں گی اور پوری قوم ایک عظیم مقصد کے حصول کے لئے لگ جائے گی۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی کامیابیوں کا راز اسی میں مضمر تھا، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ" تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا: هم خاصة اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ہیں (ابنِ جریر)۔ یعنی یہ جماعت مخصوص صحابہ کرامؓ کی جماعت ہے، کیونکہ ان نفوسِ قدسیہ کا ہر فرد خود کو دعوت الی الخیر کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔

دعوت الی الخیر کا دُوسرا درجہ خود مسلمانوں کو دعوتِ خیر دینا ہے کہ تمام مسلمان علی العموم اور جماعتِ خاصہ علی الخصوص مسلمانوں کے درمیان تبلیغ کرے۔ اور فریضہ دعوت الی الخیر انجام دے، پھر اس میں بھی ایک تو دعوت الی الخیر عام ہوگی، یعنی تمام مسلمانوں کو ضروری اَحکام واسلامی اخلاق سے واقف کیا جائے، دُوسری دعوت الی الخیر خاص ہوگی، یعنی اُمتِ مسلمہ میں علومِ قرآن وسنت کے ماہرین پیدا کرنا، اس طرف ایک دُوسری آیت میں رہنمائی کی گئی ہے: "فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾" (التوبۃ) آگے اس جماعتِ داعیہ کا دُوسرا وصف اور امتیازِ خصوصی یہ بتلایا: "يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" یعنی وہ لوگ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور مُنکَر سے روکتے ہیں۔

معروف میں وہ تمام نیکیاں اور بھلائیاں داخل ہیں جن کا اسلام نے حکم دیا ہے، اور ہر نبی نے ہر زمانے میں اس کی ترویج کی کوشش کی، اور چونکہ یہ اُمورِ خیر جانے پہچانے

ہوئے ہیں اس لئے ''معروف'' کہلاتے ہیں۔

اسی طرح مُنکَر میں وہ تمام بُرائیاں اور مفاسد داخل ہیں جن کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ناجائز قرار دینا معلوم ومعروف ہے، اس مقام پر واجبات اور معاصی کے بجائے معروف ومُنکَر کا عنوان اختیار کرنے میں شاید یہ حکمت بھی ہو کہ روکنے ٹوکنے کا معاملہ صرف ان مسائل میں ہوگا جو اُمت میں مشہور ومعروف ہیں اور سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں، اِجتہادی مسائل جن میں اُصولِ شرعیہ کے ماتحت رائیں ہوسکتی ہیں ان میں یہ روک ٹوک کا سلسلہ نہ ہونا چاہئے۔ افسوس ہے کہ عام طور پر اس حکیمانہ تعلیم سے غفلت برتی جاتی ہے اور اِجتہادی مسائل کو جدال کا میدان بنا کر مسلمانوں کی جماعت کو ٹکرایا جاتا ہے اور اس کو سب سے بڑی نیکی قرار دیا جاتا ہے، اور اس کے بالمقابل متفق علیہ معاصی اور گناہوں سے روکنے کی طرف توجہ بہت کم دی جاتی ہے۔ آیت کے اِختتام پر اس جماعت کے انجام اور عاقبتِ محمودہ کو ان الفاظ میں فرمایا: ''وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ'' یعنی درحقیقت یہ لوگ کامیاب ہیں، فلاح وسعادتِ دارین انہی کا حصہ ہے۔

اس جماعت کا سب سے پہلا مصداق جماعتِ صحابہ ہے، جو دعوت الی الخیر اور اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عظیم مقصد کو لے کر اُٹھی اور قلیل عرصے میں ساری دُنیا پر چھاگئی، رُوم اور اِیران کی عظیم سلطنتیں روند ڈالیں اور دُنیا کو اَخلاق وپاکیزگی کا درس دیا، نیکی اور تقویٰ کی شمعیں روشن کیں۔ (معارف القرآن ج:۲ ص:۱۲۵)

ارشادِ ربانی

۲- ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿۱۸﴾ (البلد)

ترجمہ:- پھر ہووے ایمان والوں میں جو تاکید کرتے ہیں آپس میں تحمل کی اور تاکید کرتے ہیں رحم کھانے کی، وہ لوگ ہیں بڑے نصیب والے۔

خلاصۂ تفسیر

پھر (سب سے بڑھ کر یہ کہ) ان لوگوں میں سے ہوا جو اِیمان لائے اور ایک دُوسرے کو (ایمان کی) پابندی کی فہمائش کی اور ایک دُوسرے کو ترحم (علی الخلق) کی (یعنی ترکِ ظلم کی) فہمائش کی (ایمان تو سب سے مقدّم ہے، پھر اَمر بالثبات علی الایمان اوروں سے افضل ہے، پھر لوگوں کی اِیذا سے بچنا بقیہ سے اہم ہے، پھر ان اعمال کا رُتبہ ہے جو "فَكُّ رَقَبَةٍ" سے "مَتْرَبَةٍ" تک مذکور ہیں، پس یہ "ثُمَّ" تفخیمِ رُتبہ کے لئے ہے، مطلب یہ کہ جمیع اُصول وفروع میں اطاعت کرنا چاہئے تھا، آگے "اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا...الخ" کی جزا کا بیان ہے یعنی) یہی لوگ داہنے ہاتھ والے ہیں (جن کی تفصیلی جزا سورۂ واقعہ میں ہے، اور یہاں اس میں مطلق اہلِ ایمان خواص وعوام سب داخل ہیں)۔

دعوتِ دِین، تقاضائے اِیمان

"ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ" اس آیت میں ایمان کے بعد مؤمن کا یہ فرض بتلایا گیا ہے کہ وہ دُوسرے مسلمان بھائیوں کو بھی صبر اور رحمت کی تلقین کرتا رہے، صبر سے مراد نفس کو بُرائیوں سے روکنا اور بھلائیوں پر عمل کرنا ہے، اور مرحمت سے مراد دُوسروں کے حال پر رحم کھانا، اُن کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھ کر اُن کی اِیذاء اور اُن پر ظلم سے بچنا، اس میں تقریباً دِین کے سارے ہی اَحکام آگئے۔

(معارف القرآن ج:۸ ص:۷۵۲)

ارشادِ ربانی

۳- وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (البقرۃ:۱۴۳)

ترجمہ:- اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو اُمتِ معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا۔

خلاصہ تفسیر

اور (اے متبعانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اسی طرح ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنادی ہے جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے، تاکہ (دُنیا میں شرف و اِمتیاز حاصل ہونے کے علاوہ آخرت میں بھی تمہارا بڑا اشرف ظاہر ہو کہ) تم (ایک بڑے مقدمے میں جس میں ایک فریق حضراتِ انبیاء علیہم السلام ہوں گے اور فریقِ ثانی ان کی مخالف قومیں ہوں گی، ان مخالف) لوگوں کے مقابلے میں گواہ (تجویز) ہو اور (شرف بالائے شرف یہ ہوا کہ) تمہارے (قابلِ شہادت اور معتبر ہونے کے) لئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) گواہ ہوں (اور اس شہادت سے تمہاری شہادت معتبر ہونے کی تصدیق ہو، پھر تمہاری شہادت سے اس مقدمے کا حضراتِ انبیاء علیہم السلام کے حق میں فیصلہ ہو اور مخالفین مجرم قرار پا کر سزایاب ہوں، اور اس اَمر کا اعلیٰ درجے کی عزّت ہونا ظاہر ہے)۔

قرآنِ کریم نے اس اُمت کے متعلق اس خاص وصفِ فضیلت کا بیان مختلف آیات میں مختلف عنوانات سے کیا ہے، سورۂ اَعراف کے آخر میں اُمتِ محمدیہ کے لئے ارشاد ہوا:-

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿١٨١﴾

یعنی اُن لوگوں میں جن کو ہم نے پیدا کیا ہے ایک ایسی اُمت ہے جو سچی راہ بتلاتے ہیں اور اس کے موافق انصاف کرتے ہیں۔

اس میں اُمتِ محمدیہ کے اعتدالِ رُوحانی واخلاقی کو واضح فرمایا ہے، کہ وہ اپنے ذاتی مفادات اور خواہشات کو چھوڑ کر آسمانی ہدایت کے مطابق خود بھی چلتے ہیں اور دُوسروں کو بھی چلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور کسی معاملے میں نزاع واختلاف ہوجائے تو اس کا فیصلہ بھی اسی بے لاگ آسمانی قانون کے ذریعے کرتے ہیں جس میں کسی قوم یا شخص کے ناجائز مفاد کا کوئی خطرہ نہیں۔

اور سورۂ آلِ عمران میں اُمتِ محمدیہ کے اسی اعتدالِ مزاج اور اِعتدالِ رُوحانی کے آثار کو اِن الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے:-

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط (آل عمران:۱۱۰)

یعنی تم سب اُمتوں میں بہتر ہو جو عالم میں بھیجی گئی ہو، حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے اور اللہ پر اِیمان لاتے ہو۔

یعنی جس طرح ان کو رسول سب رسولوں میں افضل نصیب ہوئے، کتاب سب کتابوں میں جامع اور اَکمل نصیب ہوئی، اسی طرح ان کو قوموں کا صحت مندانہ مزاج اور اِعتدال بھی اس اعلیٰ پیمانے پر نصیب ہوا کہ وہ سب اُمتوں میں بہتر اُمت قرار پائی، اس پر علوم و معارف کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں، ایمان و عمل و تقویٰ کی تمام شاخیں ان کی قربانیوں سے سرسبز و شاداب ہوں گی، وہ کسی مخصوص ملک و اِقلیم میں محصور نہ ہوگی، بلکہ اس کا دائرۂ عمل سارے عالم اور اِنسانی زندگی کے سارے شعبوں کو محیط ہوگا، گویا اس کا وجود ہی اس لئے ہوگا کہ دُوسروں کی خیرخواہی کرے، اور جس طرح ممکن ہو انہیں جنت کے دروازوں پر لا کھڑا کر دے۔ ”اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ“ میں اس کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ اُمت دُوسروں کی خیرخواہی اور فائدے کے لئے بنائی گئی ہے، اس کا فرضِ منصبی اور قومی نشان یہ ہے کہ لوگوں کو نیک کاموں کی ہدایت کرے، بُرے کاموں سے روکے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ”اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ“ کا یہی مطلب ہے کہ دِین اس کا نام ہے کہ سب مسلمانوں کی خیرخواہی کرے۔ پھر بُرے کاموں میں کفر، شرک، بدعات، رُسومِ قبیحہ و فجور اور ہر قسم کی بداَخلاقی اور نامعقول باتیں شامل ہیں، اُن سے روکنا بھی کئی طرح ہوگا، کبھی زبان سے، کبھی ہاتھ سے، کبھی قلم سے، کبھی

تلوار سے، غرض ہر قسم کا جہاد اس میں داخل ہو گیا، یہ صفت جس قدر عموم و اہتمام سے اُمتِ محمدیہ میں پائی گئی پہلی اُمتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ (معارف القرآن ج:۱ ص:۳۶۵)

ارشادِ ربانی

۴- بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

الٓمّٓصٓ ① کِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ فَلَا یَکُنۡ فِیۡ صَدۡرِکَ حَرَجٌ مِّنۡہُ لِتُنۡذِرَ بِہٖ وَ ذِکۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ② اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ لَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ ③ وَ کَمۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ اَہۡلَکۡنٰہَا فَجَآءَہَا بَاۡسُنَا بَیَاتًا اَوۡ ہُمۡ قَآئِلُوۡنَ ④ فَمَا کَانَ دَعۡوٰىہُمۡ اِذۡ جَآءَہُمۡ بَاۡسُنَاۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ ⑤ فَلَنَسۡـَٔلَنَّ الَّذِیۡنَ اُرۡسِلَ اِلَیۡہِمۡ وَ لَنَسۡـَٔلَنَّ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ⑥ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَیۡہِمۡ بِعِلۡمٍ وَّ مَا کُنَّا غَآئِبِیۡنَ ⑦ (الاعراف)

ترجمہ:- شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔ یہ کتاب اُتری ہے تجھ پر سو چاہئے کہ تیرا جی تنگ نہ ہو اس کے پہنچانے سے تا کہ ڈراوے اس سے اور نصیحت ہو ایمان والوں کو، چلو اسی پر جو اُترا تم پر تمہارے رَبّ کی طرف سے اور نہ چلو اس کے سوا اور رفیقوں کے پیچھے، تم بہت کم دھیان کرتے ہو۔ اور کتنی بستیاں ہم نے ہلاک کر دیں کہ پہنچا ان پر ہمارا عذاب راتوں رات یا دوپہر کو سوتے ہوئے۔ پھر یہی تھی اُن کی پکار جس وقت کہ پہنچا اُن پر ہمارا عذاب کہ کہنے لگے کہ بے شک ہم ہی تھے گنہگار۔ سو ہم کو ضرور پوچھنا ہے ان سے جن کے پاس رسول بھیجے گئے تھے، اور ہم کو ضرور پوچھنا ہے رسولوں سے۔ پھر ہم اُن کو اَحوال سنا دیں گے اپنے علم سے اور ہم کہیں غائب نہ تھے۔

خلاصۂ مضامین

تمام سورت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں زیادہ تر مضامین معاد (آخرت) اور رسالت سے متعلق ہیں، اور پہلی ہی آیت "کِتٰبٌ اُنْزِلَ" میں نبوّت کا اور آیت نمبر ٦ "فَلَنَسْئَلَنَّ" میں معاد و آخرت کی تحقیق کا مضمون ہے۔ اور رُکوع چہارم کے نصف سے رُکوع ششم کے ختم تک بالکل آخرت کی بحث ہے، پھر رُکوع ششم سے اکیسویں رُکوع تک وہ معاملات مذکور ہیں جو انبیاء علیہم السلام اور ان کی اُمتوں سے ہوئے ہیں، یہ سب مسئلے رسالت سے متعلق ہیں، اور اُن قصص میں ساتھ ساتھ منکرینِ رسالت کی سزاؤں کا بھی ذکر چلا آیا ہے، تاکہ منکرینِ موجودین کو عبرت حاصل ہو، اور رُکوع بائیس کے نصف سے تئیس کے ختم تک پھر معاد کی بحث ہے، صرف ساتویں اور بائیسویں رُکوع کے شروع میں اور آخری رُکوع چوبیس کے اکثر حصے میں توحید پر خاص بحث ہے، باقی بہت کم حصہ سورت کا ایسا ہے جس میں جزوی فروعی اَحکام بمناسبتِ مقام مذکور ہیں۔ (بیان القرآن)

خلاصۂ تفسیر

الٓمّٓصٓ (اس کے معنی تو اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک راز ہے، جس پر اُمت کو اِطلاع نہیں دی گئی بلکہ اس کی جستجو کو بھی منع کیا گیا، کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْکَ...الخ) یہ (قرآن) ایک کتاب ہے جو (اللہ کی جانب سے) آپ کے پاس اس لئے بھیجی گئی ہے کہ آپ اس کے ذریعے (لوگوں کو سزائے نافرمانی سے) ڈرائیں، سو آپ کے دِل میں (کسی کے نہ ماننے سے) بالکل تنگی نہ ہونی چاہئے (کیونکہ کسی کے نہ ماننے سے آپ کے اصل مقصدِ بعثت میں جو کہ حق بات پہنچانے کا ہے، کوئی خلل نہیں آتا، پھر آپ کیوں دِل تنگ ہوں) اور یہ (قرآن خصوصیت کے ساتھ) نصیحت ہے ایمان والوں کے لئے (آگے عام اُمت کو خطاب ہے کہ جب قرآن کا منزل من اللہ ہونا ثابت ہوگیا تو) تم لوگ اس (کتاب کا) اتباع کرو جو تمہارے پاس

تمہارے رَبّ کی طرف سے آئی ہے (اتباعِ کتاب یہ ہے کہ اس کی دِل سے تصدیق بھی کرو اور اس پر عمل بھی) اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر (جس نے تمہاری ہدایت کے لئے قرآن نازل کیا) دُوسرے رفیقوں کا اتباع مت کرو، (جو تم کو گمراہ کرتے ہیں جیسے شیاطین الجن والانس) مگر باوجود (اس مشفقانہ فہمائش کے) تم لوگ بہت ہی کم نصیحت مانتے ہو۔ اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ان کو (یعنی ان کے رہنے والوں کو ان کے کفر و تکذیب کی بناء پر) ہم نے تباہ و برباد کر دیا اور ان پر ہمارا عذاب (یا تو) رات کے وقت پہنچا (جو سونے اور آرام کرنے کا وقت ہے) یا ایسی حالت میں (پہنچا) کہ وہ دوپہر کے وقت آرام میں تھے (یعنی کسی کو کسی وقت، کسی کو کسی وقت) سو جس وقت ان پر ہمارا عذاب آیا اس وقت ان کے منہ سے بجز اس کے اور کوئی بات نہ نکلتی تھی کہ واقعی ہم ظالم (اور خطاوار) تھے (یعنی ایسے وقت اقرار کیا جبکہ اقرار کا وقت گزر چکا تھا، یہ تو دُنیوی عذاب ہوا) پھر (اس کے بعد آخرت کے عذاب کا سامان ہوگا کہ قیامت میں) ہم ان لوگوں سے (بھی) ضرور پوچھیں گے جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے تھے (کہ تم نے پیغمبروں کا کہنا مانا یا نہیں؟) اور ہم پیغمبروں سے ضرور پوچھیں گے (کہ تمہاری اُمتوں نے تمہارا کہنا مانا یا نہیں؟ "يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ" اور دونوں سوالوں سے مقصود کفار کو زَجر و تنبیہ ہوگی) پھر چونکہ ہم پوری خبر رکھتے ہیں خود ہی (سب کے رُوبرو اُن کے اعمال کو) بیان کردیں گے، اور ہم (عمل کے وقت اور جگہ سے) غائب تو نہ تھے۔

معارف ومسائل

پوری سورت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۃ کے مضامین زیادہ تر معاد یعنی آخرت اور نبوّت و رِسالت کے متعلق ہیں، چنانچہ ابتدائے سورۃ سے چھٹے رُکوع تک تقریباً مضمون معاد و آخرت کا بیان ہوا ہے، پھر آٹھویں رُکوع سے اِکیسویں رُکوع تک انبیائے سابقین علیہم السلام کے حالات اور ان کی اُمتوں کے واقعات، ان کی جزا و سزا اور

ان پر آنے والے عذابوں کا مفصل تذکرہ ہے۔

"فَلَا يَكُنْ فِي صَدْرِكَ حَرَجٌ" پہلی آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرما کر یہ ارشاد کیا گیا کہ یہ قرآن اللہ کی کتاب ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجی گئی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی وجہ سے دِل تنگی نہ ہونی چاہئے، دِل تنگی سے مراد یہ ہے کہ قرآنِ کریم اور اس کے اَحکام کی تبلیغ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی کا خوف مانع نہ ہونا چاہئے کہ لوگ اس کو جھٹلا دیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اِیذا دیں گے۔

(کذا روی عن ابی العالیۃ، مظہری)

اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کتاب نازل فرمائی ہے اُس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اِمداد و حفاظت کا بھی انتظام کر دیا ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں دِل تنگ ہوں۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ دِل تنگی سے مراد یہ ہے کہ قرآن اور اَحکامِ اسلام سن کر بھی جو لوگ مسلمان نہ ہوتے تھے تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بوجہ شفقت کے شاق ہوتا تھا، اسی کو دِل تنگی سے تعبیر کیا گیا اور یہ بتلایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرضِ منصبی صرف تبلیغ و دعوت کا ہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام کر لیا تو اَب یہ ذمہ داری آپ کی نہیں کہ کون مسلمان ہوا، کون نہیں ہوا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں بلا وجہ دِل تنگ ہوں۔

"فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ" یعنی قیامت کے روز عوام الناس سے سوال کیا جائے گا کہ ہم نے تمہارے پاس اپنے رسول اور کتابیں بھیجی تھیں، تم نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اور رسولوں سے پوچھا جائے گا کہ جو پیغامِ رسالت اور اَحکامِ اِلٰہیہ دے کر ہم نے آپ کو بھیجا تھا وہ آپ حضرات نے اپنی اپنی اُمتوں کو پہنچا دیئے یا نہیں؟

(اخرجہ البیہقی عن ابن عباس، مظہری)

اور صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبے میں لوگوں سے سوال کیا کہ قیامت کے روز تم لوگوں سے

میرے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ میں نے تم کو اللہ کا پیغام پہنچادیا یا نہیں؟ "فَمَا اَنْتُمْ قَائِلُوْنَ؟" یعنی "اُس وقت تم اس کے جواب میں کیا کہو گے؟" سب صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ: ہم کہیں گے کہ آپ نے اللہ کا پیغام ہم تک پہنچادیا اور امانتِ خداوندی کا حق ادا کر دیا اور اُمت کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کیا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ" یعنی "یا اللہ! آپ گواہ رہیں"۔

• اور مسندِ احمد کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ مجھ سے دریافت فرماویں گے کہ کیا میں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام بندوں کو پہنچادیا؟ اور میں جواب میں عرض کروں گا کہ میں نے پہنچادیا ہے، اس لئے اب تم سب اس کا اہتمام کرو کہ جو لوگ حاضر ہیں وہ غائبین تک میرا پیغام پہنچادیں۔ (مظہری)

"غائبین" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس زمانے میں موجود تھے مگر اس مجلس میں حاضر نہ تھے، اور وہ نسلیں بھی جو بعد میں پیدا ہوں گی، ان تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ ہر زمانے کے لوگ آنے والی نسل کو اس پیغام کے پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھیں تا کہ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام بنی آدم کو یہ پیغام پہنچ جائے۔
(معارف القرآن ج:۳ ص:۵۱۶)

ارشادِ ربانی

۵- بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَالْعَصْرِ ① اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ② اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ③ (العصر)

ترجمہ:- قسم ہے عصر کی! مقرّر انسان ٹوٹے میں ہے، مگر جو لوگ کہ یقین لائے اور کئے بھلے کام اور آپس میں تاکید کرتے رہے سچے دِین کی، اور آپس میں تاکید کرتے رہے تحمل کی۔

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے زمانے کی (جس میں رنج وخسران واقع ہوتا ہے کہ) اِنسان (اپنی عمر ضائع کرنے کی وجہ سے) بڑے خسارے میں ہے مگر وہ لوگ جو اِیمان لائے اور اُنہوں نے اچھے کام کئے (جو اپنے نفس کا کمال ہے) اور ایک دُوسرے کو حق پر قائم رہنے کی فہمائش کرتے رہے، اور ایک دُوسرے کو (اعمال کی) پابندی کی فہمائش کرتے رہے (جو دُوسروں کی تکمیل ہے، تو جو لوگ خود بھی یہ کمال حاصل کریں اور دُوسروں کی بھی تکمیل کریں یہ لوگ البتہ خسارے میں نہیں بلکہ نفع میں ہیں)۔

سورۂ عصر قرآنِ کریم کی بہت مختصر سی سورت ہے، لیکن ایسی جامع ہے کہ بقول اِمام شافعی رحمہ اللہ اگر لوگ اسی سورت کو غور وتدبر کے ساتھ پڑھ لیں تو دِین ودُنیا کی دُرستی کے لئے کافی ہوجائے۔ اس سورت میں حق تعالیٰ نے زمانے کی قسم کھا کر فرمایا کہ نوعِ انسان بڑے خسارے میں ہے، اور اس خسارے سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جو چار چیزوں کے پابند ہوں، ایمان، عملِ صالح، دُوسروں کو حق کی نصیحت ووصیت اور صبر کی وصیت۔ دِین ودُنیا کے خسارے سے بچنے اور نفعِ عظیم حاصل کرنے کا یہ قرآنی نسخہ چار اَجزاء سے مرکب ہے، جن میں پہلے دو جزء اپنی ذات کی اصلاح کے متعلق ہیں، اور دُوسرے دو جزء دُوسرے مسلمانوں کی ہدایت واصلاح سے متعلق ہیں۔

اس سورت نے مسلمانوں کو ایک بڑی ہدایت یہ دی کہ اُن کا صرف اپنے عمل کو قرآن وسنت کے تابع کرلینا جتنا اہم اور ضروری ہے اُتنا ہی اہم یہ ہے کہ دُوسرے مسلمانوں کو بھی ایمان اور عملِ صالح کی طرف بلانے کی مقدور بھر کوشش کرے، ورنہ صرف اپنا عمل نجات کے لئے کافی نہ ہوگا، خصوصاً اپنے اہل وعیال اور احباب ومتعلقین کے اعمالِ سیئہ سے غفلت برتنا اپنی نجات کا راستہ بند کرنا ہے، اگرچہ خود وہ کیسے ہی اعمالِ صالحہ کا پابند ہو، اسی لئے قرآن وحدیث میں ہر مسلمان پر اپنی اپنی مقدرت کے مطابق اَمر بالمعروف اور نہی

عن المُنکَر فرض کیا گیا ہے۔ اس معاملے میں عام مسلمان بلکہ بہت سے خواص تک غفلت میں مبتلا ہیں، خود عمل کرنے کو کافی سمجھ بیٹھے ہیں، اولاد وعیال کچھ بھی کرتے رہیں اس کی فکر نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس آیت کی ہدایت پر عمل کی توفیق نصیب فرماویں۔
(معارف القرآن ج:۸ ص:۸۱۲)

علماء کی ذمہ داری

''دعوتِ دِین کی عمومی ذمہ داری اور اس فریضے کی ادائیگی اپنی اجتماعی حیثیت میں تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے لیکن بطورِ خاص اہلِ علم کا فریضہ ہے کہ وہ دعوتِ دِین کا کام انجام دیں، اور ایسی جماعت بن کر اُٹھیں جن کی زندگی کا محوَر ومرکز ہی دعوت الی اللہ ہو، اور وہ اپنے جملہ اوقات کو اسی فریضے کی ادائیگی میں صَرف کریں۔''

ارشادِ ربانی

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْٓا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ (التوبۃ)

ترجمہ:- اور ایسے تو نہیں مسلمان کہ کوچ کریں سارے، سو کیوں نہ نکلا ہر فرقے میں سے ان کا ایک حصہ تا کہ سمجھ پیدا کریں دِین میں اور تا کہ خبر پہنچائیں اپنی قوم کو جبکہ لَوٹ کر آئیں ان کی طرف تا کہ وہ بچتے رہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور (ہمیشہ کے لئے) مسلمانوں کو یہ (بھی) نہ چاہئے کہ (جہاد کے واسطے) سب کے سب (ہی) نکل کھڑے ہوں (کہ اس میں دُوسری اسلامی ضروریات معطل ہوتی

ہیں) سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر ہر بڑی جماعت میں سے ایک ایک چھوٹی جماعت (جہاد میں) جایا کرے (اور کچھ اپنے وطن میں رہ جایا کریں) تاکہ باقی ماندہ لوگ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں آپ سے اور آپ کے بعد علمائے شہر سے) دِین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں اور تاکہ یہ لوگ اپنی قوم کو (جو کہ جہاد میں گئے ہوئے ہیں) جبکہ وہ ان کے پاس واپس آویں (دِین کی باتیں سنا کر خدا کی نافرمانی سے) ڈراویں تاکہ وہ (اُن سے دِین کی باتیں سن کر بُرے کاموں سے) احتیاط رکھیں۔

واجباتِ علم

اس جگہ قرآنِ کریم نے اس کو بھی ایک ہی جملے میں پورا بیان فرما دیا ہے، وہ ہے: "لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ"، یعنی" تاکہ وہ اپنی قوم کو اللہ کی نافرمانی سے ڈرائیں" یہاں بھی یہ بات قابلِ نظر ہے کہ اس جملے میں عالم کا فرض اِنذارِ قوم بتلایا ہے، "اِنذار" کا لفظی ترجمہ ہم اُردو میں ڈرانے سے کرتے ہیں، مگر یہ اس کا پورا ترجمہ نہیں، اُردو زبان کی تنگی کی وجہ سے کوئی ایک لفظ اس کے پورے ترجمے کو اَدا نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈرانا کئی طرح کا ہوتا ہے، ایک ڈرانا دُشمن، چور، ڈاکو یا کسی درندے، زہریلے جانور سے ہے، ایک ڈرانا وہ ہے جو باپ اپنی شفقت سے اولاد کو تکلیف دہ چیزوں جیسے آگ، زہریلے جانور، مضر غذاء سے ڈراتا ہے، جس کا منشاء شفقت و محبت ہوتی ہے، اس کا لب ولہجہ بھی کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ اِنذار اسی قسم کے ڈرانے کا نام ہے، اسی لئے پیغمبروں اور رسولوں کو "نذیر" کا لقب دیا گیا ہے اور عالم کا یہ فریضۂ اِنذار درحقیقت وراثتِ نبوّت ہی کا جز ہے جو بنصِ حدیث عالم کو حاصل ہوتی ہے۔

مگر یہاں قابلِ غور یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے دو لقب ہیں، "بشیر" اور "نذیر"، نذیر کے معنی تو ابھی آپ معلوم کرچکے ہیں، بشیر کے معنی ہیں بشارت اور خوشخبری سنانے والا، انبیاء علیہم السلام کا ایک کام یہ بھی ہے کہ نیک عمل کرنے والوں کو بشارت

سنائیں، اس جگہ بھی اگرچہ صراحۃً ذکر اِنذار کا کیا گیا ہے، مگر دُوسری نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم کا فرض یہ بھی ہے کہ نیک کام کرنے والوں کو بشارت بھی سنائے، لیکن اس جگہ صرف ''اِنذار'' کے ذکر پر اِکتفاء کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے ذمے دو کام ہیں، ایک یہ کہ جو عمل اس کے لئے دُنیا و آخرت میں مفید ہیں ان کو اِختیار کرے، دُوسرے یہ کہ جو عمل اس کے لئے مضر ہیں ان سے بچے، باتفاقِ علماء و عقلاء ان دونوں کاموں میں سے دُوسرا کام سب سے مقدّم اور اہم ہے، اسی کو فقہاء کی اصطلاح میں ''جلبِ منفعت'' اور ''دفعِ مضرّت'' کے دو لفظوں سے تعبیر کرکے دفعِ مضرّت کو جلبِ منفعت سے مقدم قرار دیا ہے، اس کے علاوہ دفعِ مضرّت میں ایک حیثیت سے جلبِ منفعت کا مقصد بھی پورا ہوجاتا ہے، کیونکہ جو کام انسان کے لئے مفید اور ضروری ہیں، ان کا ترک بڑی مضرّت ہے، تو جو شخص مضرّتِ اعمال سے بچنے کا اہتمام کرے گا وہ اعمالِ ضروریہ کے ترک سے بچنے کا بھی اہتمام کرے گا۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آج کل جو عموماً وعظ و تبلیغ بہت کم مؤثر ہوتی ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں اِنذار کے آداب نہیں ہوتے، جس کے طرزِ بیان اور لب و لہجے سے شفقت و رحمت اور خیرخواہی مترشح ہو، مخاطب کو یقین ہو کہ اس کے کلام کا مقصد نہ مجھے رُسوا کرنا ہے، نہ بدنام کرنا، نہ اپنے دِل کا غبار نکالنا، بلکہ یہ جس چیز کو میرے لئے مفید اور ضروری سمجھتا ہے وہ محبت کی وجہ سے مجھے بتلا رہا ہے، اگر آج ہماری تبلیغ اور خلافِ شرع اُمور کے مرتکب لوگوں کو اِصلاح کی دعوت کا یہ طرز ہوجائے تو اس کا ایک نتیجہ تو قطعاً لازم ہی ہے کہ مخاطب کو ہماری گفتگو سے ضد پیدا نہیں ہوگی، وہ جواب دہی کی فکر میں پڑنے کے بجائے اپنے اعمال کا جائزہ لینے اور اَنجام سوچنے کی طرف متوجہ ہوجائے گا، اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو کبھی نہ کبھی اس کو قبول بھی کرے گا اور دُوسرا نتیجہ یہ لازمی ہے کہ کم از کم اس سے باہمی منافرت اور لڑائی جھگڑا پیدا نہیں ہوگا، جس میں آج کل ہماری پوری قوم مبتلا ہے۔

آخر میں "لَعَلَّھُمْ یَحْذَرُوْنَ" فرما کر اس طرف بھی اشارہ کردیا کہ عالم کا کام اتنا ہی نہیں کہ عذاب سے ڈرا دیا بلکہ اس پر نظر رکھنا بھی ہے کہ اس کی تبلیغ و دعوت کا اثر کتنا اور کیا ہوا؟ ایک دفعہ مؤثر نہیں ہوئی تو بار بار کرتا رہے، تا کہ اس کا نتیجہ "یَحْذَرُوْنَ" برآمد ہوسکے، یعنی قوم کا گناہوں سے بچنا، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ (معارف القرآن ج:۴ ص:۴۸۶)

ترکِ دعوت پر وعید

"دُوسروں کو دِین کی دعوت دینا جس قدر اہم اور باعثِ فضیلت ہے، اس کا ترک کرنا اتنا ہی باعثِ ملامت و وعید ہے، مندرجہ ذیل آیات کی تفسیر میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ائمۂ تفاسیر و مشائخ کے اقوال کی روشنی میں فریضۂ دعوت میں غفلت کرنے والوں کے لئے وعید و ملامت کا ذکر کیا ہے۔"

ارشادِ ربانی

وَتَرٰی كَثِیْرًا مِّنْهُمْ یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۶۲﴾ لَوْلَا یَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا یَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾ (المائدۃ)

ترجمہ:- اور تو دیکھے گا بہتوں کو اُن میں سے کہ دوڑتے ہیں گناہ پر اور ظلم اور حرام کھانے پر، بہت بُرے کام ہیں جو کر رہے ہیں۔ کیوں نہیں منع کرتے ان کے درویش اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے، بہت ہی بُرے عمل ہیں جو کر رہے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور آپ ان (یہودیوں) میں بہت آدمی ایسے دیکھتے ہیں جو دوڑ دوڑ کر گناہ (یعنی جھوٹ) اور ظلم اور حرام (مال) کھانے پر گرتے ہیں واقعی ان کے یہ کام بُرے ہیں (یہ تو

عوام کا حال تھا، آگے خواص کا حال ہے کہ) ان کو مشائخ اور علماء گناہ کی بات کہنے سے (باوجود علم مسئلہ واطلاع کے) کیوں نہیں منع کرتے، واقعی ان کی یہ عادت بُری ہے۔

معارف ومسائل

اصلاحِ اعمال کا طریقہ

اصلاحِ اعمال کا سب سے زیادہ اہتمام کرنے والے حضرات صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ ہیں، ان حضرات نے انہی ارشاداتِ قرآنیہ سے یہ اہم اُصول اخذ کیا ہے کہ جتنے بُرے یا بھلے اعمال انسان کرتا ہے، اصل میں ان کا اصل سرچشمہ وہ مخفی ملکات اور اخلاق ہوتے ہیں جو اِنسان کی طبیعتِ ثانیہ بن جاتے ہیں، اسی لئے بُرے اعمال اور جرائم کی روک تھام کے لئے ان کی نظر انہی مخفی ملکات پر ہوتی ہے اور ان کی اصلاح کر دیتے ہیں، تو تمام اعمال خود بخود دُرست ہونے لگتے ہیں، مثلاً کسی کے دِل میں مالِ دُنیا کی حرص کا غلبہ ہے، وہ اس کے نتیجے میں رِشوت بھی لیتا ہے، سود بھی کھاتا ہے، اور موقع ملے تو چوری اور ڈاکہ تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے، حضراتِ صوفیائے کرام ان جرائم کا الگ الگ علاج کرنے کے بجائے وہ نسخہ استعمال کرتے ہیں جس سے ان سب جرائم کی بنیاد منہدم ہوجائے، اور وہ ہے دُنیا کی ناپائیداری اور اس کی عیش وعشرت کے زہر آلود ہونے کا استحضار۔

اسی طرح کسی کے دِل میں تکبر، غرور ہے یا وہ غصّے میں مغلوب ہے اور دُوسروں کی تحقیر وتوہین کرتا ہے، دوستوں اور پڑوسیوں سے لڑتا ہے، یہ حضرات فکرِ آخرت اور خدا تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کو مستحضر کرنے والا نسخہ استعمال کرتے ہیں، جن سے یہ اعمالِ بد خود بخود ختم ہوجاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس قرآنی اشارے سے معلوم ہوا کہ انسان میں کچھ ملکات ہوتے ہیں جو طبیعتِ ثانیہ بن جاتے ہیں، یہ ملکات خیر اور بھلائی کے ہیں تو نیک عمل خود بخود ہونے لگتے ہیں، اسی طرح ملکات بُرے ہیں تو بُرے اعمال کی طرف انسان خود بخود دوڑنے

لگتا ہے، مکمل اصلاح کے لئے ان ملکات کی اصلاح ضروری ہے۔

علمائے یہود کو تنبیہ

دُوسری آیت میں یہود کے مشائخ اور علماء کو اس پر سخت تنبیہ کی گئی کہ وہ ان لوگوں کو بُرے اعمال سے کیوں نہیں روکتے، قرآن میں اس جگہ دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں، ایک "رَبّٰنِیُّوْنَ" جس کا ترجمہ ہے اللہ والے، یعنی عابد، زاہد جن کو ہمارے عرف میں درویش، پیر یا مشائخ کہا جاتا ہے، اور دُوسرا لفظ "اَحْبَارُ" استعمال فرمایا۔ یہود کے علماء کو "اَحبار" کہا جاتا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اَمر بالمعروف اور نہی عن المُنکَر کی اصل ذمہ داری ان دو طبقوں پر ہے، ایک مشائخ پر، دُوسرے علماء پر۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ ربانیوں سے مراد وہ علماء ہیں جو حکومت کی طرف سے مأمور اور بااِقتدار ہوں، اور اَحبار سے مراد عام علماء ہیں۔ اس صورت میں جرائم سے روکنے کی ذمہ داری حکام اور علماء دونوں پر عائد ہوجاتی ہے، اور بعض دُوسری آیات میں اس کی تصریح بھی ہے۔

آخرِ آیت میں فرمایا: "لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ" یعنی ان مشائخ و علماء کی یہ سخت بُری عادت ہے کہ اپنا فرضِ منصبی اَمر بالمعروف اور نہی عن المُنکَر چھوڑ بیٹھے، قوم کو ہلاکت کی طرف جاتا ہوا دیکھتے ہیں اور یہ ان کو نہیں روکتے۔

علمائے مفسرین نے فرمایا کہ پہلی آیت جس میں عوام کی غلط کاریوں کا ذکر تھا، اس کے آخر میں تو "لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ" ارشاد فرمایا گیا، اور دُوسری آیت جس میں مشائخ و علماء کی غلطی پر تنبیہ کی گئی ہے اس کے آخر میں "لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ" کا لفظ ارشاد فرمایا گیا، وجہ یہ ہے کہ عربی لغت کے اعتبار سے لفظ "فعل" تو ہر کام کو شامل ہے، خواہ باقصد ہو یا بلاقصد، اور لفظ "عمل" صرف اس کام کے لئے بولا جاتا ہے جو قصد و اِرادہ سے کیا جائے، اور لفظ "صنع" اور "صنعت" کا ایسے کام کے لئے اطلاق کیا جاتا ہے جس میں قصد و اِختیار بھی ہو اور اس کو بار بار بطور عادت اور مقصد کے دُرست کرکے کیا جائے، اس

لئے عوام کی بدعملی کے نتیجے میں تو صرف لفظ ''عمل'' اختیار فرمایا، ''لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ'' اور خواص مشائخ و علماء کی غلط کاری کے نتیجے میں لفظ ''صنع'' اختیار فرمایا، ''لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ'' اس میں اس کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے کہ ان کے علماء و مشائخ کی یہ غلط رَوِش کہ یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ اگر ہم ان کو منع کریں گے تو یہ ہمارا کہنا سنیں گے اور باز آجائیں گے، پھر بھی ان لوگوں کے نذرانوں کے لالچ یا بداِعتقاد ہوجانے کے خوف سے ان کے دِلوں میں حمایتِ حق کا کوئی داعیہ پیدا نہیں ہوتا، یہ اُن بدکاروں کے اعمالِ بد سے بھی زیادہ اَشد ہے۔

جس کا حاصل یہ ہوا کہ جس قوم کے لوگ جرائم اور گناہوں میں مبتلا ہوں گے اور ان کے مشائخ و علماء کو یہ بھی اندازہ ہو کہ ہم ان کو روکیں گے تو یہ باز آجائیں گے، ایسے حالات میں اگر یہ کسی لالچ یا خوف کی وجہ سے ان جرائم اور گناہوں کو نہیں روکتے تو ان کا جرم اصل مجرموں، بدکاروں کے جرم سے بھی زیادہ اَشد ہے، اس لئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ: مشائخ و علماء کے لئے پورے قرآن میں اس آیت سے زیادہ سخت تنبیہ کہیں نہیں۔ اور اِمامِ تفسیر ضحاک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: میرے نزدیک مشائخ و علماء کے لئے یہ آیت سب سے زیادہ خوفناک ہے۔ (ابنِ جریر و ابنِ کثیر)

وجہ یہ ہے کہ اس آیت کی رُو سے ان کا جرم تمام چوروں، ڈاکوؤں اور ہر طرح کے بدکاروں کے جرم سے بھی زیادہ سخت ہوجاتا ہے (العیاذ باللہ)۔ مگر یاد رہے کہ یہ شدّت اور وعید اسی صورت میں ہیں جبکہ مشائخ و علماء کو اندازہ بھی ہو کہ ان کی بات سنی اور مانی جائے گی، اور جس جگہ قرائن یا تجربے سے یہ گمان غالب ہو کہ کوئی سنے گا نہیں، بلکہ اس کے مقابلے میں ان کو اِیذائیں دی جائیں گی تو وہاں حکم یہ ہے کہ ان کی ذمہ داری تو ساقط ہوجاتی ہے، لیکن افضل و اعلیٰ پھر بھی یہی رہتا ہے کہ کوئی مانے یا نہ مانے، یہ حضرات اپنا فرض ادا کریں، اور اس میں کسی کی ملامت یا اِیذا کی فکر نہ کریں، جیسا کہ چند آیات پہلے اللہ تعالیٰ کے مقبول مجاہدین کی صفات میں گزر چکا ہے: ''وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ'' یعنی یہ

لوگ اللہ کے راستے میں اور حق ظاہر کرنے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہیں کرتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس جگہ بات سننے اور ماننے کا احتمال غالب ہو وہاں مشائخ وعلماء پر بلکہ ہر مسلمان پر جس کو اس کام کا جرم و گناہ ہونا معلوم ہو، فرض ہے، کہ گناہ کو روکنے اور منع کرنے میں مقدور بھر کوشش کرے، خواہ ہاتھ سے یا زبان سے، یا کم از کم اپنے دِل کی نفرت اور اِعراض سے، اور جس جگہ غالب گمان یہ ہو کہ اس کی بات نہ سنی جائے گی یا یہ کہ اس کے خلاف دُشمنی بھڑک اُٹھے گی، تو ایسی حالت میں منع کرنا اور روکنا فرض تو نہیں رہتا، مگر افضل و اعلیٰ بہرحال ہے۔ اَمر بالمعروف اور نہی عن المُنکَر کے متعلق یہ تفصیلات صحیح احادیث سے مستفاد ہیں، خود نیک عمل اختیار کرنے اور بُرے اعمال سے بچنے کے ساتھ دُوسروں کو بھی نیکی کی طرف ہدایت اور بُرائی سے روکنے کا فریضہ عام مسلمانوں پر اور بالخصوص علماء و مشائخ پر ڈال کر اسلام نے دُنیا میں امن و اطمینان پیدا کرنے کا ایک ایسا زرّیں اُصول بنا دیا ہے کہ اس پر عمل ہونے لگے تو پوری قوم بہت آسانی کے ساتھ تمام بُرائیوں سے پاک ہو سکتی ہے۔

اصلاحِ اُمت کا طریقہ

اسلام کے قرونِ اُولیٰ میں اور قرونِ مابعد میں بھی جب تک اس پر عمل ہوتا رہا، مسلمانوں کی پوری قوم علم و عمل، اخلاق و کردار کے اعتبار سے پوری دُنیا میں سربلند اور ممتاز رہی، اور جب سے مسلمانوں نے اس فریضے کو نظر انداز کر دیا، اور جرائم کی روک تھام کو صرف حکومت اور اس کی پولیس کا فرض سمجھ کر خود اس سے علیحدہ ہو بیٹھے تو اس کا نتیجہ وہی ہوا جو آج ہر جگہ سامنے ہے کہ ماں باپ اور پورا خاندان دِین دار اور پابندِ شریعت ہے، مگر اولاد اور متعلقین اس کے برعکس ہیں، ان کا نظری اور فکری رُخ بھی اور ہے، اور عملی طریقے بھی جداگانہ ہیں، اسی لئے ملت کی اجتماعی اصلاح کے لئے قرآن و حدیث میں اَمر بالمعروف

اور نہی عن المنکر پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے، قرآن نے اس کام کو اُمتِ محمدیہ کی خصوصیات میں شمار فرمایا ہے، اور اس کی خلاف ورزی کرنے کو سخت گناہ اور موجبِ عذاب قرار دیا ہے، حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کسی قوم میں گناہ کے کام کئے جائیں اور کوئی آدمی اس قوم میں رہتا ہے اور ان کو منع نہیں کرتا تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں پر عذاب بھیج دے (بحرِ محیط)۔ (معارف القرآن ج:۳ ص:۱۸۴)

❋❋❋

تیسرا باب

مراحلِ دعوت

قرابت داروں سے دعوت کا آغاز

ارشادِ ربانی

۱- وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ (الشعراء)

ترجمہ:- اور ڈر سنا دے اپنے قریب کے رشتہ داروں کو۔

خلاصۂ تفسیر

(اسی مضمون سے) آپؐ (سب سے پہلے) اپنے نزدیک کے کنبہ کو ڈرایئے (چنانچہ آپؐ نے سب کو پکار کر جمع کیا اور شرک پر عذابِ الٰہی سے ڈرایا جیسا کہ حدیثوں میں ہے)۔

"وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ" عشیرہ کے معنے ہیں کنبہ اور خاندان، اور اقربین کی قید سے ان میں سے بھی قریبی رشتہ دار مراد ہیں۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تبلیغِ رسالت اور اِنذار پوری اُمت کے لئے فرض ہے، اس جگہ خاندان کے لوگوں کی تخصیص میں کیا حکمت ہے؟ غور کیا جائے تو اس میں تبلیغ و دعوت کے آسان اور مؤثر بنانے کا ایک خاص طریقہ بتلایا گیا ہے، جس کے آثار دُور رَس ہیں، وہ یہ کہ اپنے کنبے اور خاندان کے لوگ اپنے سے قریب ہونے کی بناء پر اس کے حق دار بھی ہیں کہ ہر خیر اور اچھے

کام میں اُن کو دُوسروں سے مقدّم کیا جائے، اور باہمی تعلقات اور ذاتی واقفیت کی بناء پر ان میں کوئی جھوٹا دعوے دار نہیں کھپ سکتا، اور جس کی سچائی اور اخلاقی برتری خاندان کے لوگوں میں معروف ہے اس کی سچی دعوت قبول کر لینا ان کے لئے آسان بھی ہے، اور قریبی رشتہ دار جب کسی اچھی تحریک کے حامی بن گئے تو ان کی اُخوّت و امداد بھی پختہ بنیاد پر قائم ہوتی ہے، وہ خاندان جمعیت کے اعتبار سے بھی ان کی تائید و اُخوّت پر مجبور ہوتے ہیں اور قریبی رشتہ داروں، عزیزوں کا ایک ماحول حق و صداقت کی بنیادوں پر تیار ہو گیا تو روزمرّہ کی زندگی میں ہر ایک کو دِین کے اَحکام پر عمل کرنے میں بہت سہولت ہو جاتی ہے، اور پھر ایک مختصر سی طاقت تیار ہو کر دُوسروں تک دعوت و تبلیغ کے پہنچانے میں مدد ملتی ہے۔ قرآنِ کریم کی ایک دُوسری آیت میں ہے: "قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا" یعنی اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اس میں اہل و عیال کے جہنم سے بچانے کی ذمہ داری خاندان کے ہر ہر فرد پر ڈال دی گئی ہے، جو اِصلاحِ اعمال و اخلاق کا آسان اور سیدھا راستہ ہے، اور غور کیا جائے تو کسی انسان کا خود اعمال و اخلاقِ صالحہ کا پابند ہونا اور پھر اس پر قائم رہنا اس وقت تک عادۃً ممکن نہیں ہوتا جب تک اس کا ماحول اس کے لئے ساز گار نہ ہو، سارے گھر میں اگر ایک آدمی نماز کی پوری پابندی کرنا چاہے تو اس پکے نمازی کو بھی اپنے حق کی ادائیگی میں مشکلات حائل ہوں گی۔ آج کل جو حرام چیزوں سے بچنا دُشوار ہو گیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ فی الواقع اس کا چھوڑنا کوئی بڑا مشکل کام ہے، بلکہ سبب یہ ہے کہ سارا ماحول، ساری برادری جب ایک گناہ میں مبتلا ہے تو اکیلے ایک آدمی کو بچنا دُشوار ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے تمام خاندان کے لوگوں کو جمع فرما کر پیغامِ حق سنایا، اس وقت اگرچہ لوگوں نے قبولِ حق سے انکار کیا مگر رفتہ رفتہ خاندان کے لوگوں میں اسلام و ایمان داخل ہونا شروع ہو گیا اور آپ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے اسلام کو ایک بڑی قوّت حاصل ہوگئی۔ (معارف القرآن ج:۶ ص:۵۴۵)

ارشادِ ربانی

۲- يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ
عَلَيْهَا مَلٰٓىِٕكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا
يُؤْمَرُوْنَ ۝٦ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝٧ (التحریم)

ترجمہ:- اے ایمان والو! بچاؤ اپنی جان کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے جس کی چھپٹیاں ہیں آدمی اور پتھر، اُس پر مقرّر ہیں فرشتے تندخو، زبردست، نافرمانی نہیں کرتے اللہ کی جو بات فرمائے اُن کو، اور وہی کام کرتے ہیں جو اُن کو حکم ہو۔ اے منکر ہونے والو! مت بہانے بتلاؤ آج کے دن، وہی بدلہ پاؤ گے جو تم کرتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! (جب رسول کی بیبیوں کو بھی عملِ صالح اور اطاعت سے چارہ نہیں جیسا کہ اُوپر معلوم ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس پر مأمور ہیں کہ اپنی ازواج کو نصیحت کر کے عملِ صالح پر آمادہ کریں تو باقی سب اُمت پر بھی یہ فریضہ زیادہ مؤکد ہو گیا کہ اپنے اہل وعیال کی اصلاحِ اعمال واخلاق میں غفلت نہ برتیں، اس لئے حکم دیا گیا کہ) تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو (دوزخ کی) آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن (سوختہ) آدمی اور پتھر ہیں (اپنے کو بچانا خود اطاعتِ اَحکام کرنا اور گھر والوں کو بچانا اُن کو اَحکامِ اِلٰہیہ کا سکھانا اور اُن پر عمل کرانے کے لئے زبان سے، ہاتھ سے، بقدرِ امکان کوشش کرنا، آگے اُس آگ کی دُوسری حالت کا بیان ہے کہ) جس پر تندخو (اور) مضبوط قوی فرشتے (متعین) ہیں (کہ نہ وہ کسی پر رحم کریں، نہ کوئی اُن کا مقابلہ کر کے بچ سکے) جو خدا کی

(ذرا) نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جو اُن کو حکم دیتا ہے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اُس کو (فوراً) بجالاتے ہیں (غرض اس دوزخ پر ایسے فرشتے مقرّر ہیں جو کافروں کو دوزخ میں داخل کر کے چھوڑیں گے اور اس وقت کافروں سے کہا جائے گا کہ (اے کافرو! تم آج عذر (معذرت) مت کرو (کہ بے سود ہے) بس تم کو تو اُسی کی سزا مل رہی ہے جو کچھ تم (دُنیا میں) کیا کرتے تھے۔

معارف ومسائل

"قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ" الآیۃ، اس آیت میں عام مسلمانوں کو حکم ہے کہ جہنم کی آگ سے اپنے آپ کو بھی بچائیں اور اپنے اہل وعیال کو بھی، پھر نارِ جہنم کی ہولناک شدّت کا ذکر فرمایا اور آخر میں یہ بھی فرمایا کہ جو اس جہنم کا مستحق ہوگا وہ کسی زور، طاقت، جتھہ یا خوشامد یا رِشوت کے ذریعے اُن فرشتوں کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا، جو جہنم پر مسلط ہیں، جن کا نام "زبانیہ" ہے۔

لفظ "اَهْلِيْكُمْ" میں اہل وعیال سب داخل ہیں، جن میں بیوی، اولاد، غلام، باندیاں سب داخل ہیں، اور بعید نہیں کہ ہمہ وقتی نوکر چاکر بھی غلام باندیوں کے حکم میں ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اپنے آپ کو جہنم سے بچانے کی فکر تو سمجھ میں آگئی (کہ ہم گناہوں سے بچیں اور اَحکامِ اِلٰہیہ کی پابندی کریں) مگر اہل وعیال کو ہم کس طرح جہنم سے بچائیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جن کاموں سے منع فرمایا ہے اُن کاموں سے ان سب کو منع کرو، اور جن کاموں کے کرنے کا تم کو حکم دیا ہے، تم اُن کے کرنے کا اہل وعیال کو بھی حکم کرو، تو یہ عمل ان کو جہنم کی آگ سے بچا سکے گا۔ (رُوح المعانی)

اہلِ خانہ کی تعلیم وتربیت ہر مسلمان پر فرض ہے

حضراتِ فقہاء نے فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ اپنی بیوی واولاد کو فرائضِ شرعیہ اور حلال وحرام کے اَحکام کی تعلیم دے، اور اُس پر عمل کرانے کے لئے کوشش کرے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس شخص پر اپنی رحمت نازل کرے جو کہتا ہے کہ اے میرے بیوی بچو! تمہاری نماز، تمہارا روزہ، تمہاری زکوٰۃ، تمہارا مسکین، تمہارا یتیم، تمہارے پڑوسی، اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اس کے ساتھ جنت میں جمع فرمائیں گے۔ تمہاری نماز، تمہارا روزہ وغیرہ فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کا خیال رکھو، اس میں غفلت نہ ہونے پائے اور "مسکینکم ویتیمکم" وغیرہ فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے جو حقوق تمہارے ذمہ ہیں اُن کو تو خوشی اور پابندی سے ادا کرو، اور بعض بزرگوں نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب میں وہ شخص ہوگا جس کے اہل وعیال دِین سے جاہل وغافل ہوں۔ (رُوح)

عام مؤمنین کی نصیحت کے بعد کفار کو خطاب ہے کہ اب تمہارا کیا ہوا تمہارے سامنے آرہا ہے، اب کوئی عذر کسی کا قبول نہیں کیا جاسکتا: "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْیَوْمَ" کا یہی مطلب ہے۔ (معارف القرآن ج:۸ ص:۵۰۲و۵۰۳)

۳- وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾ (مریم)

ترجمہ:- اور حکم کرتا تھا اپنے گھر والوں کو نماز کا اور زکوٰۃ کا اور تھا اپنے رَبّ کے یہاں پسندیدہ۔

خلاصۂ تفسیر

اور اپنے متعلقین کو نماز اور زکوٰۃ کا (خصوصاً اور بھی اَحکام کا عموماً) حکم کرتے رہتے تھے اور وہ اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ تھے۔

"كَانَ يَأْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ" حضرت اسماعیل علیہ السلام کے خصوصی اوصاف میں ایک یہ بھی بیان فرمایا کہ وہ اپنے اہل وعیال کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام تو ہر مؤمن مسلمان کے ذمہ واجب ہے کہ اپنے اہل وعیال کو نیک کاموں کی ہدایت کرتا رہے، قرآنِ حکیم میں عام مسلمانوں کو خطاب ہے: "قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا" یعنی بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے، پھر اس میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی خصوصیت کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ یہ حکم اگرچہ عام ہے اور سبھی مسلمان اس کے مکلف ہیں، لیکن حضرت اسماعیل علیہ السلام اس کے اہتمام وانتظام میں امتیازی کوشش فرماتے تھے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ خصوصی ہدایت ملی تھی کہ: "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ" یعنی اپنے خاندان کے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرایئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعمیل میں اپنے خاندان کو جمع کرکے خصوصی خطاب فرمایا۔

دُوسری بات یہاں قابلِ غور یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب پوری قوم کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوتے ہیں اور وہ سبھی کو پیغامِ حق پہنچاتے اور اَمرِ اِلٰہی کا پابند کرتے ہیں، اہل وعیال کی خصوصیت میں کیا حکمت ہے؟ بات یہ ہے کہ دعوتِ پیغمبرانہ کے خاص اُصول ہیں، اُن میں یہ اہم بات ہے کہ جو ہدایت عام خلق اللہ کو دی جائے اُس کو پہلے اپنے گھر سے شروع کرے، اپنے گھر والوں کو اس کا ماننا اور منوانا نسبۃً آسان بھی ہوتا ہے، اُس کی نگرانی بھی ہر وقت کی جاسکتی ہے، اور وہ جب کسی خاص رنگ کو اِختیار کرلیں اور وہ اس میں پختہ ہوجاویں تو اس سے ایک دِینی ماحول پیدا ہوکر دعوت کو عام کرنے اور دُوسروں کی اصلاح کرنے میں بڑی قوّت پیدا ہوجاوے گی، اصلاحِ خلق کے لئے سب سے زیادہ مؤثر چیز ایک صحیح دِینی ماحول کا وجود میں لانا ہے، تجربہ شاہد ہے کہ ہر بھلائی یا بُرائی تعلیم وتعلّم اور اِفہام وتفہیم سے زیادہ ماحول کے ذریعے پھیلتی اور بڑھتی ہے۔

(معارف القرآن ج:٦ ص:٤٧)

تعلیم و تبلیغ میں اہلِ اسلام کی اوّلیت

ارشادِ ربانی

۱۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۙ﴿۱﴾ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ؕ﴿۲﴾ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۙ﴿۳﴾ اَوْ
يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ؕ﴿۴﴾ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ﴿۵﴾ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ؕ﴿۶﴾ وَمَا
عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ؕ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۙ﴿۸﴾ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ﴿۹﴾ فَاَنْتَ
عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ﴿۱۰﴾ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ﴿۱۱﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۘ﴿۱۲﴾ فِيْ صُحُفٍ
مُّكَرَّمَةٍ ۙ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ﴿۱۴﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۙ﴿۱۵﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ؕ﴿۱۶﴾
قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ؕ﴿۱۷﴾ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ؕ﴿۱۸﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ
فَقَدَّرَهٗ ۙ﴿۱۹﴾ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ۙ﴿۲۰﴾ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۙ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ
اَنْشَرَهٗ ؕ﴿۲۲﴾ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ؕ﴿۲۳﴾ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۙ﴿۲۴﴾ اَنَّا
صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۙ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۙ﴿۲۶﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۙ﴿۲۷﴾ وَّ
عِنَبًا وَّقَضْبًا ۙ﴿۲۸﴾ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۙ﴿۲۹﴾ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۙ﴿۳۰﴾ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۙ﴿۳۱﴾
مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ؕ﴿۳۲﴾ فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ۫﴿۳۳﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ
اَخِيْهِ ۙ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۙ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ؕ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ
يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ؕ﴿۳۷﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۙ﴿۳۸﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۚ﴿۳۹﴾
وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۙ﴿۴۰﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ؕ﴿۴۱﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ
الْفَجَرَةُ ؑ﴿۴۲﴾ (سورۂ عبس)

ترجمہ:- تیوری چڑھائی اور منہ موڑا، اس بات سے کہ آیا اس کے پاس اندھا، اور تجھ کو کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنورتا یا سوچتا تو کام آتا اس کے سمجھانا۔ وہ جو پروا نہیں کرتا سو تو اس کی فکر میں ہے، اور تجھ پر کچھ

اِلزام نہیں کہ وہ نہیں دُرست ہوتا۔ اور وہ جو آیا تیرے پاس دوڑتا اور وہ ڈرتا ہے سو تو اس سے تغافل کرتا ہے۔ یوں نہیں یہ تو نصیحت ہے، پھر جو کوئی چاہے اس کو پڑھے، لکھا ہے عزّت کے ورقوں میں، اُونچے رکھے ہوئے نہایت ستھرے، ہاتھوں میں لکھنے والوں کے، جو بڑے درجے والے نیک کار ہیں۔ مارا جائیو آدمی کیسا ناشکرا ہے، کس چیز سے بنایا ہے اس کو، ایک بوند سے بنایا اس کو پھر اندازے پر رکھا اس کو، پھر راہ آسان کر دی اس کو، پھر اس کو مُردہ کیا، پھر قبر میں رکھوا دیا اس کو، پھر جب چاہا اُٹھا نکالا اس کو۔ ہرگز نہیں، پورا نہ کیا جو اس کو فرمایا، اب دیکھ لے آدمی اپنے کھانے کو کہ ہم نے ڈالا پانی اُوپر سے گرتا ہوا، پھر چیرا زمین کو پھاڑ کر، پھر اُگایا اس میں اناج، اور انگور اور ترکاری، اور زیتون اور کھجوریں، اور گھن کے باغ، اور میوہ اور گھاس، کام چلانے کو تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے۔ پھر جب آئے وہ کان پھوڑنے والی، جس دن کہ بھاگے مرد اپنے بھائی سے، اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے، اور اپنی ساتھ والی سے اور اپنے بیٹوں سے، ہر مرد کو اُن میں سے اُس دن ایک فکر لگا ہوا ہے جو اس کے لئے کافی ہے۔ کتنے منہ اُس دن روشن ہیں، ہنستے خوشیاں کرتے، اور کتنے منہ اُس دن اُن پر گرد پڑی ہے، چڑھی آتی ہے اُن پر سیاہی، یہ لوگ وہی ہیں جو منکر ہیں ڈھیٹھ۔

خلاصۂ تفسیر

شانِ نزول

ان آیات کے نزول کا قصہ یہ ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض

رُؤسائے مشرکین کو سمجھا رہے تھے، بعض روایات میں ان میں سے بعض کے نام بھی آئے ہیں، ابوجہل بن ہشام، عتبہ بن ربیعہ، اُبیّ بن خلف، اُمیۃ بن خلف، شیبہ، کہ اتنے میں حضرت عبداللہ ابنِ اُمّ مکتوم نابینا صحابی حاضر ہوئے اور کچھ پوچھا، یہ قطع کلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف اِلتفات نہیں کیا، اور ناگواری کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم چیں بجبیں ہوئے، جب اس مجلس سے اُٹھ کر گھر جانے لگے تو آثار وحی کے نمودار ہوئے اور یہ آیتیں ''عَبَسَ وَتَوَلّٰی ...الخ'' نازل ہوئیں، اس کے بعد جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بڑی خاطر کرتے تھے۔ هٰذه الروایات کلّها فی الدر المنثور۔ غرض واقعہ مذکورہ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ: پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) چیں بجبیں ہوئے اور متوجہ نہ ہوئے اس بات سے کہ ان کے پاس اندھا آیا (یہاں تو غائب کے صیغے سے فرمایا اور یہ متکلم کے انتہائی لطف وکرم اور مخاطب کی تکریم ہے کہ رُو در رُو اس اَمر کی نسبت نہیں فرمائی) اور (آگے خطاب کا صیغہ بطور اِلتفات کے اس لئے اختیار کیا کہ شبہ اعراض کا نہ ہو، ارشاد ہوتا ہے کہ) آپ کو کیا خبر شاید وہ (نابینا آپ کی تعلیم سے پورے طور پر) سنوَر جاتا یا (کم سے کم کسی خاص اَمر میں) نصیحت قبول کرتا سو اس کو نصیحت کرنا (کچھ نہ کچھ) فائدہ پہنچاتا، تو جو شخص (دِین سے) بے پروائی کرتا ہے آپ اس کی تو فکر میں پڑتے ہیں، حالانکہ آپ پر کوئی اِلزام نہیں کہ وہ نہ سنورے (اُس کی بے پروائی ذکر کر کے اس کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ہدایت ہے) اور جو شخص آپ کے پاس (دِین کے شوق میں) دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ (خدا سے) ڈرتا ہے، آپ اس سے بے اعتنائی کرتے ہیں (ان آیات میں آپ کی اِجتہادی لغزش پر آپ کو مطلع کیا گیا ہے، منشاء اس اِجتہاد کا یہ تھا کہ یہ اَمر تو متیقن اور ثابت ہے کہ اہم کام کو مقدّم کرنا چاہئے، آپ نے کفر کی اَشدیت کو موجبِ اہمیت سمجھا، جیسے دو بیمار ہوں، ایک کو ہیضہ ہے اور دُوسرے کو زکام، تو ہیضے کے مریض کا علاج مقدّم ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ مرض کی شدّت اُس وقت موجبِ اہمیت ہے جب دونوں مریض طالبِ علاج ہوں، لیکن اگر مرضِ شدید

والا علاج کا طالب ہی نہیں بلکہ مخالف ہو تو پھر مقدم وہ ہوگا جو طالب علاج ہے، اگر چہ مرض اس کا خفیف ہو، آگے ان مشرکین کی طرف اس قدر توجہ ضروری نہ ہونے کو ارشاد فرماتے ہیں کہ آپ آئندہ) ہرگز ایسا نہ کیجئے (کیونکہ) قرآن (محض ایک) نصیحت کی چیز ہے (اور آپ کے ذمہ صرف اس کی تبلیغ ہے) سو جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے (اور جو قبول نہ کرے وہ جانے، آپ کا کوئی ضرر نہیں، پھر آپ اس قدر اہتمام کیوں فرماتے ہیں، آگے قرآن کے اوصاف بیان فرماتے ہیں کہ) وہ (قرآن لوحِ محفوظ کے) ایسے صحیفوں میں (ثبت) ہے جو (عنداللہ) مکرّم ہیں (یعنی پسندیدہ ومقبول ہیں، اور) رفیع المکان ہیں (کیونکہ لوحِ محفوظ تحت العرش ہے کما فی الدر المنثور، سورۃ البروج، اور وہ) مقدس ہیں (شاطینِ خبیثہ کی وہاں تک رسائی نہیں، کقولہ تعالیٰ: "لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ") جو ایسے لکھنے والوں (یعنی فرشتوں) کے ہاتھوں میں (رہتے) ہیں کہ وہ مکرّم (اور) نیک ہیں (یہ سب صفات اس کے من جانب اللہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں، جیسا کہ سورۂ واقعہ کی آیت "لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ" میں بیان ہوا ہے اور لوحِ محفوظ ہر چند کہ شیٔ واحد ہے مگر اس کے اجزاء کو صحف سے تعبیر فرمایا، اور ان فرشتوں کو کاتب اس لئے کہا کہ یہ لوحِ محفوظ سے بامرِ الٰہی نقل کرنے والے ہیں، حاصل آیات کا یہ ہوا کہ قرآن من جانب اللہ نصیحت کے لئے ہے، آپ نصیحت کر کے اپنے فرض سے فارغ ہو جاویں گے خواہ کوئی ایمان لاوے یا نہ لاوے، پس اس قسم کی تقدیم وتاخیر کی کوئی ضرورت نہیں، یہاں تک آدابِ تذکیر وتبلیغ کے ہوئے، آگے کفار کے اُس سے فائدہ نہ اُٹھانے پر تشنیع ہے کہ منکر) آدمی پر (جو ایسے تذکرے سے نصیحت حاصل نہ کرے جیسے ابوجہل وغیرہ جن کو آپ سمجھاتے تھے اور وہ نہیں سمجھے تو ایسے شخص پر) خدا کی مار کہ وہ کیسا ناشکرا ہے (وہ دیکھتا نہیں کہ) اللہ تعالیٰ نے اس کو کیسی (حقیر) چیز سے پیدا کیا (آگے جواب ہے کہ) نطفے سے (پیدا کیا، آگے اس کی کیفیت مذکور ہے کہ بہت سے انقلابات اور تغیرات کے بعد) اس کی صورت بنائی پھر اس (کے اعضاء) کو اندازے سے بنایا (جیسا کہ سورۃ القیامۃ کی آیت: "فَخَلَقَ فَسَوّٰى" میں

گزر چکا ہے) پھر اس کا (نکلنے کا) راستہ آسان کر دیا (چنانچہ ظاہر ہے کہ ایسے تنگ موقع سے اچھے خاصے تنومند بچے کا صحیح سالم نکل آنا صاف دلیل ہے اللہ کے قادر اور عبد کے مقدور ہونے کی) پھر (بعد عمر ختم ہونے کے) اس کو موت دی، پھر اس کو قبر میں لے گیا (خواہ اوّل سے خاک میں رکھ دیا جائے یا بعد چندے خاک میں مل جائے) پھر جب اللہ چاہے گا اس کو دوبارہ زندہ کر دے گا (مطلب یہ کہ سب تصرفات دلیل ہیں انسان کے داخلِ قدرتِ الٰہیہ ہونے کی اور نعمت بھی ہیں، بعضے حسی معنوی جس کا مقتضیٰ تھا وجوبِ طاعت و ایمان مگر اس نے) ہرگز (شکر) نہیں (ادا کیا اور) اس کو جو حکم کیا تھا اس کو بجا نہیں لایا، سو انسان کو چاہئے کہ (اپنی تخلیق کے ابتدائی حالات پر نظر کرنے کے بعد اسبابِ بقا و تعیش پر نظر کرے مثلاً) اپنے کھانے کی طرف نظر کرے (تا کہ وہ باعث ہو حق شناسی اور اطاعت و ایمان کا، اور آگے نظر کرنے کا طریقہ بتاتے ہیں وہ یہ) کہ ہم نے عجیب طور پر پانی برسایا، پھر عجیب طور پر زمین کو پھاڑا، پھر ہم نے اس میں غلہ اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجور اور گنجان باغ اور میوے اور چارہ پیدا کیا (بعضی چیزیں) تمہارے اور (بعضی چیزیں) تمہارے مواشی کے فائدے کے لئے ہیں (اور یہ سب بھی نعمت اور دلیلِ قدرت ہیں، اور اس مجموع میں ہر جزو مقتضی ہے وجوبِ شکر ایمان کو، یہاں تک تشنیع ہوگئی نصیحت قبول نہ کرنے پر، آگے عدمِ تذکر پر سزا اور تذکر پر ثوابِ آخرت مذکور ہے، یعنی اب تو یہ لوگ ناشکری اور کفر کرتے ہیں) پھر جس وقت کانوں کا بہرا کر دینے والا شور برپا ہوگا (یعنی قیامت اُس وقت ساری ناشکری کا مزا معلوم ہو جائے گا، آگے اس دن کا بیان ہے کہ) جس روز (ایسا) آدمی (جس کا اُوپر بیان ہوا) اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا (یعنی کوئی کسی کی ہمدردی نہ کرے گا، کقولہ تعالیٰ: "لَا یَسْئَلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا" وجہ یہ کہ) ان میں ہر شخص کو (اپنا ہی) ایسا مشغلہ ہوگا جو اس کو اور طرف متوجہ نہ ہونے دے گا (یہ تو کفار کا حال ہوگا، آگے مجموعۂ مؤمنین اور کفار کی تفصیل ہے کہ) بہت سے چہرے اس روز (ایمان کی وجہ سے) روشن (اور مسرّت سے) خنداں اور شاداں ہوں

گے اور بہت سے چہروں پر اس روز (کفر کی وجہ سے) ظلمت ہوگی (اور اس ظلمت کے ساتھ) ان پر (غم کی) کدورت چھائی ہوگی، یہی لوگ کافر و فاجر ہیں (کافر سے اشارہ ہے فسادِ عقائد کی طرف اور فاجر سے فسادِ اعمال کی طرف)۔

معارف و مسائل

شانِ نزول میں جو واقعہ حضرت عبداللہ ابنِ اُمِّ مکتوم نابینا صحابی رضی اللہ عنہ کا نقل کیا ہے، اس میں بغوی نے یہ مزید روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو نابینا ہونے کے سبب یہ تو معلوم نہیں ہوسکا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی دُوسرے سے گفتگو میں مشغول ہیں، مجلس میں داخل ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز دینی شروع کی اور بار بار آواز دی (مظہری)۔ اور ابنِ کثیر کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اُنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آیتِ قرآن پڑھوانے کا سوال کیا اور اس سوال کے فوری جواب دینے پر اِصرار کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مکہ کے کفار سرداروں کو دِین کی تبلیغ کرنے اور سمجھانے میں مصروف تھے، یہ سردار عتبہ بن ربیعہ، ابوجہل ابنِ ہشام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ تھے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس موقع پر عبداللہ ابنِ اُمِّ مکتومؓ کا اس طرح خطاب کرنا اور ایک آیت کے الفاظ دُرست کرنے کے معمولی سوال پر فوری جواب کے لئے اصرار کرنا ناگوار ہوا، جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عبداللہ ابنِ اُمِّ مکتومؓ پکے مسلمان اور ہر وقت کے حاضر باش تھے، دُوسرے اوقات میں بھی سوال کرسکتے تھے، ان کے جواب کے مؤخر کرنے میں کسی دِینی نقصان کا خطرہ نہ تھا، بخلاف رُؤسائے قریش کے کہ نہ یہ لوگ ہر وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے ہیں اور نہ ہر وقت اُن کو اللہ کا کلمہ پہنچایا جاسکتا ہے، اس وقت یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سن رہے تھے جس سے ان کے ایمان لانے کی توقع کی جاسکتی تھی اور ان کی بات کاٹ دی جاتی تو اِیمان ہی سے محرومی ان کی ظاہر تھی۔ ان

مجموعۂ حالات کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابنِ اُمِّ مکتومؓ سے رُخ پھیر کر اپنی ناگواری کا اظہار فرمایا اور جو گفتگو تبلیغِ حق کی رُؤسائے قریش کے ساتھ جاری تھی اُس کو جاری رکھا، اس پر مجلس سے فارغ ہونے کے وقت سورۂ عبس کی آیاتِ مذکورہ نازل ہوئیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل کو ناپسندیدہ قرار دے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طرزِ عمل اپنے اِجتہاد پر مبنی تھا کہ جو مسلمان آدابِ مجلس کے خلاف طرزِ گفتگو اِختیار کرے اس کو کچھ تنبیہ ہونی چاہئے تاکہ آئندہ وہ آدابِ مجلس کی رعایت کرے، اس کے لئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابنِ اُمِّ مکتومؓ سے رُخ پھیرلیا، اور دُوسری بات یہ تھی کہ بظاہرِ حال کفر وشرک سب سے بڑے گناہ ہیں، ان کے ازالے کی فکر مقدّم ہونا چاہئے، بمقابلہ دِین کے فروعی اَحکام کی تعلیم کے جو عبداللہ ابنِ اُمِّ مکتومؓ چاہتے تھے، مگر حق تعالیٰ جل شانہٗ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اِجتہاد کو دُرست قرار نہیں دیا اور اس پر متنبہ فرمایا کہ یہاں قابلِ غور یہ بات تھی کہ ایک شخص جو آپ سے دِینی تعلیم کا طالب ہو کر سوال کر رہا ہے، اس کے جواب کا فائدہ تو یقینی ہے، اور جو آپ کا مخالف ہے، آپ کی بات سننا بھی پسند نہیں کرتا، اُس سے گفتگو کا فائدہ موہوم ہے، موہوم کو یقینی پر ترجیح نہ ہونا چاہئے، اور عبداللہ ابنِ اُمِّ مکتومؓ سے جو آدابِ مجلس کے خلاف بات سرزد ہوئی اُن کا عذر قرآن نے لفظ ''اَعْمٰی'' کہہ کر بتلا دیا کہ وہ نابینا تھے اس لئے اس کو نہ دیکھ سکتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت کس شغل میں ہیں؟ کن لوگوں سے گفتگو چل رہی ہے؟ اس لئے وہ معذور تھے، مستحقِ اِعراض نہیں تھے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی معذور آدمی سے بے خبری میں کوئی بات آدابِ مجلس کے خلاف ہو جائے تو وہ قابلِ عتاب نہیں ہوتا۔

اس موقع میں یہ تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو کام بیک

وقت آ گئے، ایک مسلمان کو تعلیم اور اُس کی تکمیل اور دِلجوئی، دُوسرے غیر مسلموں کی ہدایت کے لئے اُن کی طرف توجہ، قرآنِ کریم کے اس ارشاد نے یہ واضح کردیا کہ پہلا کام دُوسرے کام پر مقدّم ہے، دُوسرے کام کی وجہ سے پہلے کام میں تاخیر کرنا یا کوئی خلل ڈالنا دُرست نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی تعلیم اور اُن کی اصلاح کی فکر غیر مسلموں کو اِسلام میں داخل کرنے کی فکر سے اہم اور مقدّم ہے۔

اس میں اُن علماء کے لئے ایک اہم ہدایت ہے جو غیر مسلموں کے شبہات کے اِزالے اور ان کو اِسلام سے مانوس کرنے کی خاطر بعض ایسے کام کر بیٹھتے ہیں جن سے عام مسلمانوں کے دِلوں میں شکوک و شبہات یا شکایات پیدا ہوجاتی ہیں، اُن کو اس قرآنی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کی حفاظت اور اصلاحِ حال کو مقدّم رکھنا چاہئے، اکبر مرحوم نے خوب فرمایا۔

بے وفا سمجھیں تمہیں اہلِ حرم اس سے بچو
دَیر والے کج ادا کہہ دیں یہ بدنامی بھلی

(معارف القرآن ج:۸ ص:۶۷۲)

ارشادِ ربانی

۲- وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۭ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ (الانعام)

ترجمہ:- اور مت دُور کر ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے رَبّ کو صبح اور شام، چاہتے ہیں اس کی رضا، تجھ پر نہیں ہے ان کے حساب میں سے کچھ اور نہ تیرے حساب میں سے ان پر ہے کچھ کہ تو ان کو دُور

کرنے لگے، پس ہوجاوے گا تو بے انصافوں میں۔ اور اسی طرح
ہم نے آزمایا ہے بعضے لوگوں کو بعضوں سے تاکہ کہیں کیا یہی لوگ
ہیں جن پر اللہ نے فضل کیا ہم سب میں، کیا نہیں ہے اللہ خوب
جاننے والا شکر کرنے والوں کو۔

خلاصۂ تفسیر

اور ان لوگوں کو (اپنی مجلس سے) نہ نکالئے جو صبح و شام (یعنی علی الدوام بدوام مناسب) اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں جس سے صرف اللہ کی رضا ہی کا قصد رکھتے ہیں (اور کوئی غرض جاہ و مال کی نہیں، یعنی ان کی عبادت میں مداومت بھی ہے اور اِخلاص بھی، اور اِخلاص اگرچہ اَمرِ باطنی ہے مگر آثار و علامات سے پہچانا بھی جاسکتا ہے، اور جب تک عدمِ اِخلاص کی کوئی دلیل نہیں، اِخلاص ہی کا گمان رکھنا چاہئے) اور ان (کے باطن) کا حساب (اور تفتیش) ذرا بھی آپ کے ذمہ نہیں اور (یہ اُن کے باطن کی تفتیش کا آپ سے متعلق نہ ہونا ایسا یقینی ہے جیسا کہ) آپ (کے باطن) کا حساب (اور تفتیش) ذرا بھی ان کے متعلق نہیں کہ آپ ان کو نکال دیں (یعنی اگر ان کے باطنی اِخلاص کی تفتیش آپ کے ذمہ ہوتی تو اس کی گنجائش تھی کہ جن کے اِخلاص کی تحقیق نہ ہوجائے ان کو الگ کردیں، مگر وہ آپ کے ذمہ نہیں، اور دُوسری کوئی وجہ اُن کو نکالنے کے جواز کی موجود نہیں، اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کے مربی ہیں، اور مربی کے لئے اپنے ماتحتوں کے اَحوال کی تفتیش کرنے کا احتمال ہوسکتا تھا، مگر اس کا عکس کہ وہ لوگ اپنے پیغمبر کے باطنی احوال کی تفتیش کریں، اس کا کوئی احتمال ہی نہیں اس لئے وہ قطعاً منفی ہے، اس جگہ محتمل کو متیقن کے ساتھ برابر قرار دے کر اس کی نفی کی گئی تاکہ اس کا منفی ہونا بھی یقینی ہوجاوے) ورنہ (ان کے نکالنے سے) آپ نامناسب کام کرنے والوں میں ہوجاویں گے اور (ہم نے جو

مؤمنوں کو غریب، کافروں کو رئیس بنا رکھا ہے جو بظاہر مقتضائے قیاس سے بعید ہے) تو (اس کی وجہ یہ ہے کہ) اسی طور پر ہم نے (ان میں سے) ایک (یعنی کفار) کو دُوسروں (یعنی مؤمنوں) کے ذریعے آزمائش میں ڈال رکھا ہے (یعنی اس طرزِ عمل میں امتحان ہے کفار کا) تاکہ یہ لوگ (مؤمنوں کے متعلق) کہا کریں کہ کیا یہی لوگ ہیں کہ ہم سب میں سے (انتخاب کر کے) ان پر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل کیا ہے (یعنی اپنے دِینِ اسلام کے لئے ان کو منتخب کیا ہے) کیا یہ بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ حق شناسوں کو خوب جانتا ہے۔

چند اَحکام و ہدایات

آیاتِ مذکورہ سے چند اَحکام و ہدایات مستفاد ہوئیں:-

اوّل یہ کہ کسی کے پھٹے کپڑے یا ظاہری خستہ حالی دیکھ کر اس کو حقیر و ذلیل سمجھنے کا کسی کو حق نہیں، بسا اوقات ایسے لباس میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اللہ کے نزدیک نہایت معزّز و مقبول ہیں، ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: بہت سے شکستہ حال، غبار آلود لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ اللہ کے مقبول ہیں، اگر کسی کام کے لئے قسم کھا بیٹھیں کہ ایسا ہوگا تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو ضرور پورا فرماتے ہیں۔

دُوسرے یہ کہ شرافت و رذالت کا معیار محض دُنیا کی دولت و ثروت کو سمجھنا انسانیت کی توہین ہے، اس کا اصل مدار اَخلاق و اَعمالِ صالحہ پر ہے۔

تیسرے یہ کہ کسی قوم کے مصلح اور مبلغ کے لئے اگرچہ تبلیغِ عام بھی ضروری ہے، جس میں موافق، مخالف، ماننے والے اور نہ ماننے والے سب مخاطب ہوں، لیکن ان لوگوں کا حق مقدّم ہے جو اس کی تعلیمات کو اَپنا کر اس پر چل رہے ہوں، دُوسروں کی خاطر ان کو مؤخر کرنا یا نظر انداز کرنا جائز نہیں، مثلاً غیر مسلموں کی تبلیغ کے لئے ناواقف مسلمانوں کی تعلیم و اصلاح کو مؤخر نہیں کرنا چاہئے۔

چوتھے یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اِنعامات بقدرِ شکر گزاری بڑھتے ہیں، جو شخص اِنعاماتِ

الٰہیہ کی زیادتی کا طالب ہے، اس پر لازم ہے کہ قول وعمل سے شکرگزاری کو اپنا شعار بنالے۔ (معارف القرآن ج:۳ ص:۳۲۹)

علانیہ دعوت

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کی ابتدا سری طریقے پر فرمائی، اس کی وجہ یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں مشرکین کے عقائد باطلہ کی کھلم کھلا تردید تھی، تو ان کی ایذا رسانی کے سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کو سری رکھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں آپ کی حفاظت کی ذمہ داری خود لے لی اور حکم دیا کہ اب کفار کو کھلم کھلا اسلام کی طرف بلایئے، لہٰذا اس حکم کی تعمیل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علانیہ دعوت کا آغاز فرمایا۔''

ارشادِ ربانی

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٩٤﴾ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿٩٥﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿٩٧﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿٩٨﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿٩٩﴾ (الحجر)

ترجمہ:-سو سنادے کھول کر جو تجھ کو حکم ہوا اور پروانہ کر مشرکوں کی، ہم بس ہیں تیری طرف سے ٹھٹھے کرنے والوں کو، جو کہ ٹھہراتے ہیں اللہ کے ساتھ دُوسرے کی بندگی، سو عنقریب معلوم کرلیں گے، اور ہم جانتے ہیں کہ تیرا جی رُکتا ہے ان کی باتوں سے، سو تو یاد کر خوبیاں اپنے رَبّ کی اور ہو سجدہ کرنے والوں سے اور بندگی کیے جا اپنے رَبّ کی جب تک آئے تیرے پاس یقینی بات۔

خلاصۂ تفسیر

غرض (حاصلِ کلام یہ کہ) آپ کو جس بات (کے پہنچانے) کا حکم کیا گیا ہے اس کو (تو) صاف صاف سنادیجئے اور (اگر یہ نہ مانیں تو) ان مشرکوں (کے نہ ماننے) کی (مطلق) پروانہ کیجئے (یعنی غم نہ کیجئے، جیسا اُوپر آیا ہے "لَا تَحْزَنْ" اور نہ طبعی طور پر خوف کیجئے کہ یہ مخالف بہت سے ہیں کیونکہ) یہ لوگ جو (آپ کے اور خدا کے مخالف ہیں، چنانچہ آپ پر تو) ہنستے ہیں (اور) اللہ تعالیٰ کے ساتھ دُوسرا معبود قرار دیتے ہیں ان (کے شر وایذاء) سے آپ (کو محفوظ رکھنے) کے لئے (اور ان سے بدلہ لینے کے لئے) ہم کافی ہیں، سو ان کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے (کہ اِستہزاء اور شرک کا کیا انجام ہوتا ہے، غرض جب ہم کافی ہیں پھر کاہے کا خوف ہے) اور واقعی ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جو (کفر واِستہزاء کی) باتیں کرتے ہیں اس سے آپ تنگ دِل ہوتے ہیں (کہ یہ طبعی بات ہے) سو (اس کا علاج یہ ہے کہ) آپ اپنے پروردگار کی تسبیح وتحمید کرتے رہئے اور نمازیں پڑھنے والوں میں رہئے، اور اپنے رَبّ کی عبادت کرتے رہئے یہاں تک کہ (اسی حالت میں) آپ کو موت آجائے (یعنی مرتے دَم تک ذکر وعبادت میں مشغول رہئے، کیونکہ ذکر اللہ اور عبادت میں آخرت کے اَجر وثواب کے علاوہ یہ خاصیت بھی ہے کہ دُنیا میں جب انسان اس طرف لگ جاتا ہے تو دُنیا کے رنج وغم اور تکلیف ومصیبت ہلکی ہوجاتی ہے)۔

تبلیغ واِرشاد میں تدریج بقدرِ اِستطاعت

"فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ چھپ چھپ کر عبادت اور تلاوت کرتے تھے، اور تبلیغ واِرشاد کا سلسلہ بھی خفیہ ہی ایک ایک، دو دو فرد کے ساتھ جاری تھا، کیونکہ اظہار واعلان میں کفار کی اِیذا رسانی کا خطرہ تھا، اس آیت میں حق تعالیٰ نے اِستہزاء کرنے والے اور اِیذا دینے والے کفار کی

ایذا سے محفوظ رکھنے کی خود ذمہ داری لے لی، اس لئے اس وقت بے فکری کے ساتھ اعلان واِظہار کے ذریعے تلاوت وعبادت اور تبلیغ ودعوت کا سلسلہ شروع ہوا۔

"اِنَّا کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَھْزِءِیْنَ" میں جن لوگوں کا ذکر ہے، ان کے لیڈر پانچ آدمی تھے، عاص بن وائل، اَسود بن المطلب، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، حارث بن طلاطلہ، یہ پانچوں معجزانہ طور پر ایک ہی وقت میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے اشارے سے ہلاک کردیئے گئے، اس واقعے سے تبلیغ ودعوت کے معاملے میں یہ حاصل ہوا کہ اگر اِنسان کسی ایسے مقام یا ایسے حال میں مبتلا ہوجائے کہ وہاں حق بات کو علی الاعلان کہنے سے اُن لوگوں کو تو کوئی فائدہ پہنچنے کی توقع نہ ہو اور اپنے آپ کو نقصان وتکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو تو ایسی حالت میں یہ کام خفیہ طور پر کرنا بھی دُرست اور جائز ہے، البتہ جب اِظہار واعلان کی قدرت ہوجائے تو پھر اِعلان میں کوتاہی نہ کی جائے۔

دُشمنوں کی اِیذا سے تنگ دِلی کا علاج

"وَلَقَدْ نَعْلَمُ...الیٰ ... فَسَبِّحْ" سے معلوم ہوا کہ جب انسان کو دُشمنوں کی باتوں سے رنج پہنچے اور دِل تنگی پیش آئے تو اس کا رُوحانی علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح وعبادت میں مشغول ہوجائے، اللہ تعالیٰ خود اس کی تکلیف کو دُور فرمادیں گے۔

(معارف القرآن ج:۵ ص:۲۹۹)

***

چوتھا باب

اَسالیبِ دعوت

۱- حکمت، مناسب وقت کا انتخاب

ارشادِ ربانی

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا ۚ
ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي ۚ إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ
بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿٣٧﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ
وَيَعْقُوبَ ۚ مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ
عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٣٨﴾ يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ
أَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٣٩﴾　　(سورۂ یوسف)

ترجمہ:- بولا نہ آنے پائے گا تم کو کھانا جو ہر روز تم کو ملتا ہے مگر بتا چکوں گا تم کو اس کی تعبیر اس کے آنے سے پہلے، یہ علم ہے کہ مجھ کو سکھایا میرے رَبّ نے، میں نے چھوڑا دِین اس قوم کا کہ ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور آخرت سے وہ لوگ منکر ہیں، اور پکڑا میں نے دِین اپنے باپ دادوں کا ابراہیم اور اِسحاق اور یعقوب کا، ہمارا کام نہیں کہ شریک کریں اللہ کا کسی چیز کو، یہ فضل ہے اللہ کا ہم پر اور سب لوگوں پر لیکن بہت لوگ احسان نہیں مانتے۔ اے رفیقو قید خانے کے! بھلا کئی معبود جدا جدا بہتر یا اللہ اکیلا زبردست۔

خلاصۂ تفسیر

فرمایا کہ (دیکھو) جو کھانا تمہارے پاس آتا ہے جو کہ تم کو کھانے کے لئے (جیل خانے میں) ملتا ہے میں اس کے آنے سے پہلے اس کی حقیقت تم کو بتلا دیا کرتا ہوں (کہ فلاں چیز آوے گی اور ایسی ایسی ہوگی اور) یہ بتلا دینا اس علم کی بدولت ہے جو مجھ کو میرے رَبّ نے تعلیم فرمایا ہے (یعنی مجھ کو وحی سے معلوم ہو جاتا ہے، تو یہ ایک معجزہ ہے جو دلیلِ نبوّت ہے اور اس وقت یہ معجزہ خاص طور پر اس لئے مناسب تھا کہ جس واقعے میں قیدیوں نے تعبیر کے لئے ان کی طرف رُجوع کیا، وہ واقعہ بھی کھانے ہی سے متعلق تھا، اِثباتِ نبوّت کے بعد آگے اِثباتِ توحید کا مضمون بیان فرمایا کہ) میں نے ان لوگوں کا مذہب (پہلے ہی سے) چھوڑ رکھا ہے جو اللہ پر اِیمان نہیں لائے اور وہ لوگ آخرت کے بھی منکر ہیں، اور میں نے اپنے ان (بزرگوار) باپ دادوں کا مذہب اختیار کر رکھا ہے ابراہیم کا اور اِسحاق کا اور یعقوب کا (علیہم السلام، اور اس مذہب کا رُکنِ اعظم یہ ہے کہ) ہم کو کسی طرح زیبا نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریکِ (عبادت) قرار دیں، یہ (عقیدۂ توحید) ہم پر اور (دُوسرے) لوگوں پر (بھی) خدا تعالیٰ کا ایک فضل ہے (کہ اس کی بدولت دُنیا و آخرت کی فلاح ہے) لیکن اکثر لوگ (اس نعمت کا) شکر (ادا) نہیں کرتے (یعنی توحید کو اِختیار نہیں کرتے) اے قید خانے کے رفیقو! (ذرا سوچ کر بتلاؤ کہ عبادت کے واسطے) متفرق معبود اچھے ہیں یا ایک معبودِ برحق جو سب سے زبردست ہے وہ اچھا۔

معارف ومسائل

حضرت یوسف علیہ السلام سے خوابوں کی تعبیر دریافت کی جاتی ہے، مگر وہ پیغمبرانہ انداز پر اس سوال کے جواب سے پہلے تبلیغ و دعوتِ ایمان کا کام شروع فرماتے ہیں، اور اُصولِ دعوت کے ماتحت حکمت و دانش مندی سے کام لے کر سب سے پہلے ان لوگوں

کے قلوب میں اپنا اعتماد پیدا کرنے کے لئے اپنے اس معجزے کا ذکر کیا کہ تمہارے لئے جو کھانا تمہارے گھروں سے یا کسی دُوسری جگہ سے آتا ہے اس کے آنے سے پہلے ہی میں تمہیں بتلا دیتا ہوں کہ کس قسم کا کھانا اور کیسا اور کتنا اور کس وقت آئے گا، اور وہ ٹھیک اسی طرح نکلتا ہے۔ (معارف القرآن ج:۵ ص:۵۶)

تردیدِ باطل کا حکیمانہ انداز

"اس باب کی ابتدا میں یہ بات گزر چکی ہے کہ داعی کو موقع محل کی مناسبت سے کلام کرنا چاہئے، نرمی کی جگہ نرمی اور سختی کی جگہ سختی سے کام لینا چاہئے، اور اَنداز ایسا اختیار کرنا چاہئے جس سے مخاطب کا دِل قبولیتِ حق کے لئے نرم ہوجائے، چنانچہ حضرت اِبراہیم علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی تو جو اُسلوب اِختیار فرمایا اس نے اس اُصول کی وضاحت کھل کر سامنے آجاتی ہے، مندرجہ ذیل آیات دعوتِ ابراہیمی کے انداز کو واضح کرتی ہیں۔"

ارشادِ ربانی

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿۷۶﴾ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ﴿۷۷﴾ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۷۹﴾ (الانعام)

ترجمہ:- پھر جب اندھیرا کرلیا اس پر رات نے، دیکھا اس نے ایک ستارہ بولا یہ ہے رَبّ میرا، پھر جب وہ غائب ہوگیا تو بولا میں پسند

نہیں کرتا غائب ہو جانے والوں کو۔ پھر جب دیکھا چاند چمکتا ہوا بولا یہ ہے رَبّ میرا، پھر جب وہ غائب ہو گیا بولا اگر نہ ہدایت کرے گا مجھ کو رَبّ میرا تو بے شک میں رہوں گا گمراہ لوگوں میں۔ پھر جب دیکھا سورج جھلکتا ہوا بولا یہ ہے رَبّ میرا یہ سب سے بڑا ہے، پھر جب وہ غائب ہو گیا بولا اے میری قوم! میں بیزار ہوں ان سے جن کو تم شریک کرتے ہو، میں نے متوجہ کرلیا اپنے منہ کو اسی کی طرف جس نے بنائے آسمان اور زمین، سب سے یکسو ہو کر، اور میں نہیں ہوں شرک کرنے والا۔

خلاصۂ تفسیر

پھر (اسی دن یا کسی اور دن) جب رات کی تاریکی ان پر (اسی طرح اور سب پر) چھا گئی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا (کہ چمک رہا ہے) آپ نے (اپنی قوم سے مخاطب ہو کر) فرمایا کہ (تمہارے خیال کے موافق) یہ میرا (اور تمہارا) رَبّ (اور میرے اَحوال میں متصرف) ہے (بہت اچھا، اب تھوڑی دیر میں حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے، چنانچہ تھوڑے عرصے کے بعد وہ اُفق میں جا چھپا) سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا (اور محبت لوازمِ اِعتقادِ رُبوبیت سے ہے، پس حاصل یہ ہوا کہ میں رَبّ نہیں سمجھتا) پھر (اسی شب میں یا کسی دُوسری شب میں) جب چاند کو دیکھا (کہ) چمکتا ہوا (نکلا ہے) تو (پہلے ہی کی طرح) فرمایا کہ (تمہارے خیال کے موافق) یہ میرا (اور تمہارا) رَبّ (اور متصرف فی الاحوال) ہے (بہتر، اب تھوڑی دیر میں اس کی کیفیت بھی دیکھنا، چنانچہ وہ بھی غروب ہو گیا) سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ: اگر مجھ کو میرا رَبّ (حقیقی) ہدایت نہ کرتا رہے (جیسا اب تک ہدایت کرتا رہتا ہے) تو میں بھی (تمہاری طرح) گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاؤں۔ پھر (یعنی اگر چاند کا

قصہ اسی قصہ کوکب کی شب کا تھا تب تو اسی شب کی صبح کو، اور اگر چاند کا قصہ اسی قصہ کوکب کی شب کا نہ تھا تو قصۂ قمر کی شب کی صبح کو یا اس کے علاوہ کسی اور شب کی صبح کو) جب آفتاب دیکھا (کہ بڑی آب وتاب سے) چمکتا ہوا (نکلا ہے) تو (پہلی دوبار کی طرح پھر) فرمایا کہ (تمہارے خیال کے موافق) یہ میرا (اور تمہارا) رَبّ (اور متصرف فی الاحوال) ہے (اور) یہ تو سب (مذکورہ ستاروں) میں بڑا ہے (اس پر خاتمہ کلام کا ہو جاوے گا، اگر اس کی رُبوبیت باطل ہوگئی تو چھوٹوں کی بدرجۂ اَوْلیٰ باطل ہو جاوے گی، غرض شام ہوئی تو وہ بھی غروب ہوگیا) سو جب وہ غروب ہوگیا تو آپ نے فرمایا کہ بے شک میں تمہارے شرک سے بیزار (اور نفور) ہوں (یعنی براءت ظاہر کرتا ہوں، اعتقاداً تو ہمیشہ سے بیزار ہی تھے) میں (سب طریقوں سے) یک سو ہو کر اپنا رُخ (ظاہر کا اور دِل کا) اس (ذات) کی طرف (کرنا تم سے ظاہر) کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور میں (تمہاری طرح) شرک کرنے والوں سے نہیں ہوں (نہ اِعتقاداً، نہ قولاً، نہ عملاً)۔

تبلیغ ودعوت میں حکمت وتدبیر سے کام لینا سنتِ انبیاء ہے

"فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ" یعنی ایک رات میں جب تاریکی چھا گئی اور ایک کوکب یعنی ستارے پر نظر پڑی تو اپنی قوم کو سنا کر کہا کہ یہ ستارہ میرا رَبّ ہے، مطلب یہ تھا کہ تمہارے خیالات وعقائد کی رُو سے یہی میرا اور تمہارا رَبّ یعنی پالنے والا ہے، اب تھوڑی دیر میں اس کی حقیقت دیکھ لینا، چنانچہ کچھ دیر کے بعد وہ غروب ہوگیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قوم پر حجت قائم کرنے کا واضح موقع ہاتھ آیا، اور فرمایا: "لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ" اٰفِلِيْنَ کا یہ لفظ "اُفُوْلٌ" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں غروب ہونا۔

مطلب یہ ہے کہ میں غروب ہو جانے والی چیزوں سے محبت نہیں رکھتا، اور جس کو خدا یا معبود بنایا جائے، ظاہر ہے کہ وہ سب سے زیادہ محبت وعظمت کا مستحق ہونا چاہئے۔

مولانا رُومی رحمہ اللہ علیہ نے ایک شعر میں اسی واقعے کو بیان فرمایا ہے ؎

خلیل آسا درِ ملکِ یقیں زن
نوائے لا اُحِبُّ الآفِلِین زن

اس کے بعد پھر کسی دُوسری رات میں چاند چمکتا ہوا نظر آیا تو پھر اپنی قوم کو سنا کر وہی طریقہ اختیار فرمایا اور کہا کہ (تمہارے عقائد کے مطابق) یہ میرا رَبّ ہے، مگر اس کی حقیقت بھی کچھ دیر کے بعد سامنے آجائے گی، چنانچہ جب چاند غروب ہوگیا تو فرمایا: اگر میرا رَبّ مجھے ہدایت نہ کرتا رہتا تو میں بھی تمہاری طرح گمراہوں میں داخل ہوجاتا، اور چاند ہی کو اپنا رَبّ اور معبود سمجھ بیٹھتا، لیکن اس کے طلوع وغروب کے بدلنے والے حالات نے مجھے متنبہ کردیا کہ یہ ستارہ بھی قابلِ عبادت نہیں۔

اس آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ کردیا کہ میرا رَبّ کوئی دُوسری شے ہے، جس کی طرف سے مجھے ہدایت ہوتی رہتی ہے۔

اس کے بعد ایک روز آفتاب کو نکلتے ہوئے دیکھا تو پھر قوم کو سنا کر اُسی طریقے پر فرمایا کہ (تمہارے خیال کے مطابق) یہ میرا رَبّ ہے، اور یہ تو سب سے بڑا ہے، مگر اس بڑے کی حقیقت و حیثیت بھی عنقریب تمہارے سامنے آجائے گی، چنانچہ آفتاب بھی اپنے وقت پر غروب ہوگیا، تو قوم پر آخری حجت تمام کرنے کے بعد اب اصل حقیقت کو واضح طور پر بیان فرمادیا کہ: "یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ" یعنی اے میری قوم! میں تمہارے ان مشرکانہ خیالات سے بیزار ہوں کہ تم نے خدا تعالیٰ کی مخلوقات کو ہی خدائی کا شریک بنا رکھا ہے۔

اس کے بعد اس حقیقت کو بتلادیا کہ میرا اور تمہارا رَبّ (پالنے والا) ان تمام مخلوقات میں سے کوئی نہیں ہوسکتا، جو خود اپنے وجود میں دُوسرے کی محتاج ہیں، اور ہر وقت، ہر آن عروج و نزول اور طلوع و غروب کے تغیرات میں گھری ہوئی ہیں، بلکہ ہمارا سب کا رَبّ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان میں پیدا ہونے والی تمام مخلوقات کو پیدا کیا ہے، اس لئے میں نے اپنا رُخ تمہارے سب خود تراشیدہ بتوں اور تغیرات و تأثرات میں

گھرے ہوئے ستاروں سے پھیر کر صرف ایک خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی طرف کرلیا ہے، اور میں تمہاری طرح مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

اس واقعۂ مناظرہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیغمبرانہ حکمت وموعظت سے کام لے کر یکبارگی ان کی نجوم پرستی کو غلط یا گمراہی نہیں فرمایا، بلکہ ایک ایسا انداز قائم کیا جس سے ہر ذی عقل انسان کا قلب ودِماغ خود متأثر ہوکر حقیقت کو پہچان لے، ہاں! بت پرستی کے خلاف بات کرنے میں اوّل ہی شدّت اختیار فرمائی، اور اپنے باپ اور پوری قوم کا گمراہی پر ہونا صاف طور پر بیان کردیا، وجہ یہ تھی کہ بت پرستی کا نامعقول گمراہی ہونا بالکل واضح اور کھلا ہوا تھا، بخلاف نجوم پرستی کے کہ اس کی گمراہی اتنی واضح اور جلی نہیں تھی۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نجوم پرستی کے خلاف اپنی قوم کے سامنے جو اِستدلال بیان فرمایا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ جو چیز تغیر پذیر ہو اور اس کے حالات اَدل بدل ہوتے رہتے ہوں، اور وہ اپنی حرکات میں کسی دُوسری طاقت کے تابع ہو، وہ ہرگز اس لائق نہیں کہ اس کو اَپنا رَبّ قرار دیں، اس اِستدلال میں سیاروں کے طلوع وغروب اور درمیانی تمام حالات سے اِستدلال کیا جاسکتا تھا کہ وہ اپنی حرکات میں خودمختار نہیں، کسی کے حکم کے تابع ایک خاص رَوِش پر چل رہے ہیں، لیکن حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے ان تمام حالات وکیفیات میں سے اِستدلال کے لئے ان سیاروں کے غروب کو پیش کیا، کیونکہ ان کا غروب عوام کی نظروں میں ایک طرح سے ان کا زوال سمجھا جاتا ہے، اور انبیاء علیہم السلام کا عام طرزِ اِستدلال وہ ہوتا ہے جو عوام کے ذہنوں پر اثرانداز ہو، وہ فلسفیانہ حقائق کے پیچھے زیادہ نہیں پڑتے بلکہ عام ذہنوں کے مطابق خطاب فرماتے ہیں، اس لئے ان سیاروں کی بے بسی اور بے اثری ثابت کرنے کے لئے ان کے غروب کو پیش کیا، ورنہ اُن کے بے بس اور بے قدرت ہونے پر تو طلوع سے بھی اِستدلال ہوسکتا تھا، اور اس کے بعد غروب سے پہلے تک جتنے تغیرات پیش آتے ہیں ان سے بھی اس پر دلیل پکڑی جاسکتی ہے۔

مبلغینِ اسلام کے لئے چند ہدایات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس طرزِ مناظرہ سے علماء و مبلغین کے لئے چند اہم ہدایات حاصل ہوئیں، اوّل یہ کہ قوموں کی تبلیغ و اصلاح میں نہ ہر جگہ سختی مناسب ہے، نہ ہر جگہ نرمی، بلکہ ہر ایک کا ایک موقع اور ایک حد ہے، چنانچہ بت پرستی کے معاملے میں حضرت خلیل اللہ نے سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں، کیونکہ اس کی گمراہی مشاہدے میں آنے والی چیز ہے، اور نجوم پرستی کے معاملے میں ایسے سخت الفاظ استعمال نہیں فرمائے بلکہ ایک خاص تدبیر سے معاملے کی حقیقت کو قوم کے ذہن نشین فرمایا، کیونکہ سیاروں اور ستاروں کا بے بس اور بے اختیار ہونا اتنا واضح اور کھلا ہوا نہیں تھا جتنا خود تراشیدہ بتوں کا، اس سے معلوم ہوا کہ عوام اگر کسی ایسی غلطی میں مبتلا ہوں جس کا غلطی اور گمراہی ہونا عام نظروں میں واضح نہ ہو تو عالم اور مبلغ کو چاہئے کہ تشدّد کے بجائے ان کے شبہات کو دُور کرنے کی تدبیر کرے۔

دُوسری ہدایت اس میں یہ ہے کہ اِظہارِ حق و حقیقت کے لئے اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کو یوں خطاب نہیں کیا کہ تم ایسا کرو، بلکہ اپنا حال بتلا دیا کہ میں تو ان طلوع و غروب کے چکر میں رہنے والی چیزوں کو معبود قرار نہیں دے سکتا، اس لئے میں نے اپنا رُخ ایک ایسی ہستی کی طرف کرلیا ہے جو اِن سب چیزوں کو پیدا کرنے والی اور پالنے والی ہے، مقصد تو یہی تھا کہ تم کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے، مگر حکیمانہ انداز میں صریح خطاب سے پرہیز فرمایا، تاکہ وہ ضد پر نہ آجائیں، اس سے معلوم ہوا کہ مصلح اور مبلغ کا صرف یہ کام نہیں کہ حق بات کو جس طرح چاہے کہہ ڈالے، بلکہ اس پر لازم ہے کہ ایسے انداز سے کہے جو لوگوں کے لئے مؤثر ہو۔ (معارف القرآن ج:۳ ص:۳۸۱)

۲-موعظہ حسنہ: مخاطب کے حالات کی رعایت

"مخاطب کے حالات کی رعایت رکھنا اور بات کو ایسے طریقے سے پیش کرنا کہ مخاطب کا دِل قبولیت کے لئے نرم ہو جائے، کارِ دعوت کا اہم اُصول ہے۔

پیغمبرانہ طریقِ دعوت میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:-"

ارشادِ ربانی

۱- قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ۚ أُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿٦٠﴾ (المائدة)

ترجمہ:- تو کہہ میں تم کو بتلاؤں ان میں کس کی بُری جزا ہے اللہ کے ہاں، وہی جس پر اللہ نے لعنت کی اور اس پر غضب نازل کیا اور ان میں سے بعضوں کو بندر کر دیا اور بعضوں کو سوَر اور جنھوں نے بندگی کی شیطان کی، وہی لوگ بدتر ہیں درجے میں اور بہت بہکے ہوئے ہیں سیدھی راہ سے۔

خلاصہ تفسیر

اور آپ ان سے کہہ دیجئے کہ (اگر اس پر بھی تم ہمارے طریقے کو بُرا سمجھتے ہو تو آؤ) کیا میں (اچھے بُرے میں موازنہ کرنے کے لئے) تم کو ایسا طریقہ بتلاؤں جو (ہمارے) اس (طریقے) سے بھی (جس کو تم بُرا سمجھ رہے ہو) خدا کے یہاں سزا ملنے میں زیادہ بُرا ہو، وہ ان اَشخاص کا طریقہ ہے جن کو (اس طریقے کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے اپنی

رحمت سے دُور کر دیا ہو اور ان پر غضب فرمایا ہو اور ان کو بندر اور سوَر بنا دیا ہو اور انہوں نے شیطان کی پرستش کی ہو (اب دیکھ لو کہ ان میں کونسا طریقہ بُرا ہے، آیا وہ طریقہ جس میں غیراللہ کی عبادت اور اس پر یہ وبال ہوں، یا وہ طریقہ جو سراسر توحید اور نبوّتِ انبیاء کی تصدیق ہو، یقیناً موازنے کا نتیجہ یہی ہے کہ) ایسے اَشخاص (جن کا طریقہ ابھی ذکر کیا گیا ہے آخرت میں) مکان کے اعتبار سے بھی (جوان کو سزا کے طور پر ملے گا) بہت بُرے ہیں (کیونکہ یہ مکان دوزخ ہے) اور (دُنیا میں) راہِ راست سے بھی بہت دُور ہیں (اشارہ یہ ہے کہ تم لوگ ہم پر ہنستے ہو، حالانکہ اِستہزاء کے قابل تمہارا طریقہ ہے، کیونکہ یہ سب خصلتیں تم میں پائی جاتی ہیں، کہ یہود نے گوسالہ پرستی کی اور نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا بنالیا، پھر اپنے علماء و مشائخ کو خدائی کے اِختیارات سپرد کر دیئے، اسی لئے یہودیوں نے جب یومِ سبت کے اَحکام کی خلاف ورزی کی تو اللہ کا عذاب آیا، وہ بندر بنا دیئے گئے، اور نصاریٰ کی درخواست پر آسمانی مائدہ نازل ہونے لگا، انہوں نے پھر بھی ناشکری کی تو ان کو بندر اور سوَر بنا دیا گیا)۔

یہاں "قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ" میں جو حال ایک مثال کے انداز میں ایسے لوگوں کا بیان کیا ہے جن پر اللہ کی لعنت و غضب ہے، اس کے مصداق درحقیقت خود یہی مخاطب تھے، مقام اس کا تھا کہ اُن پر ہی یہ اِلزام عائد کیا جاتا کہ تم ایسے ہو، مگر قرآنِ کریم نے طرزِ بیان بدل کر اس کو ایک مثال کی صورت دے دی، جس میں پیغمبرانہ دعوت کا ایک خاص اُسلوب بتلایا گیا کہ عنوانِ بیان ایسا اختیار کرنا چاہئے جس سے مخاطب کو اِشتعال پیدا نہ ہو۔

(معارف القرآن ج:۳ ص:۱۸۳)

کتمانِ علم کا گناہ

ارشادِ ربانی

۲- اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ

لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ أُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ (البقرۃ)

ترجمہ:- بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ ہم نے اُتارے صاف حکم اور ہدایت کی باتیں بعد اس کے کہ ہم ان کو کھول چکے لوگوں کے واسطے کتاب میں، اُن پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں اُن پر لعنت کرنے والے۔

خلاصۂ تفسیر

جو لوگ اِخفاء کرتے ہیں ان مضامین کا جن کو ہم نے نازل کیا ہے جو کہ (اپنی ذات میں) واضح ہیں اور (دُوسروں کے لئے) ہادی ہیں (اور اِخفاء بھی) اس (حالت) کے بعد کہ ہم ان (مضامین) کو کتاب (اِلٰہی توراۃ واِنجیل) میں (نازل فرما کر) عام لوگوں پر ظاہر کر چکے ہوں، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں (کہ اپنی رحمتِ خاصہ سے اُن کو بعید کر دیتے ہیں) اور (دُوسرے بہتیرے) لعنت کرنے والے بھی (جن کو اس فعل سے نفرت ہے) اُن پر لعنت بھیجتے ہیں (کہ ان پر بددُعا کرتے ہیں)۔

معارف ومسائل

اشاعتِ علمِ دِین کا وجوب

آیتِ مذکورہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایاتِ بینات نازل کی گئی ہیں ان کا لوگوں سے چھپانا اتنا بڑا جرمِ عظیم ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت کرتے ہیں اور تمام مخلوق لعنت بھیجتی ہے، اس سے چند اَحکام حاصل ہوئے:-

اوّل یہ کہ جس علم کے اِظہار اور پھیلانے کی ضرورت ہے اس کا چھپانا حرام ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ يَعْلَمُهٗ فَكَتَمَهٗ اَلْجَمَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِّنَ النَّارِ۔ (رواہ ابو ہریرۃ وعمرو بن العاص رضی اللہ عنہما، اخرجہ ابن ماجہ، از قرطبی)

یعنی جو شخص دِین کے کسی حکم کا علم رکھتا ہے اور اس سے وہ حکم دریافت کیا جائے، اگر وہ اس کو چھپائے گا تو قیامت کے روز اس کے منہ میں آگ کا لگام ڈالا جائے گا۔

حضراتِ فقہاء نے فرمایا کہ یہ وعید اس صورت میں ہے جبکہ اس کے سوا کوئی دُوسرا آدمی مسئلے کا بیان کرنے والا وہاں موجود نہ ہو، اور اگر دُوسرے علماء بھی موجود ہوں تو گنجائش ہے کہ یہ کہہ دے کہ دُوسرے علماء سے دریافت کرلو۔ (قرطبی، جصاص)

دُوسری بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ جس کو خود صحیح علم حاصل نہیں، اس کو مسائل واَحکام بتانے کی جرأت نہیں کرنا چاہئے۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ علم کو چھپانے کی یہ سخت وعید انہیں علوم و مسائل کے متعلق ہے جو قرآن وسنت میں واضح بیان کئے گئے ہیں، اور جن کے ظاہر کرنے اور پھیلانے کی ضرورت ہے، وہ باریک اور دقیق مسائل جو عوام نہ سمجھ سکیں بلکہ خطرہ ہو کہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوجائیں گے تو ایسے مسائل واَحکام کا عوام کے سامنے بیان نہ کرنا ہی بہتر ہے، اور وہ کتمانِ علم کے حکم میں نہیں ہے، آیتِ مذکورہ میں لفظ "مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى" سے اسی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، ایسے ہی مسائل کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: تم اگر عوام کو ایسی حدیثیں سناؤ گے جن کو وہ پوری طرح نہ سمجھ سکیں تو ان کو فتنے میں مبتلا کروگے۔ (قرطبی)

اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت علی کرّم اللہ وجہہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا کہ: عام لوگوں کے سامنے صرف اتنے ہی علم کا اظہار کرو جس کو ان کی عقل وفہم برداشت کرسکے، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کریں، کیونکہ جو بات ان کی سمجھ سے باہر ہوگی، ان کے دِلوں میں اس سے شبہات وخدشات پیدا ہوں گے اور ممکن

ہے کہ اس سے انکار کر بیٹھیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ عالم کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ مخاطب کے حالات کا اندازہ لگا کر کلام کرے، جس شخص کے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو اُس کے سامنے ایسے مسائل بیان ہی نہ کرے، اسی لئے حضراتِ فقہاء بہت سے مسائل کے بیان کے بعد میں لکھ دیتے ہیں: "هٰذَا مِمَّا يُعْرَفُ وَلَا يُعَرَّفُ" یعنی یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اہلِ علم کو خود تو سمجھ لینا چاہئے، مگر عوام میں پھیلانا نہیں چاہئے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لَا تَمْنَعُوا الْحِكْمَةَ اَهْلَهَا فَتَظْلِمُوْهُمْ وَلَا تَضَعُوْهَا فِيْ غَيْرِ اَهْلِهَا فَتَظْلِمُوْهَا۔

یعنی حکمت کی بات کو ایسے لوگوں سے نہ روکو جو اس بات کے اہل ہوں، اگر تم نے ایسا کیا تو ان لوگوں پر ظلم ہوگا، اور جو اہل نہیں ہیں ان کے سامنے حکمت کی باتیں نہ رکھو، کیونکہ اس صورت میں اس حکمت پر ظلم ہوگا۔

اِمام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کسی کافر کو جو مسلمانوں کے مقابلے میں مناظرہ کرتا ہو، یا کوئی مبتدع گمراہ جو لوگوں کو اپنے غلط خیالات کی طرف دعوت دیتا ہو، اس کو علمِ دِین سکھانا اُس وقت تک جائز نہیں جب تک یہ ظن غالب نہ ہو جائے کہ علم سکھانے سے اس کے خیالات دُرست ہو جائیں گے۔

اسی طرح کسی بادشاہ یا حاکمِ وقت کو ایسے مسائل بتلانا جن کے ذریعے وہ رعیت پر ظلم کرنے کا راستہ نکال لیں، جائز نہیں۔ اسی طرح عوام کے سامنے اَحکامِ دِین میں رُخصتیں اور حیلوں کی صورتیں بلاضرورت بیان نہ کرنا چاہئے، جس کی وجہ سے وہ اَحکامِ دِین پر عمل کرنے میں حیلہ جوئی کے عادی بن جائیں (قرطبی)۔ (معارف القرآن ج:۱ ص:۴۰۱)

مغرب سے نکالے، دفع اس شبہ کا یہ ہے کہ اس کے قلب میں بلا اِختیار یہ بات پڑ گئی کہ خدا ضرور ہے، اور یہ مشرق سے نکالنا اسی کا فعل ہے اور وہ مغرب سے بھی نکال سکتا ہے، اور یہ شخص پیغمبر ہے، اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہوگا اور ایسا ہونے سے اِنقلابِ عظیم عالم میں پیدا ہوگا، کہیں اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں، مثلاً لوگ اس معجزے کو دیکھ کر مجھ سے منحرف ہوکر ان کی راہ پر ہولیں، ذرا سی حجت میں سلطنت جاتی رہے، یہ جواب تو اس لئے نہ دیا، اور دُوسرا کوئی جواب تھا نہیں، اس لئے حیران رہ گیا (بیان القرآن)۔

(معارف القرآن ج:۱ ص:۲۱۸)

مناظرے کی حقیقت اور اس کا پیغمبرانہ طریقہ

ارشادِ ربانی

۱- وَاِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰٓی اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۰﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا
یَتَّقُوْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ﴿۱۲﴾ وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا
یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ
یَّقْتُلُوْنِ ﴿۱۴﴾ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاْتِیَا
فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ
اِسْرَآءِیْلَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِیْنَا وَلِیْدًا وَّلَبِثْتَ فِیْنَا مِنْ عُمُرِكَ
سِنِیْنَ ﴿۱۸﴾ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِیْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹﴾ قَالَ
فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿۲۰﴾ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِیْ
رَبِّیْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۲۱﴾ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَیَّ اَنْ عَبَّدْتَّ
بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ

اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۶﴾ قَالَ اِنَّ
رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ
مَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ
لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ قَالَ
فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۳۲﴾ وَّ
نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيْضَاۗءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۳۳﴾ (الشعراء)

ترجمہ:- اور جب پکارا تیرے رَبّ نے موسیٰ کو کہ جا اس قوم گنہگار کے پاس، قومِ فرعون کے پاس کیا وہ ڈرتے نہیں، بولا اے رَبّ! میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھٹلائیں اور رُک جاتا ہے میرا جی اور نہیں چلتی میری زبان سو پیغام دے ہارون کو، اور اُن کو مجھ پر ہے ایک گناہ کا دعویٰ، سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو مار ڈالیں۔ فرمایا کبھی نہیں، تم دونوں جاؤ لے کر ہماری نشانیاں ہم ساتھ تمہارے سنتے ہیں۔ سو جاؤ فرعون کے پاس اور کہو ہم پیغام لے کر آئے ہیں پروردگارِ عالم کا یہ کہ بھیج دے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو، بولا کیا نہیں پالا ہم نے تجھ کو اپنے اندر لڑکا سا اور رہا تو ہم میں اپنی عمر میں سے کئی برس۔ اور کر گیا تو اپنی وہ کرتوت جو کر گیا اور تو ہے ناشکرا۔ کہا کیا تو تھا میں نے وہ کام اور میں تھا چوکنے والا، پھر بھاگا میں تم سے جب تمہارا ڈر دیکھا پھر بخشا مجھ کو میرے رَبّ نے حکم اور ٹھہرایا مجھ کو پیغام پہنچانے والا، اور کیا وہ اِحسان ہے جو تو تجھ پر رکھتا ہے کہ غلام بنایا تو نے بنی اسرائیل کو۔ بولا فرعون کیا معنی پروردگارِ عالم کا، کہا پروردگار آسمان اور زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے، اگر تم یقین کرو۔ بولا اپنے گرد والوں سے کیا تم نہیں سنتے ہو، کہا پروردگار تمہارا اور پروردگار تمہارے اگلے

باپ دادوں کا، بولا تمہارا پیغام لانے والا جو تمہاری طرف بھیجا گیا ضرور باؤلا ہے، کہا پروردگار مشرق کا اور مغرب کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے، اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ بولا اگر تو نے ٹھہرایا کوئی اور حاکم میرے سوائے تو مقرّر ڈالوں گا تجھ کو قید میں۔ کہا اور اگر لے کر آیا ہوں تیرے پاس ایک چیز کھول دینے والی، بولا تو وہ چیز لا اگر تو سچ کہتا ہے۔ پھر ڈال دیا اپنا عصا، سو اسی وقت وہ اژدہا ہو گیا صریح اور اندر سے نکالا اپنا ہاتھ سو اسی وقت وہ سفید تھا دیکھنے والوں کے سامنے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (ان لوگوں سے اس وقت کا قصہ ذکر کیجئے) جب آپ کے رَبّ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو پکارا (اور حکم دیا) کہ تم ان ظالم لوگوں کے یعنی قومِ فرعون کے پاس جاؤ (اور اے موسیٰ! دیکھو) کیا یہ لوگ (ہمارے غضب سے) نہیں ڈرتے (یعنی ان کی حالت عجیب اور شنیع ہے، اس لئے ان کی طرف تم کو بھیجا جاتا ہے) انہوں نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! (میں اس خدمت کے لئے حاضر ہوں لیکن اس خدمت کی تکمیل کے لئے ایک مددگار چاہتا ہوں کیونکہ) مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ مجھ کو (اپنی پوری بات کہنے سے پہلے ہی) جھٹلانے لگیں اور (طبعی طور پر ایسے وقت میں) میرا دِل تنگ ہونے لگتا ہے اور میری زبان (اچھی طرح) نہیں چلتی اس لئے ہارون کے پاس (بھی وحی) بھیج دیجئے (اور ان کو نبوّت عطا فرما دیجئے کہ اگر میری تکذیب کی جاوے تو وہ تصدیق کرنے لگیں تا کہ دِل شگفتہ اور زبان رواں رہے، اور اگر میری زبان کسی وقت بند ہو جاوے تو وہ تقریر کرنے لگیں اور ہر چند کہ یہ غرض ویسے بھی ہارون علیہ السلام کو بلا نبوّت عطا ہوئے ساتھ رکھنے سے حاصل ہو سکتی تھی، مگر عطائے نبوّت میں اور زیادہ باَکمل وجوہ پوری ہوئی) اور (ایک اَمر یہ قابلِ عرض ہے کہ) میرے ذمہ اُن لوگوں کا ایک جرم بھی ہے (کہ میرے ہاتھ سے ایک قبطی قتل ہو گیا

تھا جس کا قصہ سورۂ قصص میں آوے گا) سو (اس لئے) مجھ کو (ایک) یہ اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھ کو (قبل تبلیغ رسالت) قتل کر ڈالیں (تب بھی تبلیغ نہ کرسکوں گا تو اس کی بھی کوئی تدبیر فرمادیجئے) ارشاد ہوا کہ کیا مجال ہے (جو ایسا کرسکیں اور ہم نے ہارون کو بھی پیغمبری دی، اب تبلیغ کے دونوں مانع مرتفع ہوگئے) سو (اب) تم دونوں میرے اَحکام لے کر جاؤ (کہ ہارون بھی نبی ہوگئے اور) ہم (نصرت و اِمداد سے) تمہارے ساتھ ہیں (اور جو گفتگو تمہاری اور ان لوگوں کی ہوگی اُس کو) سنتے ہیں، سوتم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور (اس) سے کہو کہ ہم رَبّ العالمین کے فرستادہ ہیں (اور دعوت الی التوحید کے ساتھ یہ حکم بھی لائے ہیں) کہ تو بنی اسرائیل کو (اپنے بیگار اور ظلم سے رہائی دے کر ان کے اصلی وطن ملکِ شام کی طرف) ہمارے ساتھ جانے دے (خلاصہ اس دعوت کا حقوق اللہ اور حقوق العباد میں ظلم و تعدی کا ترک کرنا ہے، چنانچہ یہ دونوں حضرات گئے اور فرعون سے سب مضامین کہہ دیئے) فرعون (یہ سب باتیں سن کر اوّل موسیٰ علیہ السلام کی طرف ان کو پہچان کر متوجہ ہوا اور) کہنے لگا کہ (اَہا تم ہو) کیا ہم نے تم کو بچپن میں پرورِش نہیں کیا اور تم اپنی (اس) عمر میں برسوں ہم میں رہا سہا کئے اور تم نے اپنی وہ حرکت بھی کی تھی جو کی تھی (یعنی قبطی کو قتل کیا تھا) اور تم بڑے ناسپاس ہو (کہ میرا ہی کھایا، میرا ہی آدمی قتل کیا اور پھر مجھ کو اپنا تابع بنانے آئے ہو، چاہئے تو یہ تھا کہ تم میرے سامنے دَب کر رہتے) موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ (واقعی) اس وقت وہ حرکت میں کر بیٹھا تھا اور مجھ سے غلطی ہوگئی تھی (یعنی عمداً میں نے قتل نہیں کیا، اُس کی ظالمانہ رَوِش سے اس کو روکنا مقصود تھا، اتفاق سے وہ مرگیا) پھر جب مجھ کو ڈر لگا تو میں تمہارے ہاں سے مفرور ہوگیا، پھر مجھ کو میرے رَبّ نے دانش مندی عطا فرمائی اور مجھ کو پیغمبروں میں شامل کردیا (اور وہ دانش مندی اسی نبوّت کے لوازم سے ہے، خلاصۂ جواب یہ ہے کہ میں پیغمبری کی حیثیت سے آیا ہوں جس میں دَبنے کی کوئی وجہ نہیں اور پیغمبری اس واقعۂ قتلِ خطا کے منافی نہیں، کیونکہ یہ قتل خطاءً صادر ہوا تھا جو نبوّت کی اہلیت

وصلاحیت کے منافی نہیں، یہ تو جواب ہے، اعتراضِ قتل کا) اور (رہا احسان جتلانا پرورِش کا سو) وہ یہ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر اِحسان رکھتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو سخت ذِلت (اور ظلم) میں ڈال رکھا تھا (کہ اُن کے لڑکوں کو قتل کرتا تھا جس کے خوف سے میں صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈالا گیا اور تیرے ہاتھ لگ گیا اور تیری پرورِش میں رہا، تو اس پرورِش کی اصلی وجہ تو تیرا ظلم ہی ہے، تو ایسی پرورِش کا کیا اِحسان جتلاتا ہے، بلکہ اس سے تو تجھے اپنی ناشائستہ حرکات کو یاد کر کے شرمانا چاہئے) فرعون (اس بات پر لاجواب ہوا اور گفتگو کا پہلو بدل کر اُس) نے کہا کہ (جس کو تم) رَبّ العالمین (کہتے ہو، لقولہٖ تعالیٰ: "اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" اس) کی ماہیت (اور حقیقت) کیا ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمینوں کا اور جو کچھ (مخلوقات) ان کے درمیان میں ہے اس (سب) کا، اگر تم کو یقین (حاصل) کرنا ہو، (تو یہ پتہ بہت ہے، مطلب یہ کہ اس کی حقیقت کا ادراک انسان نہیں کرسکتا، اس لئے جب ان کا سوال ہوگا صفات سے ہی جواب ملے گا) فرعون نے اپنے اِردگرد (بیٹھنے) والوں سے کہا کہ تم لوگ (کچھ) سنتے ہو (کہ سوال کچھ جواب کچھ) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ وہ پروردگار ہے تیرا اور تیرے پہلے بزرگوں کا (اس جواب میں مکرّر تنبیہ ہے اس مطلبِ مذکور پر مگر) فرعون (نہ سمجھا اور) کہنے لگا کہ یہ تمہارا رسول جو (بزعمِ خود) تمہاری طرف رسول ہوکر آیا ہے مجنون (معلوم ہوتا) ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ وہ پروردگار ہے مشرق اور مغرب کا اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس کا بھی، اگر تم کو عقل ہو (تو اسی سے مان لو) فرعون (آخر مجبور ہوکر) کہنے لگا کہ اگر تم میرے سوا کوئی اور معبود تجویز کرو گے تو تم کو جیل خانہ بھیج دُوں گا، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اگر کوئی میں صریح دلیل پیش کروں تب بھی (نہ مانگے) فرعون نے کہا اچھا تو وہ دلیل پیش کرو، اگر تم سچے ہو، تو موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی لاٹھی ڈال دی تو دفعۃً ایک نمایاں اژدہا بن گیا (اور دُوسرا معجزہ دِکھلانے کے لئے) اپنا ہاتھ (گریبان میں

دے کر) باہر نکالا تو وہ دفعۃً سب دیکھنے والوں کے رُوبرو بہت ہی چمکتا ہوا ہو گیا (کہ اس کو بھی سب نے نظرِ حسی سے دیکھا)۔

مناظرے کے آداب

دو مختلف الخیال شخصوں اور جماعتوں میں نظریاتی بحث و مباحثہ جس کو اصطلاح میں ''مناظرہ'' کہا جاتا ہے، زمانۂ قدیم سے رائج ہے، مگر عام طور پر مناظرہ ایک ہار جیت کا کھیل ہو کر رہ گیا ہے، لوگوں کی نظر میں مناظرے کا حاصل اتنا ہی ہے کہ اپنی بات اُونچی ہو، چاہے اس کی غلطی خود بھی معلوم ہو چکی ہو، اُس کو صحیح اور قوی ثابت کرنے کے لئے دلائل اور ذہانت کا سارا زور خرچ کیا جائے، اسی طرح مخالف کی کوئی بات سچی اور صحیح بھی ہو تو بہرحال رَدّ ہی کرنا اور اس کی تردید میں پوری توانائی صَرف کرنا ہے۔ اسلام ہی نے اس کام میں خاص اعتدال پیدا کیا ہے، اُس کے اُصول وقواعد اور حدود معین کر کے اس کو ایک مفید و مؤثر آلۂ تبلیغ واصلاح بنایا ہے۔

آیاتِ مذکورہ میں اس کا ایک مختصر سا نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام نے جب فرعون جیسے جبار، خدائی کے مدعی کو اُس کے دربار میں دعوتِ حق پہنچائی تو اُس نے مخالفانہ بحث کا آغاز اوّل دو ایسی باتوں سے کیا جن کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات سے تھا، جیسا ہوشیار مخالف عموماً جب اصل بات کے جواب پر قادر نہیں ہوتا تو مخاطب کی ذاتی کمزوریاں ڈھونڈا اور بیان کیا کرتا ہے تاکہ وہ کچھ شرمندہ ہو جائے اور لوگوں میں اُس کی ہوا اُکھڑ جائے، یہاں بھی فرعون نے دو باتیں کہیں۔ اوّل تو یہ کہ تم ہمارے پروردہ، ہمارے گھر میں پل کر جوان ہوئے ہو، ہم نے تم پر اِحسانات کئے ہیں، تمہاری کیا مجال ہے کہ ہمارے سامنے بولو۔ دُوسری بات یہ ہے کہ تم نے ایک قبطی شخص کو بلاوجہ قتل کر ڈالا ہے، جو علاوہ ظلم کے حق ناشناسی اور ناشکری بھی ہے کہ جس قوم میں پلے اور جوان ہوئے اُسی کے آدمی کو مار ڈالا۔ اس کے بالمقابل حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیغمبرانہ

جواب دیکھئے کہ اوّل تو جواب میں سوال کی ترتیب کو بدلا یعنی قبطی کے قتل کا قصہ جو فرعون نے بعد میں بیان کیا تھا، اُس کا جواب پہلے آیا، اور خانہ پرورده ہونے کے اِحسان کا ذکر جو پہلے کیا تھا، اُس کا جواب بعد میں۔ اس ترتیب بدلنے میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ واقعۂ قبطی میں ایک اپنی کمزوری ضرور واقع ہوئی تھی، آج کل کے مناظروں کے طرز پر تو ایسی چیز کے ذکر ہی کو رَلا ملا دیا جاتا ہے، اور دُوسری باتوں کی طرف توجہ پھیرنے کی کوشش کی جاتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے رسول نے اُسی کے جواب کو اوّلیت دی، اور جواب بھی فی الجملہ اعترافِ کمزوری کے ساتھ دیا، اس کی قطعاً پروانہ کی کہ مخالف لوگ کہیں گے کہ انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے ہار مان لی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں اس کا تو اِعتراف کرلیا کہ اس قتل میں مجھ سے غلطی اور خطا ہوگئی مگر ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ یہ غلطی قصداً نہیں تھی، ایک صحیح اِقدام تھا جو اتفاقاً غلط انجام پر پہنچ گیا کہ مقصد تو قبطی کو اسرائیلی شخص پر ظلم سے روکنا تھا، اسی قصد سے اس کو ایک ضرب لگائی تھی، اتفاقاً وہ اسی سے مرگیا، اس لئے یہ فعل خطا ہونے کے باوجود ہمارے اصل معاملے یعنی نبوّت کے دعوے اور اُس کی حقانیت پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ مجھے اس غلطی پر تنبہ ہوا اور قانونی گرفت کے خوف سے شہر سے نکل گیا، اللہ تعالیٰ نے پھر کرم فرمایا اور نبوّت و رِسالت سے سرفراز فرما دیا۔

غور کیجئے کہ اس وقت دُشمن کے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام کا سیدھا صاف جواب یہ تھا کہ مقتول قبطی کو واجب القتل ثابت کرتے، اس پر ایسے اِلزامات لگاتے جس سے اُس کا واجب القتل ہونا ثابت ہوتا، کوئی دُوسرا آدمی تکذیب کرنے والا بھی وہاں موجود نہ تھا جس سے تردید کا اندیشہ ہوتا، اور اس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا کوئی دُوسرا آدمی ہوتا تو اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہ ہوتا مگر وہاں تو خدا تعالیٰ کا ایک اُولوالعزم رسول صدقِ مجسم تھا جو حق و صدق اور حقیقت کے اظہار ہی کو اپنی فتح سمجھتا تھا، دُشمن کے بھرے دربار میں اپنی خطا کا اعتراف بھی کرلیا اور اُس سے جو نبوّت و رِسالت پر

شبہ ہوسکتا تھا اس کا جواب بھی دے دیا۔ اس کے بعد پہلی بات یعنی خانہ پرورده ہونے کے احسان جتلانے کے جواب کی طرف توجہ فرمائی تو اس کے اس ظاہری احسان کی اصل حقیقت کی طرف توجہ دِلادی کہ ذرا سوچو، میں کہاں اور دربارِ فرعون کہاں؟ میری پرورِش تمہارے گھر میں ہونے کے سبب پر غور کرو تو یہ حقیقت کھل جائے گی کہ تم جو پوری قوم بنی اسرائیل پر یہ خلافِ انسانیت ظلم توڑ رہے تھے کہ ان کے بے گناہ معصوم لڑکوں کو قتل کردیتے تھے، بظاہر تو تمہارے اس ظلم وستم سے بچنے کے لئے میری والدہ نے مجھے دریا میں ڈالا اور تم نے اتفاقی طور پر میرا تابوت دریا سے نکال کر گھر میں رکھ لیا، اور حقیقۃً یہ اللہ تعالیٰ کا حکیمانہ انتظام اور تمہارے ظلم کی غیبی سزا تھی کہ جس بچے کے خطرے سے بچنے کے لئے تم نے ہزاروں بچے قتل کر ڈالے تھے، قدرت نے اُس بچے کو تمہارے ہی ہاتھوں پلوایا۔ اب سوچو کہ یہ میری پرورِش تمہارا کیا احسان تھا؟ اسی پیغمبرانہ طرزِ جواب کا یہ اثر تو طبعی اور عقلی طور پر حاضرین پر ہونا ہی تھا کہ یہ بزرگ کوئی بات بنانے والے نہیں، سچ کے سوا کچھ نہیں کہتے، اس کے بعد جب معجزات دیکھے تو اور زیادہ اس کی تصدیق ہوگئی، اور گو اقرار نہیں کیا مگر مرعوب اتنا ہوگیا کہ یہ صرف دو آدمی جن کے آگے پیچھے کوئی تیسرا مددگار نہیں، دربار سارا اُس کا، شہر اور ملک اُس کا، مگر یہ خوف اس پر طاری ہے کہ یہ دو آدمی ہمیں اپنے اس ملک ومملکت سے نکال دیں گے۔

یہ ہوتا ہے خداداد رُعب اور صدق وحق اور سچائی کی ہیبت، حضراتِ انبیاء علیہم السلام کے مجادلات ومناظرات بھی صدق وسچائی اور مخاطب کی دِینی خیرخواہی کے جذبات سے پُر ہوتے ہیں، وہی دِلوں میں گھر کرتے ہیں اور بڑے بڑے سرکشوں کو رام کرلیتے ہیں۔

(معارف القرآن ج:۶ ص:۵۱۳)

''دعوت کا یہی طریقہ حضرت نوح علیہ السلام کے واقعے سے بھی

ملتا ہے جو مندرجہ ذیل آیات میں مذکور ہے۔''

ارشادِ ربانی

۲- لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ
غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا
لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ
رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۱﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ
لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ
فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾

(الاعراف)

ترجمہ:- بے شک بھیجا ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف پس اس نے کہا اے میری قوم! بندگی کرو اللہ کی، کوئی نہیں تمہارا معبود اس کے سوا، میں خوف کرتا ہوں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے۔ بولے سردار اس کی قوم کے ہم دیکھتے ہیں تجھ کو صریح بہکا ہوا۔ بولا اے میری قوم! میں ہرگز بہکا نہیں ولیکن میں بھیجا ہوا ہوں جہان کے پروردگار کا، پہنچاتا ہوں تم کو پیغام اپنے رَبّ کے اور نصیحت کرتا ہوں تم کو اور جانتا ہوں اللہ کی طرف سے وہ باتیں جو تم نہیں جانتے۔ کیا تم کو تعجب ہوا کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رَبّ کی طرف سے ایک مرد کی زبانی جو تم ہی میں سے ہے تاکہ وہ تم کو ڈرائے اور تاکہ تم بچو اور تاکہ تم پر رحم ہو۔ پھر انہوں نے اُس کو جھٹلایا، پھر ہم نے بچالیا اُس کو اور اُن کو کہ جو اس کے ساتھ تھے کشتی میں اور غرق کردیا ان کو جو جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو، بے شک وہ لوگ تھے اندھے۔

خلاصۂ تفسیر

ہم نے نوح (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) ان کی قوم کی طرف بھیجا، سو انہوں نے (اس قوم سے) فرمایا کہ اے میری قوم! تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں (اور بتوں کی پرستش چھوڑ دو جن کا نام سورۂ نوح میں ہے وَدّ اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر) مجھ کو تمہارے لئے (درصورت میرا کہنا نہ ماننے کے) ایک بڑے (سخت) دن کے عذاب کا اندیشہ ہے (کہ وہ یومِ قیامت ہے یا یومِ طوفان)، ان کی قوم کے آبرودار لوگوں نے کہا کہ ہم تم کو صریح غلطی میں (مبتلا) دیکھتے ہیں (کہ توحید کی تعلیم کر رہے ہو اور عذاب کا ڈراوا دِکھلا رہے ہو) انہوں نے (جواب میں) فرمایا کہ اے میری قوم! مجھ میں تو ذرا بھی غلطی نہیں لیکن (چونکہ) میں پروردگارِ عالم کا (بھیجا ہوا) رسول ہوں (انہوں نے مجھ کو توحید پہنچانے کا حکم کیا ہے، اس لئے اپنا منصبی کام کرتا ہوں کہ) تم کو اپنے پروردگار کے پیغام (اور اَحکام) پہنچاتا ہوں (اور اس پہنچانے میں میری کوئی دُنیوی غرض نہیں بلکہ محض) تمہاری خیرخواہی کرتا ہوں (کیونکہ توحید میں تمہارا ہی نفع ہے) اور (عذابِ یومِ عظیم سے جو تم کو تعجب ہوتا ہے تو تمہاری غلطی ہے کیونکہ) میں خدا کی طرف سے ان اُمور کی خبر رکھتا ہوں جن کی تم کو خبر نہیں (تو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو بتلا دیا ہے کہ ایمان نہ لانے سے عذابِ یومِ عظیم واقع ہوگا) اور (تم کو جو میرے رسول ہونے پر بوجہ میرے بشر ہونے کے انکار ہے، جیسا سورۂ مؤمنون میں تصریح ہے: ''مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً...الخ'' تو) کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت جو تمہاری ہی جنس کا (بشر) ہے کوئی نصیحت کی بات آگئی (وہ نصیحت کی بات یہی ہے جو مذکور ہوئی: ''يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ...الٰی قولہ... اِنِّيْٓ اَخَافُ'') تاکہ وہ شخص تم کو (بحکمِ

خداوندی عذاب سے) ڈراوے اور تاکہ تم (اس کے ڈرانے سے) ڈر جاؤ اور تاکہ (ڈرنے کی وجہ سے مخالفت چھوڑ دو جس سے) تم پر رحم کیا جائے سو (باوجود اس تمام تر فہمائش کے) وہ لوگ ان کی تکذیب ہی کرتے رہے تو ہم نے نوح (علیہ السلام) کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں تھے (طوفان کے عذاب سے) بچالیا اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا ان کو ہم نے (طوفان میں) غرق کر دیا، بے شک وہ لوگ اندھے ہو رہے تھے (حق و باطل، نفع ونقصان کچھ نہ سوجھتا تھا)۔

معارف ومسائل

سورۂ اَعراف کے شروع سے یہاں تک اُصولِ اسلام توحید، رِسالت، آخرت کا مختلف عنوانات اور دلائل سے اِثبات اور لوگوں کو اِتباع کی ترغیب اور اُس کی مخالفت پر وعید اور ترہیب اور اُس کے ضمن میں شیطان کے گمراہ کن مکر وفریب وغیرہ کا بیان تھا، اب آٹھویں رُکوع سے تقریباً آخرِ سورت تک چند انبیاء علیہم السلام اور ان کی اُمتوں کا ذکر ہے، جس میں تمام انبیاء علیہم السلام کا متفقہ طور پر اُصولِ مذکورہ توحید، رِسالت، آخرت کی طرف اپنی اپنی اُمتوں کو دعوت دینا اور ماننے والوں کے اَجر وثواب اور نہ ماننے والوں پر طرح طرح کے عذاب اور ان کے انجامِ بد کا مفصل بیان تقریباً چودہ رُکوع میں آیا ہے، جس کے ضمن میں سیکڑوں اُصولی اور فروعی مسائل بھی آ گئے ہیں، اور موجودہ اَقوام کو پچھلی قوموں کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی کا سامان ہو گیا کہ پہلے سب رسولوں کے ساتھ ایسے ہی معاملات ہوتے رہے ہیں۔

آیاتِ مذکورہ سورۂ اَعراف کا آٹھواں رُکوع پورا ہے، اس میں حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی اُمت کے حالات ومقالات کا بیان ہے۔

سلسلۂ انبیاء میں سب سے پہلے نبی اگرچہ آدم علیہ السلام ہیں، لیکن اُن کے زمانے میں کفر و ضلالت کا مقابلہ نہ تھا، اُن کی شریعت میں زیادہ تر اَحکام بھی زمین کی آبادکاری اور اِنسانی ضروریات کے متعلق تھے، کفر اور کافر کہیں موجود نہ تھے، کفر و شرک کا مقابلہ حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوا، اور رِسالت و شریعت کی حیثیت سے دُنیا میں وہ سب سے پہلے رسول ہیں۔ اس کے علاوہ طوفان میں پوری دُنیا غرق ہوجانے کے بعد جو لوگ باقی رہے وہ حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کے رُفقائے سفینہ تھے، انہیں سے نئی دُنیا آباد ہوئی، اسی لئے اُن کو "آدمِ اَصغر" کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قصصِ انبیاء کا آغاز بھی اُنہیں سے کیا گیا جس میں ساڑھے نوسو برس کی طویل عمر میں ان کی پیغمبرانہ جدوجہد اور اِس پراکثر اُمت کی کج روی اور اُس کے نتیجے میں بجز تھوڑے سے مؤمنین کے باقی سب کا غرق ہونا بیان ہوا ہے، تفصیل اس کی یہ ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہے: "لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ"۔

نوح علیہ السلام، آدم علیہ السلام کی آٹھویں پشت میں ہیں، مستدرک حاکم میں بروایت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما منقول ہے کہ آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرن گزرے ہیں۔ اور یہی مضمون طبرانی نے بروایت ابی ذر رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

قرن عام طور پر ایک سو سال کو کہا جاتا ہے، اس لئے دونوں کے درمیان اس روایت کے مطابق ایک ہزار سال کا عرصہ ہوگیا۔ ابنِ جریرؒ نے نقل کیا ہے کہ نوح علیہ السلام کی ولادت حضرت آدم علیہ السلام کی وفات سے آٹھ سے چھبیس سال بعد ہوئی، اور بتصریحِ قرآن ان کی عمر نوسو پچاس سال ہوئی، اور آدم علیہ السلام کی عمر کے متعلق ایک حدیث میں ہے کہ چالیس کم ایک ہزار سال ہے، اس طرح آدم علیہ السلام کی پیدائش سے نوح علیہ

السلام کی وفات تک کل دو ہزار آٹھ سو چھپن سال ہو جاتے ہیں (مظہری)۔ نوح علیہ السلام کا اصلی نام "شاکر" اور بعض روایات میں "سَکَن" اور بعض میں "عبدالغفار" آیا ہے۔

اس میں اختلاف ہے کہ ان کا زمانہ حضرت ادریس علیہ السلام سے پہلے ہے یا بعد میں، اکثر صحابہؓ کا قول یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام ادریس علیہ السلام سے پہلے ہیں (بحرِمحیط)۔

مستدرک حاکم میں بروایت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: نوح علیہ السلام کو چالیس سال کی عمر میں نبوّت عطا ہوئی اور طوفان کے بعد ساٹھ سال زندہ رہے۔

آیتِ قرآن: "لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ" سے ثابت ہے کہ نوح علیہ السلام کی بعثت ونبوّت صرف اپنی قوم کے لئے تھی، ساری دُنیا کے لئے عام نہ تھی، اور ان کی قوم عراق میں آباد بظاہر مہذّب مگر شرک میں مبتلا تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو دعوت دی وہ یہ تھی: "یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ" یعنی اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، مجھے تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا خطرہ ہے۔ اس کے پہلے جملے میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف دعوت ہے جو اَصلِ اُصول ہے۔ دُوسرے جملے میں شرک وکفر سے پرہیز کرنے کی تلقین ہے جو اس قوم میں وباء کی طرح پھیل گیا تھا۔ تیسرے جملے میں اُس عذابِ عظیم کے خطرے سے آگاہ کرنا ہے جو خلاف ورزی کی صورت میں ان کو پیش آنے والا ہے، اس عذابِ عظیم سے مراد آخرت کا عذاب بھی ہوسکتا ہے اور دُنیا میں طوفان کا عذاب بھی (کبیر)۔ ان کی قوم نے اس کے جواب میں کہا:-

"قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ" لفظ "مَـلَأ" قوم کے سرداروں

اور برادریوں کے چودھریوں کے لئے بولا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعوت کے جواب میں قوم کے سرداروں نے کہا کہ: ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہمارے باپ دادوں کے دِین سے ہم کو نکالنا چاہتے ہیں اور قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے اور جزاوسزا پانے کے خیالات یہ سب اوہام ہیں۔

اس دِل آزار و دِل خراش گفتگو کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام نے پیغمبرانہ لہجے میں جو جواب دیا وہ مبلغین اور مصلحین کے لئے ایک اہم تعلیم اور ہدایت ہے کہ اِشتعال کی بات پر مشتعل اور غضب ناک ہونے کے بجائے سادہ لفظوں میں ان کے شبہات کا اِزالہ فرمارہے ہیں: "قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦١﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٢﴾"۔

یعنی اے میری قوم! مجھ میں کوئی گمراہی نہیں مگر بات یہ ہے کہ میں تمہاری طرح آبائی رُسومِ جہالت کا پابند نہیں بلکہ میں ربّ العالمین کی طرف سے رسول ہوں، جو کچھ کہتا ہوں ہدایاتِ ربی سے کہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا پیغام تم کو پہنچاتا ہوں، جس میں تمہارا ہی بھلا ہے، نہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی فائدہ اور نہ میری کوئی غرض۔ اس میں ربّ العالمین کا لفظ عقیدۂ شرک پر ضربِ کاری ہے کہ اس میں غور کرنے کے بعد نہ کوئی دیوی اور دیوتا ٹھہر سکتا ہے، نہ کوئی یزدان واہرمن۔ اس کے بعد فرمایا کہ: تم کو جو قیامت کے عذاب میں شبہات ہیں اُس کی وجہ تمہاری بے خبری اور ناواقفیت ہے، مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کا علمِ یقین دیا گیا ہے۔

اس کے بعد ان کے دُوسرے شبہ کا جواب ہے جو سورۂ مؤمنون میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے: "مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً... الخ"، یعنی ان کی قوم نے نوح علیہ السلام کی دعوت پر ایک شبہ یہ بھی کیا کہ یہ تو ہماری

ہی طرح ایک بشر اور اِنسان ہیں، ہماری ہی طرح کھاتے پیتے، سوتے جاگتے ہیں، ان کو ہم کیسے اپنا مقتدا مان لیں؟ اگر اللہ تعالیٰ کو ہمارے لئے کوئی پیغام بھیجنا تھا تو وہ فرشتوں کو بھیجتے جن کا امتیاز اور بڑائی ہم سب پر واضح ہوتی، اب تو اس کے سوا کوئی بات نہیں کہ ہماری قوم اور نسل کا ایک آدمی ہم پر اپنا تفوّق اور بڑائی قائم کرنا چاہتا ہے۔

اس کے جواب میں فرمایا: "اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ" یعنی کیا تمہیں اس پر تعجب ہے کہ تمہارے رَبّ کا پیغام تمہاری طرف ایک ایسے شخص کی معرفت آیا جو تمہاری ہی جنس کا ہے تاکہ وہ تمہیں ڈراوے اور تاکہ تم ڈر جاؤ اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ یعنی اُس کے ڈرانے سے تم متنبہ ہو کر مخالفت چھوڑ دو جس کے نتیجے میں تم پر رحمت نازل ہو۔

مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بشر کو رسول بنایا جائے، اوّل تو حق تعالیٰ مختارِ مطلق ہیں، جس کو چاہیں اپنی نبوّت و رِسالت عطا فرمائیں، اس میں کسی کو چوں چرا کی مجال نہیں۔ اس کے علاوہ اصل معاملے پر غور کرو تو واضح ہو جائے کہ عام انسانوں کی طرف رِسالت و نبوّت کا مقصد بشر ہی کے ذریعے پورا ہو سکتا ہے، فرشتوں سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

کیونکہ اصل مقصدِ رِسالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور عبادت پر لوگوں کو قائم کر دیا جائے اور اُس کے اَحکام کی مخالفت سے بچایا جائے۔ اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ان کی جنسِ بشر کا کوئی شخص نمونۂ عمل بن کر ان کو دِکھلائے کہ بشری تقاضوں اور خواہشوں کے ساتھ بھی اَحکامِ اِلٰہیہ کی اطاعت اور اس کی عبادت جمع ہو سکتی ہے۔ اگر فرشتے یہ دعوت لے کر آتے اور اپنی مثال لوگوں کے سامنے رکھتے تو سب لوگوں کا یہ عذر ظاہر تھا کہ فرشتے تو بشری خواہشات سے پاک ہیں، نہ اُن کو بھوک پیاس لگتی ہے، نہ نیند آتی ہے، نہ

تکان ہوتا ہے، اُن کی طرح ہم کیسے بن جائیں؟ لیکن جب اپنا ہی ایک ہم جنس بشر تمام بشری خواہشات اور خصوصیات رکھنے کے باوجود اُن اَحکامِ اِلٰہیہ کی مکمل اطاعت کر کے دِکھلائے تو اُن کے لئے کوئی عذر نہیں رہ سکتا۔

اسی بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے فرمایا: "لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا" مطلب یہ ہے کہ جس کے ڈرانے سے متأثر ہوکر لوگ ڈر جائیں وہ وہی ہوسکتا ہے جوان کا ہم جنس اور ان کی طرح بشری خصوصیات کا جامع ہو۔ یہ شبہ اکثر اُمتوں کے کفار نے پیش کیا کہ کوئی بشر نبی اور رسول ہی ہونا چاہیئے، اور قرآن نے سب کا یہی جواب دیا ہے، افسوس ہے کہ قرآن کی اتنی تصریحات کے باوجود آج بھی کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا انکار کرنے کی جرأت کرتے ہیں، مگر جاہل انسان اس حقیقت کو نہیں سمجھتا وہ کسی اپنے ہم جنس کی برتری کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ اپنے ہم عصر اولیاء اور علماء سے ان کی معاصرت کی بنا پر نفرت وحقارت کا برتاؤ جاہلوں کا ہمیشہ شیوہ رہا ہے۔

قومِ نوح علیہ السلام کے دِل خراش کلام کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام کا یہ مشفقانہ اور ناصحانہ رویہ بھی ان کی بے حس قوم پر اثر انداز نہ ہوا بلکہ اندھے بن کر جھٹلانے ہی میں لگے رہے، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر طوفان کا عذاب بھیج دیا، ارشاد فرمایا:۔

"فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ" یعنی نوح علیہ السلام کی ظالم قوم نے ان کی نصیحت وخیرخواہی کی کوئی پروا نہ کی اور برابر اپنی تکذیب پر جمے رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے نوح علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں کو ایک کشتی میں سوار کر کے طوفان سے نجات دی اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا ان کو غرق کر دیا، بے شک یہ لوگ اندھے ہورہے تھے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ اور اُن کی قوم کی غرقابی اور کشتی والوں کی نجات کی

پوری تفصیل سورۂ نوح اور سورۂ ہود میں آئے گی، اس جگہ بتقاضائے مقام اس کا خلاصہ بیان ہوا ہے حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: قومِ نوح پر طوفان کا عذاب اُس وقت آیا جبکہ وہ اپنی کثرت وقوّت کے اعتبار سے بھرپور تھے، عراق کی زمین اور اس کے پہاڑ اُن کی کثرت کے سبب تنگ ہو رہے تھے۔ اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا یہی دستور رہا ہے کہ نافرمان لوگوں کو ڈھیل دیتے رہتے ہیں، عذاب اُس وقت بھیجتے ہیں جب وہ اپنی کثرت، قوّت اور دولت میں انتہا کو پہنچ جائیں اور اس میں بدمست ہو جائیں۔ (ابنِ کثیر)

حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں کتنے آدمی تھے؟ اس میں روایات مختلف ہیں، ابنِ کثیرؒ نے بروایت ابنِ ابی حاتم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ اَسّی ۸۰ آدمی تھے جن میں ایک نام ''جُرہم'' تھا، یہ عربی زبان بولتا تھا۔ (ابنِ کثیر)

بعض روایات میں یہ تفصیل بھی آئی ہے کہ اَسّی ۸۰ کے عدد میں چالیس مرد اور چالیس عورتیں تھیں، طوفان کے بعد یہ سب حضرات موصل میں جس جگہ مقیم ہوئے اُس بستی کا نام ''ثمانون'' مشہور ہو گیا۔

غرض اس جگہ نوح علیہ السلام کا مختصر قصہ بیان فرما کر ایک تو یہ بتلا دیا کہ تمام انبیائے قدیم علیہم السلام کی دعوت اور اُصولِ عقائد ایک ہی تھے۔ دُوسرے یہ بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کی تائید وحمایت کس طرح حیرت انگیز طریقے پر کرتے ہیں کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ جانے والے طوفان میں بھی ان کی سلامتی کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ تیسرے یہ واضح کر دیا کہ انبیاء علیہم السلام کی تکذیب عذابِ اِلٰہی کو دعوت دینا ہے، جس طرح پچھلی اُمتیں تکذیبِ انبیاء کے سبب عذاب میں گرفتار ہو گئیں، آج کے لوگوں کو بھی اُس سے بے خوف نہیں ہونا چاہئے۔ (معارف القرآن ج:۳ ص:۵۹۰ تا۵۹۶)

***

''درج ذیل واقعہ داعی کو یہ سبق دیتا ہے کہ گالی کا جواب گالی سے نہیں دینا چاہئے ، دورانِ دعوت مخاطب کی دِل خراش اور اِشتعال انگیز باتوں پر غضب ناک ہونے کے بجائے نرمی اور سادہ لفظوں میں ان کے شبہات کا ازالہ کرنا چاہئے جس سے دعوت میں تاثیر پیدا ہونے کی قوی اُمید ہے، یہی درس باری تعالیٰ آنے والی آیاتِ مقدسہ میں بھی سکھلاتے ہیں۔''

ارشادِ ربانی

۳- وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ اِذْ اَرْسَلْنَآ
اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾
قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا
تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا
الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ
وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸﴾ قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ
اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ
اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَا
لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً
اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّيْٓ
اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾ (یٰسٓ)

ترجمہ:- اور بیان کر ان کے واسطے ایک مثال اس گاؤں کے لوگوں کی جبکہ آئے اس میں بھیجے ہوئے ، جب بھیجے ہم نے اُن کی طرف دو تو ان کو جھٹلایا ، پھر ہم نے قوت دی تیسرے سے ، تب کہا انہوں نے ہم تمہاری طرف آئے ہیں بھیجے ہوئے۔ وہ بولے تم تو یہی انسان ہو

جیسے ہم، اور رحمٰن نے کچھ نہیں اُتارا، تم سارے جھوٹ کہتے ہو۔ کہا ہمارا رَبّ جانتا ہے کہ ہم بے شک تمہاری طرف بھیجے ہوئے آئے ہیں، اور ہمارا ذمہ یہی ہے پیغام پہنچا دینا کھول کر۔ بولے ہم نے نامبارک دیکھا تم کو، اگر تم باز نہ رہو گے تو ہم تم کو سنگسار کریں گے اور تم کو پہنچے گا ہمارے ہاتھ سے عذاب دردناک۔ کہنے لگے تمہاری نامبارکی تمہارے ساتھ ہے، کیا اتنی بات پر کہ تم کو سمجھایا کوئی نہیں پر تم لوگ ہو کہ حد پر نہیں رہتے۔ اور آیا شہر کے پرلے سرے سے ایک مرد دوڑتا ہوا بولا: اے قوم! چلو راہ پر بھیجے ہوؤں کی، چلو راہ پر ایسے شخص کی جو تم سے بدلہ نہیں چاہتے اور وہ ٹھیک راستے پر ہیں۔ اور مجھ کو کیا ہوا کہ میں بندگی نہ کروں اس کی جس نے مجھ کو بنایا اور اسی کی طرف سب پھر جاؤ گے۔ بھلا میں پکڑوں اس کے سوائے اوروں کو پوجنا کہ اگر مجھ پر چاہے رحمٰن تکلیف تو کچھ کام نہ آئے مجھ کو ان کی سفارش اور نہ وہ مجھ کو چھڑائیں۔ تو تو میں بھٹکتا رہوں صریح۔ میں یقین لایا تمہارے رَبّ پر مجھ سے سن لو۔

خلاصۂ تفسیر

اور آپ ان (کفار) کے سامنے (اس غرض سے کہ رِسالت کی تائید اور ان کو اِنکارِ توحید و رِسالت پر تہدید ہو) ایک قصہ یعنی ایک بستی والوں کا قصہ اس وقت کا بیان کیجیے جبکہ اس بستی میں کئی رسول آئے یعنی جبکہ ہم نے اُن کے پاس (اوّل) دو کو بھیجا سو ان لوگوں نے اوّل دونوں کو جھوٹا بتلایا پھر تیسرے (رسول) سے (ان دونوں کی)

تائید کی (یعنی تائید کے لئے پھر تیسرے کو وہاں جانے کا حکم دیا) سو اُن تینوں نے (اُن بستی والوں سے) کہا کہ: ہم تمہارے پاس (خدا کی طرف سے) بھیجے گئے ہیں (تا کہ تم کو ہدایت کریں کہ توحید اِختیار کرو اور بت پرستی چھوڑ دو کیونکہ وہ لوگ بت پرست تھے، کما یدلّ علیہ قولہ تعالٰی: "وَمَالِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ" وقولہ: "ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً" الخ) ان لوگوں نے (یعنی بستی والوں نے) کہا کہ: تم تو ہماری طرح (محض) معمولی آدمی ہو (تم کو رسول ہونے کا امتیاز حاصل نہیں) اور (تمہاری کیا تخصیص ہے، مسئلۂ رِسالت ہی خود بے اصل ہے اور) خدائے رحمٰن نے (تو) کوئی چیز (کتاب و اَحکام کی قسم سے کبھی) نازل (ہی) نہیں کی، تم نرا جھوٹ بولتے ہو۔ اُن رسولوں نے کہا کہ: ہمارا پروردگار علیم ہے کہ بے شک ہم تمہارے پاس (بطور رسول کے) بھیجے گئے ہیں اور (اس قسم سے یہ مقصود نہیں کہ اسی سے اِثباتِ رِسالت کرتے ہیں، بلکہ بعد اِقامت دلائل کے بھی جب انہوں نے نہ مانا تب آخری جواب کے طور پر مجبور ہو کر قسم کھائی، جیسا آگے خود ان کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ) ہمارے ذمہ تو صرف واضح طور پر (حکم کا) پہنچا دینا تھا (چونکہ واضح ہونا اس پر موقوف ہے کہ دلائلِ واضحہ سے دعوے کو ثابت کر دیا جائے، اس سے معلوم ہوا کہ اوّل دلائل قائم کر چکے تھے، آخر میں قسم کھائی، غرض یہ کہ ہم اپنا کام کر چکے تم نہ مانو تو ہم مجبور ہیں)، وہ لوگ کہنے لگے کہ: ہم تو تم کو منحوس سمجھتے ہیں (یہ یا تو اس لئے کہا کہ ان پر قحط پڑا تھا (کما فی المعالم) اور یا اس لئے کہا کہ جب کوئی نئی بات سنی

جاتی ہے، گو لوگ اس کو قبول نہ کریں، مگر اس کا چرچا ضرور ہوتا ہے، اور اکثر عام لوگوں میں اس کی وجہ سے گفتگو اور اس گفتگو میں اختلاف اور کبھی نزاع و نااتفاقی کی نوبت پہنچ ہی جاتی ہے، پس مطلب یہ ہوگا کہ تمام لوگوں میں ایک فتنہ جھگڑا ڈال دیا، جس سے مضرتیں پہنچ رہی ہیں، یہ نحوست ہے، اور اس نحوست کے سبب تم ہو) اور اگر تم (اس دعوت اور دعوے سے) باز نہ آئے تو (یاد رکھو) ہم پتھروں سے تمہارا کام تمام کردیں گے اور (سنگساری سے پہلے بھی) تم کو ہماری طرف سے سخت تکلیف پہنچے گی (یعنی اور طرح طرح سے ستاویں گے، نہیں مانوگے تو اَخیر میں سنگسار کردیں گے)۔ اُن رسولوں نے کہا کہ: تمہاری نحوست تو تمہارے ساتھ ہی لگی ہوئی ہے (یعنی جس کو تم مضرت و مصیبت کہتے ہو اس کا سبب تو حق کا قبول نہ کرنا ہے، اگر حق قبول کرنے پر متفق ہوجاتے نہ یہ جھگڑے اور فتنے ہوتے، نہ قحط کے عذاب میں مبتلا ہوتے، رہا پہلا اتفاق بت پرستی پر تو ایسا اتفاق جو باطل پر ہو خود فساد و وبال ہے، جس کو چھوڑنا لازم ہے، اور اس زمانے میں قحط نہ ہونا وہ بطور اِستدراج کے اللہ کی طرف سے ڈھیل دی ہوئی تھی، یا اس وجہ سے تھا کہ اس وقت تک ان لوگوں پر حق واضح نہیں ہوا تھا، اور اللہ کا قانون ہے کہ حق کو واضح کرنے سے پہلے کسی کو عذاب نہیں دیتے، جیسا کہ ارشاد ہے کہ: "حَتّٰى یُبَیِّنَ لَهُمْ مَّا یَتَّقُوْنَ" اور یہ ڈھیل یا حق کا نہ ہونا بھی تمہاری ہی غفلت، جہالت اور شامتِ اعمال تھی، اس سے معلوم ہوا کہ ہر حال میں اس نحوست کا سبب خود تمہارا فعل تھا) کیا اس کو نحوست سمجھتے ہو کہ تم کو نصیحت کی

جاوے (جو بنیادِ سعادت ہے، یہ تو واقع میں نحوست نہیں، بلکہ تم (خود) حد (عقل و شرع) سے نکل جانے والے لوگ ہو (پس مخالفتِ شرع سے تم پر یہ نحوست آئی اور مخالفتِ عقل سے تم نے اس کا سبب غلط سمجھا)۔ اور (اس گفتگو کی خبر جو شائع ہوئی تو) ایک شخص (جو مسلمان تھا) اس شہر کے کسی دُور مقام سے (جو یہاں سے دُور تھا، یہ خبر سن کر اپنی قوم کی خیر خواہی کے لئے کہ ان رسولوں کا وجود قوم کی فلاح تھی، یا رسولوں کی خیر خواہی کے لئے کہ کہیں یہ لوگ اُن کو قتل نہ کر دیں) دوڑتا ہوا (یہاں) آیا (اور ان لوگوں سے) کہنے لگا کہ: اے میری قوم! ان رسولوں کی راہ پر چلو (ضرور) ایسے لوگوں کی راہ پر چلو جو تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتے، اور وہ خود راہِ راست پر بھی ہیں (یعنی خود غرضی جو مانعِ اتباع ہے، وہ بھی نہیں اور راہِ راست پر ہونا جو مقتضئ اتباع ہے وہ موجود ہے، پھر اِتباع کیوں نہ کیا جاوے) اور میرے پاس کونسا عذر ہے کہ میں اُس (معبود) کی عبادت نہ کروں جس نے مجھ کو پیدا کیا (جو کہ من جملہ) دلائل استحقاقِ عبادت کے ہے) اور (اپنے اُوپر رکھ کر اس لئے کہا کہ مخاطب کو اِشتعال نہ ہو جو کہ مانعِ تدبر ہو جاتا ہے اور اصل مطلب یہی ہے کہ تم کو ایک اللہ کی عبادت کرنے میں کونسا عذر ہے) تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے (اس لئے دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے رسولوں کا اتباع کرو، یہاں تک تو معبودِ حق کے اِستحقاقِ عبادت کا بیان کیا، آگے معبوداتِ باطلہ کے عدمِ استحقاقِ عبادت کا مضمون ہے یعنی) کیا میں خدا کو چھوڑ کر ایسے ایسے معبود قرار دے لوں (جن کی کیفیت

بے بسی کی یہ ہے) کہ اگر خدائے رحمٰن مجھ کو کچھ تکلیف پہنچانا چاہے تو
نہ اُن معبودوں کی سفارش میرے کچھ کام آوے گی اور نہ وہ مجھ کو
(خود اپنی قدرت و زور کے ذریعے اس تکلیف سے) چھڑا سکیں
(یعنی نہ وہ خود قادر ہیں، نہ قادر تک واسطۂ سفارش بن سکتے ہیں،
کیونکہ اوّل تو جمادات میں شفاعت کی اہلیت ہی نہیں، دُوسرے
شفاعت وہی کر سکتے ہیں جن کو اللہ کی طرف سے اجازت ہو اور)
اگر میں ایسا کروں تو صریح گمراہی میں جا پڑا (یہ بھی اپنے اُوپر رکھ کر
ان لوگوں کو سنانا ہے) میں تو تمہارے پروردگار پر اِیمان لا چکا سو تم
(بھی) میری بات سن لو (اور اِیمان لے آؤ)۔

پیغمبرانہ دعوت واصلاح کا طریقہ

اس بستی کی طرف جو تین رسول بھیجے گئے، انہوں نے مشرکین و کفار سے جس طرح خطاب کیا اور ان کی سخت و تلخ باتوں اور دھمکیوں کا جس طرح جواب دیا اسی طرح ان کی دعوت سے مسلمان ہونے والے حبیب نجار نے اپنی قوم سے جس طرح خطاب کیا، ان سب چیزوں کو ذرا مکرّر دیکھئے، تو اس میں تبلیغِ دِین اور اصلاحِ خلق کی خدمت انجام دینے والوں کے لئے بڑے سبق ہیں۔

ان رسولوں کی ناصحانہ تبلیغ وتلقین کے جواب میں مشرکین نے تین باتیں کہیں:-

۱-تم تو ہمیں جیسے انسان ہو، ہم تمہاری بات کیوں مانیں؟
۲-اللہ رحمٰن نے کسی پر کوئی پیغام اور کتاب نہیں اُتاری۔
۳-تم خالص جھوٹ بولتے ہو۔

آپ غور کیجئے کہ بے غرض ناصحانہ کلام کے جواب میں یہ اشتعال انگیز گفتگو کیا جواب چاہتی تھی، مگر ان رسولوں نے کیا جواب دیا، صرف یہ کہ: "رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّآ إِلَيْكُمْ

لَمُرۡسَلُوۡنَ" یعنی ہمارا ربّ جانتا ہے کہ ہم تمہاری طرف بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ اور "وَمَا عَلَيۡنَاۤ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ" یعنی ہمارا جو کام تھا وہ کر چکے کہ تمہیں اللہ کا پیغام واضح کر کے پہنچا دیا، آگے تمہیں اختیار ہے، مانو یا نہ مانو۔ دیکھئے ان کے کسی لفظ میں کیا ان کی اِشتعال انگیزی کا کوئی تأثر ہے؟ کیسا مشفقانہ جواب دیا۔

پھر ان لوگوں نے اور آگے بڑھ کر یہ کہا کہ تم لوگ منحوس ہو، تمہاری وجہ سے ہم مصیبت میں پڑ گئے، اس کا متعین جواب یہ تھا کہ منحوس تم خود ہو، تمہارے اعمال کی شامت تمہارے گلے میں آ رہی ہے، مگر ان رسولوں نے اس بات کو ایسے مجمل الفاظ میں ادا کیا جس میں ان کے منحوس ہونے کی تصریح نہیں فرمائی، بلکہ یہ فرمایا: "طَآئِرُكُمۡ مَّعَكُمۡ" یعنی تمہاری بدفالی تمہارے ساتھ ہے، اور پھر وہی مشفقانہ خطاب کیا: "اَئِنۡ ذُكِّرۡتُمۡ" یعنی تم یہ تو سوچو کہ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے، ہم نے تو صرف تمہیں خیرخواہانہ نصیحت کی ہے، بس سب سے بھاری جملہ جو بولا تو یہ کہ: "بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ مُّسۡرِفُوۡنَ" یعنی "تم لوگ حدود سے تجاوز کرنے والے ہو" بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہو۔

یہ تو ان رسولوں کا مکالمہ تھا، اب وہ مکالمہ دیکھئے جو ان رسولوں کی دعوت پر اِیمان لانے والے نومسلم نے کیا، اس نے پہلے تو اپنی قوم کو دو باتیں بتا کر رسولوں کی بات ماننے کی دعوت دی، اوّل یہ کہ ذرا یہ تو سوچو کہ یہ لوگ دُور سے چل کر تمہیں نصیحت کرنے آئے ہیں، سفر کی تکلیف اُٹھا رہے ہیں اور تم سے کچھ مانگتے نہیں، یہ بات خود اِنسان کو غور کی دعوت دیتی ہے کہ یہ بے غرض لوگ ہیں، اُن کی بات میں غور تو کرلیں۔ دُوسرے یہ کہ جو بات وہ کہہ رہے ہیں وہ سراسر عقل و انصاف اور ہدایت کی بات ہے، اس کے بعد قوم کو ان کی غلطی اور گمراہی پر متنبہ کرنا تھا کہ اپنے پیدا کرنے والے قادرِ مطلق کو چھوڑ کر تم لوگ خودتراشیدہ بتوں کو اپنا حاجت روا سمجھ بیٹھے ہو، جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ نہ وہ خود تمہارا کوئی کام بنا سکتے ہیں اور نہ اللہ کے یہاں ان کا کوئی مقام اور درجہ ہے کہ اس سے سفارش

کر کے تمہارا کام کرادیں۔

مگر حبیب نجار نے یہ ساری باتیں ان کی طرف منسوب کرنے کے بجائے اپنی طرف منسوب کرنے کا عنوان اختیار کیا کہ میں ایسا کروں تو بڑی گمراہی کی بات ہوگی، "وَمَا لِیَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ" الآیۃ یہ سب اس لئے کہ مخالف کو اشتعال نہ ہو، بات میں ٹھنڈے دِل سے غور کرے، پھر جب اس کی قوم نے اس کی شفقت و رحمت کا بھی کچھ اثر نہ لیا، اور ان کو قتل کرنے کے لئے ان پر پل پڑی تو اس وقت بھی اُن کی زبان پر کوئی بددُعا کا کلمہ نہ آیا، بلکہ یہی کہتے ہوئے جان دے دی کہ: "رَبِّ اهْدِ قَوْمِیْ" یعنی "میرے پروردگار! میری قوم کو ہدایت فرمادے" اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ قوم کے اس ظلم وستم سے شہید ہونے والے کو جب اللہ کی طرف سے اِنعام و اِکرام اور جنت کی نعمتوں کا مشاہدہ ہوا تو اس وقت بھی اپنی یہی ظالم قوم یاد آئی، اور اس کی خیرخواہی و ہمدردی سے یہ تمنا کی کہ کاش! میری قوم میرے حالاتِ اِنعام و اِکرام سے واقف ہوجاتی، تو شاید وہ بھی اپنی گمراہی سے باز آکر ان نعمتوں کی شریک بن جاتی۔ سبحان اللہ! خلق اللہ کی خیرخواہی ان کے مظالم کے باوجود کس طرح ان حضرات کی رَگ وپے میں پیوست ہوتی ہے، یہی وہ چیز تھی جس نے قوموں کی کایا پلٹی ہے، کفر وضلالت سے نکال کر وہ مقام بخشا ہے کہ فرشتے بھی اُن پر رشک کرتے ہیں۔

آج کل کے مبلغین اور خدمتِ دعوت واصلاح کے انجام دینے والوں نے عموماً اس پیغمبرانہ اُسوہ کو چھوڑ دیا ہے، اسی لئے ان کی دعوت وتبلیغ بے اثر ہوکر رہ گئی ہے، تقریر و خطاب میں غصّے کا اظہار، مخالف پر فقرے چست کرنا بڑا کمال سمجھا جاتا ہے، جو مخالف کو اور زیادہ ضد وعناد کی طرف دھکیل دیتا ہے، اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مُتَّبِعِیْنَ لِسُنَنِ اَنْبِیَآءِكَ وَوَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضَاهُ۔ (معارف القرآن ج:۷ ص:۳۷۷)

''ان آیات میں دعوت کا ایک اہم اُصول یہ بیان کیا گیا کہ داعی، ستانے اور لعن طعن کرنے والوں کے جواب میں صبر و تحمل سے کام لے اور انتہائی مشفقانہ لہجے میں ان کو راہِ ہدایت کی طرف بلائے۔ دُوسرا اہم اُصول یہ ذکر کیا گیا کہ کسی کی ذات پر گمراہی کا حکم نہ لگائے کہ ''تو گمراہ ہے، تجھ میں یہ گمراہی ہے'' بلکہ اشارہ و کنایہ سے گمراہی کی نشاندہی کرے۔''

ارشادِ ربانی

۴- قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿۸۸﴾ قَدِ
افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ۭ وَمَا
يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ۭ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ
عِلْمًا ۭ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۭ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ
الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا
اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۱﴾
الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ
الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۲﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ
نَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰي قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۹۳﴾ (الاعراف)

ترجمہ:- بولے سردار جو متکبر تھے اس کی قوم میں: ہم ضرور نکال دیں گے اے شعیب تجھ کو اور اُن کو جو کہ اِیمان لائے تیرے ساتھ اپنے شہر سے یا یہ کہ تم لوٹ آؤ ہمارے دِین میں، بولا: کیا ہم بیزار ہوں تو بھی۔ بے شک ہم نے بہتان باندھا اللہ پر جھوٹا اگر لوٹ آئیں تمہارے دِین میں بعد اس کے کہ نجات دے چکا ہم کو اللہ اس سے،

اور ہمارا کام نہیں کہ لوٹ آئیں اس میں مگر یہ کہ چاہے اللہ رَبّ ہمارا، گھیرے ہوئے ہے ہمارا پروردگار سب چیزوں کو اپنے علم میں، اللہ ہی پر ہم نے بھروسا کیا، اے ہمارے رَبّ فیصلہ کر ہم میں اور ہماری قوم میں انصاف کے ساتھ اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ اور بولے سردار جو کافر تھے اس کی قوم میں: اگر پیروی کرو گے تم شعیب کی تو تم بے شک خراب ہوگے۔ پھر آ پکڑا اُن کو زلزلے نے پس صبح کو رہ گئے اپنے گھروں کے اندر اوندھے پڑے، جنھوں نے جھٹلایا شعیب کو گویا کبھی بسے ہی نہ تھے وہاں، جنھوں نے جھٹلایا شعیب کو وہی ہوئے خراب۔ پھر اُلٹا پھرا اُن لوگوں سے اور بولا: اے میری قوم! میں پہنچا چکا تم کو پیغام اپنے رَبّ کے اور خیر خواہی کر چکا تمہاری، اب کیا افسوس کروں کافروں پر۔

خلاصۂ تفسیر

ان کی قوم کے متکبر سرداروں نے (جو یہ باتیں سنیں تو انہوں نے گستاخانہ) کہا کہ: اے شعیب! (یاد رکھئے) ہم آپ کو اور آپ کے ہمراہ جو اِیمان والے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال دیں گے یا یہ ہو کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آ جاؤ (تو البتہ ہم کچھ نہ کہیں گے، یہ بات مؤمنین کے لئے اس لئے کہی کہ وہ لوگ قبل ایمان کے اسی طریقِ کفر پر تھے، لیکن شعیب علیہ السلام کے حق میں باوجود اس کے کہ انبیاء سے کبھی کفر صادر نہیں ہوتا اس لئے کہی کہ ان کے سکوت قبلِ بعثت سے وہ یہ ہی سمجھتے تھے کہ ان کا اعتقاد بھی ہم ہی جیسا ہوگا) شعیب (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ: کیا ہم تمہارے مذہب میں آ جائیں گے گو ہم (بدلیل وبصیرت) اس کو مکروہ (اور قابلِ نفرت) ہی سمجھتے ہوں (یعنی جب اس کے باطل

ہونے پر دلیل قائم ہے تو ہم کیسے اس کو اختیار کر لیں) ہم تو اللہ پر بڑی جھوٹی تہمت لگانے والے ہو جائیں اگر (خدانہ کرے) ہم تمہارے مذہب میں آجائیں (خصوصاً) بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس سے نجات دی ہو (کیونکہ اوّل تو مطلقاً کفر کو دِینِ حق سمجھنا یہی اللہ پر تہمت لگانا ہے کہ یہ دِین معاذ اللہ، اللہ کو پسند ہے، خصوصاً مؤمن کا کافر ہونا چونکہ بعد علم وقبول دلیلِ حق کے ہے اور زیادہ تہمت ہے، ایک تو وہی تہمت، دُوسری وہ تہمت کہ اللہ نے جو مجھ کو دلیل کا علم دیا تھا جس کو میں حق سمجھتا تھا وہ علم غلط دیا تھا اور شعیب علیہ السلام نے لفظ ''عود'' یا تو تغلیباً دُوسروں کے اعتبار سے یا ان کے گمان کو فرض کر کے یا مشاکلۃً برتا) اور ہم سے ممکن نہیں کہ تمہارے مذہب میں پھر آجائیں لیکن ہاں! یہ کہ اللہ ہی نے جو ہمارا مالک ہے (ہمارے) مقدّر (میں) کیا ہو (جس کی مصلحت انہی کے علم میں ہے تو خیر اور بات ہے) ہمارے رَبّ کا علم ہر چیز کو محیط ہے (اس علم سے سب مقدّرات کے مصالح کو جانتے ہیں مگر) ہم اللہ ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں (اور بھروسہ کر کے یہ اُمید کرتے ہیں کہ وہ ہم کو دِینِ حق پر ثابت رکھے، اور اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ان کو اپنے خاتمہ بالخیر کا یقین نہ تھا، انبیاء کو یہ یقین دیا جاتا ہے، بلکہ مقصود اِظہارِ عجز اور تفویض الی المالک ہے جو کہ لوازم کمالِ نبوّت سے ہے، اور دُوسرے مؤمنین کے اعتبار سے لیا جائے تو کوئی اِشکال ہی نہیں، یہ جواب دے کر جب دیکھا کہ ان سے خطاب کرنا بالکل مؤثر نہیں اور ان کے ایمان لانے کی بالکل اُمید نہیں، ان سے خطاب ترک کر کے حق تعالیٰ سے دُعا کی کہ) اے ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہماری (اس) قوم کے درمیان فیصلہ کر دیجئے (جو کہ ہمیشہ) حق کے موافق (ہوا کرتا ہے کیونکہ خدائی فیصلے کا حق ہونا لازم ہے، یعنی اب عملی طور پر حق کا حق اور باطل کا باطل ہونا واضح کر دیجئے) اور آپ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے ہیں، اور ان کی قوم کے (انہی مذکور) کافر سرداروں نے (شعیب علیہ السلام کی یہ تقریرِ بلیغ سن کر اندیشہ کیا کہ کہیں سامعین پر اس کا اثر نہ ہو جائے اس لئے انہوں نے بقیہ کفار سے) کہا کہ: اگر تم

شعیب (علیہ السلام) کی راہ چلنے لگو گے تو بے شک بڑا نقصان اُٹھاؤ گے (دِین کا بھی کیونکہ ہمارا مذہب حق ہے، حق کو چھوڑنا خسارہ ہے، اور دُنیا کا بھی اس لئے کہ پورا ناپنے تولنے میں بچت کم ہوگی، غرض وہ سب اپنے کفر وظلم پر جمے رہے، اب عذاب کی آمد ہوئی) پس ان کو زلزلے نے پکڑا، سو اپنے گھر میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے، جنھوں نے شعیب (علیہ السلام) کی تکذیب کی تھی (اور مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالنے کو آمادہ تھے خود) ان کی یہ حالت ہوگئی جیسے ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے، جنھوں نے شعیب (علیہ السلام) کی تکذیب کی تھی (اور ان کے اِتباع کرنے والے کو خاسر بتلاتے تھے، خود) وہی خسارے میں پڑ گئے، اس وقت شعیب (علیہ السلام) ان سے منہ موڑ کر چلے اور (بطور حسرت کے فرضی خطاب کر کے) فرمانے لگے کہ: اے میری قوم! میں نے تو تم کو اپنے پروردگار کے اَحکام پہنچادیئے تھے (جن پر عمل کرنا ہر طرح کی فلاح کا سبب تھا) اور میں نے تمہاری (بڑی) خیرخواہی کی (کہ کس کس طرح سمجھایا گیا، مگر افسوس تم نے نہ مانا اور یہ روزِ بد دیکھا، پھر ان کے عناد و کفر وغیرہ کو یاد کر کے فرمانے لگے کہ: جب انہوں نے اپنے ہاتھوں یہ مصیبت خریدی تو) پھر میں ان کافر لوگوں (کے ہلاک ہونے) پر کیوں رنج کروں۔

معارف ومسائل

شعیب علیہ السلام سے جب اُن کی قوم نے یہ کہا کہ اگر آپ حق پر ہوتے تو آپ کے ماننے والے پھلتے پھولتے اور نہ ماننے والوں پر عذاب آتا، مگر ہو یہ رہا ہے کہ دونوں فریق برابر درجے میں آرام کی زندگی گزار رہے ہیں، تو ہم آپ کو کیسے سچا مان لیں۔ اس پر حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ: جلدبازی نہ کرو، عنقریب اللہ تعالیٰ ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ فرمادیں گے۔ اس پر قوم کے متکبر سرداروں نے وہی بات کہی جو ہمیشہ ظالم متکبر کہا کرتے ہیں کہ اے شعیب! یا تو تم اور جو لوگ تم پر اِیمان لائے ہیں وہ سب

ہمارے مذہب میں واپس آجاؤ، ورنہ ہم تم سب کو اپنی بستی سے نکال دیں گے۔

ان کے مذہب میں واپس آنا قومِ شعیب کے مؤمنین کے متعلق تو اس لئے صادق ہے کہ وہ سب پہلے اُنہیں کے مذہب اور طریقے پر تھے، پھر شعیب علیہ السلام کی دعوت پر مسلمان ہو گئے، مگر حضرت شعیب علیہ السلام تو ایک دن بھی اُن کے باطل مذہب وطریقے پر نہ رہے تھے، اور نہ کوئی اللہ تعالیٰ کا پیغمبر کبھی کسی مشرکانہ باطل مذہب کی پیروی کر سکتا ہے تو پھر اُن کے لئے یہ کہنا کہ ہمارے مذہب میں واپس آجاؤ، غالباً اس وجہ سے تھا کہ نبوّت عطا ہونے سے پہلے حضرت شعیب علیہ السلام ان لوگوں کے باطل اقوال واعمال پر سکوت فرماتے تھے اور قوم کے اندر رَلے ملے رہتے تھے، اس کے سبب اُن کا خیال حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں بھی یہ تھا کہ وہ بھی ہمارے ہی ہم خیال اور ہمارے مذہب کے پیرو ہیں۔ دعوتِ ایمان کے بعد اُن کو معلوم ہوا کہ اُن کا مذہب ہم سے مختلف ہے اور خیال کیا کہ یہ ہمارے مذہب سے پھر گئے، حضرت شعیب علیہ السلام نے جواب دیا: ''اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ'' یعنی کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ تمہارے مذہب کو ناپسند اور باطل سمجھنے کے باوجود ہم تمہارے مذہب میں داخل ہو جائیں۔ اور مراد اس سے یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، یہاں تک پہلی آیت کا مضمون ہے۔

دُوسری آیت میں ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ: تمہارے باطل مذہب سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں نجات دے دی، اس کے بعد اگر ہم تمہارے مذہب میں واپس ہو جائیں تو یہ ہماری طرف سے اللہ تعالیٰ پر سخت جھوٹا بہتان ہوگا۔

کیونکہ اوّل تو خود کفر وشرک کو مذہب بنانا ہی یہ معنی رکھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، جو اُس پر اِفتراء اور بہتان ہے، اس کے علاوہ اِیمان لانے اور علم وبصیرت حاصل ہونے کے بعد پھر کفر کی طرف لوٹنا گویا یہ کہنا ہے کہ پہلا طریقہ باطل اور غلط تھا، حق اور صحیح وہ طریق ہے جس کو اَب اختیار کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دُہرا جھوٹ اور بہتان ہے کہ حق کو

باطل کہا اور باطل کو حق کہا۔

حضرت شعیب علیہ السلام کے اس قول میں ایک قسم کا دعویٰ تھا کہ ہم اب تمہارے مذہب میں پھر واپس نہیں ہو سکتے، اور ایسا دعویٰ کرنا بظاہر عبدیت کے خلاف ہے جو مقرّبانِ بارگاہِ اِلٰہی اور اہلِ معرفت کی شایانِ شان نہیں، اس لئے فرمایا: "مَا يَكُونُ لَنَآ أَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ إِلَّآ أَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ۚ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۚ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ" یعنی ہم تمہارے مذہب میں ہرگز واپس نہیں ہو سکتے بجز اس کے کہ (خدانخواستہ) ہمارے پروردگار ہی کی مشیت وارادہ ہماری گمراہی کا ہو جائے، ہمارے رَبّ کا علم ہر چیز کو محیط ہے، ہم نے اُسی اللہ پر بھروسہ کیا ہے۔

اس میں اپنے عجز وضعف کا اِظہار اور اللہ تعالیٰ پر توکل وتفویض ہے جو کمالاتِ نبوّت میں سے ہے کہ ہم کیا ہیں جو کسی کام کے کرنے یا اُس سے بچنے کا دعویٰ کر سکیں، کسی نیکی کا کرنا یا بُرائی سے بچنا سب اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے ہے، جیسا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لو لا الله ما اهتدينا ولا تصدقنا ولا صلّينا"، یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو ہم کو صحیح راستے کی ہدایت نہ ہوتی، اور نہ ہم صدقہ خیرات کر پاتے، نہ نماز پڑھ سکتے۔

یہاں تک کہ قوم کے متکبر سرداروں سے گفتگو کرنے کے بعد جب حضرت شعیب علیہ السلام کو یہ اندازہ ہوا کہ ان لوگوں پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو اَب ان کو خطاب چھوڑ کر اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کی: "رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ" یعنی اے ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ کر دیجئے حق کے موافق اور آپ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ لفظ "فتح" کے معنی اس جگہ فیصلہ کرنے کے ہیں، اسی معنی سے "فاتح" بمعنی قاضی آتا ہے (بحرِ محیط)۔

اور درحقیقت ان الفاظ سے حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم میں سے کفار

کے لئے ہلاکت کی دُعا کی تھی، جس کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرما کر ان لوگوں کو زلزلے کے ذریعے ہلاک کر دیا۔ دُوسری آیت کا مضمون ختم ہوا۔

تیسری آیت میں حضرت شعیب علیہ السلام کے قوم کے متکبر سرداروں کا ایک گمراہ کن قول یہ نقل کیا ہے کہ وہ آپس میں کہنے لگے یا اپنے پیرووں سے کہنے لگے کہ: اگر تم نے شعیب کا اتباع کیا تو تم بڑے بے وقوف جاہل ٹھہرو گے (بحرِ محیط عن عطاء)۔

چوتھی آیت میں اس سرکش قوم کے عذاب کا واقعہ اس طرح ذکر فرمایا: "فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ" یعنی اُن کو سخت اور عظیم زلزلے نے آ پکڑا جس سے وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

قومِ شعیب کا عذاب اس آیت میں زلزلے کو بتلایا ہے، اور دُوسری آیات میں "فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ" آیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اُن کو "يَوْمِ الظُّلَّةِ" کے عذاب نے پکڑ لیا۔ "يَوْمِ الظُّلَّةِ" کے معنی ہیں سایہ کا دن، جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اُن پر گہرے بادل کا سایہ آیا، جب سب اس کے نیچے جمع ہو گئے تو اسی بادل سے اُن پر پتھر یا آگ برسائی گئی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان دونوں آیتوں میں تطبیق کے لئے فرمایا کہ: شعیب علیہ السلام کی قوم پر اوّل تو ایسی سخت گرمی مسلط ہوئی جیسے جہنم کا دروازہ ان کی طرف کھول دیا گیا ہو، جس سے ان کا دَم گھٹنے لگا، نہ کسی سایہ میں چین آتا تھا، نہ پانی میں، یہ لوگ گرمی سے گھبرا کر تہ خانوں میں گھس گئے، تو وہاں اُوپر سے بھی زیادہ سخت گرمی پائی، پریشان ہو کر شہر سے جنگل کی طرف بھاگے، وہاں اللہ تعالیٰ نے ایک گہرا بادل بھیج دیا جس کے نیچے ٹھنڈی ہوا تھی، یہ سب لوگ گرمی سے بدحواس تھے، دوڑ دوڑ کر اس بادل کے نیچے جمع ہو گئے، اس وقت یہ سارا بادل آگ ہو کر ان پر برسا، اور زلزلہ بھی آیا جس سے یہ سب لوگ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئے، اس طرح اس قوم پر زلزلہ اور عذابِ ظلہ دونوں جمع

ہوگئے (بحرِ محیط)۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ قومِ شعیب کے مختلف حصے ہوکر بعض پر زلزلہ آیا اور بعض عذابِ ظلہ سے ہلاک کئے گئے ہوں۔

پانچویں آیت میں قومِ شعیب کے واقعے سے دُوسروں کو عبرت کا سبق دیا گیا ہے، جو اس واقعے کے بیان کا اصل مقصود ہے، فرمایا: "اَلَّذِیْنَ کَذَّبُوْا شُعَیْبًا کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا" لفظ "غِنی" کے ایک معنی کسی مقام میں خوش عیشی کے ساتھ بسر کرنے کے بھی آتے ہیں، اس جگہ یہی معنی مراد ہیں، مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جن مکانات میں آرام وعیش کی زندگی گزارتے تھے، اس عذاب کے بعد ایسے ہوگئے کہ گویا کبھی یہاں آرام وعیش کا نام ہی نہ تھا۔ پھر فرمایا: "اَلَّذِیْنَ کَذَّبُوْا شُعَیْبًا کَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِیْنَ" یعنی جن لوگوں نے شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا وہی لوگ خسارے میں پڑے، اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ لوگ حضرت شعیب علیہ السلام اور اُن کے مؤمن ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال دینے کی دھمکیاں دے رہے تھے، انجامِ کار خسارہ انہیں پر پڑا۔

چھٹی آیت میں فرمایا: "فَتَوَلّٰی عَنْهُمْ" یعنی قوم پر عذاب آتا ہوا دیکھ کر شعیب علیہ السلام اور اُن کے ساتھ یہاں سے چل دیئے، جمہور مفسرین نے فرمایا کہ یہ حضرات یہاں سے مکہ معظّمہ آگئے اور پھر آخر تک یہیں قیام رہا۔

قوم کی انتہائی سرکشی اور نافرمانی سے مایوس ہوکر شعیب علیہ السلام نے بددُعا تو کردی، مگر جب اس کے نتیجے میں قوم پر عذاب آیا تو پیغمبرانہ شفقت ورحمت کے سبب دِل دُکھا تو اپنے دِل کو تسلی دینے کے لئے قوم کو خطاب کرکے فرمایا کہ: میں نے تو تم کو تمہارے رَبّ کے اَحکام پہنچادیئے تھے اور تمہاری خیرخواہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا، مگر میں کافر قوم کا کہاں تک غم کروں۔ (معارف القرآن ج:۳ ص:۶۲۸)

ارشادِ ربانی

۵- قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ⑪ (الزخرف)

ترجمہ:- تو کہہ اگر ہو رحمٰن کے واسطے اولاد، تو میں سب سے پہلے پوجوں۔

خلاصۂ تفسیر

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان مشرکین سے) کہئے کہ (تم جو اپنے بعض مشرکانہ اقوال میں حق تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہو تو) اگر (بفرضِ محال ایسا ہو، یعنی) خدائے رحمٰن کے اولاد ہو تو سب سے اوّل اس کی عبادت کرنے والا میں ہوں (جس طرح تم فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھ کر ان کی عبادت کرتے ہو، اسی طرح میں بھی اُس صورت میں خدا کی اولاد کی عبادت کرتا، مطلب یہ کہ مجھ کو تمہاری طرح حق بات کے ماننے سے انکار نہیں، تم اگر ثابت کر دو تو سب سے پہلے میں اس کو مانوں، اور جب اس کو خدا کی اولاد مان لوں تو چونکہ خدا کی اولاد بھی خدا ہی ہونی چاہئے اور خدا مستحقِ عبادت ہے، اس لئے میں اس کی عبادت بھی کروں، مگر چونکہ یہ اَمر باطلِ محض ہے، اس لئے نہ میں مانوں گا اور نہ عبادت کروں گا)۔

"اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ" (اگر خدائے رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرتا) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ خدا کی اولاد ہونے کا کسی بھی درجے میں کوئی امکان ہے، بلکہ مقصد دراصل یہ بتانا ہے کہ میں تمہارے عقائد کا انکار کسی عناد یا ہٹ دھرمی سے نہیں کر رہا ہوں بلکہ دلائل کی وجہ سے کر رہا ہوں، اگر صحیح دلائل سے خدا کی اولاد کا وجود ثابت ہو جاتا تو میں اُسے ضرور مان لیتا، لیکن عقل و نقل کی ہر دلیل اس کی تردید کرتی ہے، اس لئے ماننے کا کوئی سوال نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ

باطل کے ساتھ مباحثے کے وقت اپنی حق پسندی جتلانے کے لئے یہ کہنا جائز اور مناسب ہے کہ اگر تمہارا دعویٰ صحیح دلائل کے ساتھ ثابت ہوتا تو میں اُسے تسلیم کر لیتا، کیونکہ بعض اوقات اس اندازِ کلام سے مخالف کے دِل میں ایسی نرمی پیدا ہوسکتی ہے جو اُسے قبولِ حق پر آمادہ کردے۔ (معارف القرآن ج:۷ ص:۲۵۳)

"یہ آیتِ کریمہ مناظرین کو یہ اُصول فراہم کرتی ہے کہ دورانِ مناظرہ اپنی حق پسندی کو باور کرانے کے لئے یہ کہنا جائز ہے کہ "اگر تمہاری بات دلائلِ صحیحہ،قویہ سے ثابت ہوتی تو میں اسے تسلیم کر لیتا" حکمت اس کی یہ ہے کہ اس طرح کہنے سے مخالفین کے دِل میں بغض وعناد ختم ہوجاتا ہے اور نرمی پیدا ہوتی ہے، جو قبولیتِ حق کی پہلی سیڑھی ہے، اسی طرح کے دیگر آداب اگلی آیتِ مبارکہ میں ذکر کئے گئے ہیں۔"

مناظرے میں مخاطب کی نفسیات کی رعایت

ارشادِ ربانی

۱- قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ (سورۂ سبا)

ترجمہ:- تو کہہ کون روزی دیتا ہے تم کو آسمان سے اور زمین سے بتلادے کہ اللہ، اور ہم یا تم بے شک ہدایت پر ہیں یا پڑے ہیں گمراہی میں صریح۔

خلاصۂ تفسیر

اور آپ (ان سے تحقیقِ توحید کے لئے یہ بھی) پوچھئے کہ تم کو آسمان وزمین سے (پانی برسا کر اور نباتات نکال کر) کون روزی دیتا ہے (چونکہ اس کا جواب ان کے نزدیک

ہی متعین ہے، اس لئے) آپ (ہی) کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ (روزی دیتا ہے) اور (یہ بھی کہئے کہ اس مسئلۂ توحید میں) بے شک ہم یا تم ضرور راہِ راست پر ہیں یا صریح گمراہی میں (یعنی یہ تو ہو نہیں سکتا کہ دو متضاد چیزیں توحید اور شرک دونوں صحیح اور حق ہوں، اور دونوں طرح کے عقیدے رکھنے والے اہلِ حق ہوں، بلکہ ضروری ہے کہ ان دونوں عقیدوں میں سے ایک صحیح، دُوسرا غلط ہو، صحیح عقیدے کے رکھنے والے ہدایت پر اور غلط کا عقیدہ رکھنے والے گمراہی پر ہوں گے، اب تم غور کرلو کہ ان میں سے کونسا عقیدہ صحیح ہے اور کون حق وہدایت پر ہے کون گمراہی پر)۔

"وَإِنَّآ أَوْ إِيَّاكُمْ لَعَلَىٰ هُدًى أَوْ فِي ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ" یہ مشرکین و کفار کے ساتھ خطاب ہے، دلائلِ واضحہ سے اللہ تعالیٰ کا خالق و مالک ہونا اور قادرِ مطلق ہونا واضح کردیا گیا، بتوں اور غیر اللہ کی بے بسی اور کمزوری کا مشاہدہ کرادیا گیا، ان سب باتوں کے بعد موقع اس کا تھا کہ مشرکین کو خطاب کرکے کہا جاتا کہ تم جاہل اور گمراہ ہو کہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں اور شیاطین کی پرستش کرتے ہو، مگر قرآنِ حکیم نے اس جگہ جو حکیمانہ عنوان اختیار فرمایا وہ دعوت وتبلیغ اور مخالفینِ اسلام اور اہلِ باطل سے بحث ومناظرہ کرنے والوں کے لئے ایک اہم ہدایت نامہ ہے کہ اس آیت میں ان کو کافر و گمراہ کہنے کے بجائے عنوان یہ رکھا کہ ان دلائلِ واضحہ کی روشنی میں یہ تو کوئی سمجھ دار آدمی کہہ نہیں سکتا کہ توحید وشرک دونوں باتیں حق ہیں، اور اہلِ توحید اور مشرک دونوں حق پرست ہیں، بلکہ یقینی ہے کہ ان دونوں میں سے ایک حق پر، دُوسرا گمراہی پر ہے، اب تم خود سوچ لو اور فیصلہ کرلو کہ ہم حق پر ہیں یا تم؟ مخاطب کو خود کافر وگمراہ کہنے سے اس کو اِشتعال ہوتا، اس سے گریز کیا گیا، اور ایسا مشفقانہ عنوان اختیار کیا کہ سنگ دِل مخالف بھی غور کرنے پر مجبور ہوجائے۔ (از قرطبی و بیان القرآن)

یہ پیغمبرانہ دعوت وموعظت اور مجادلة بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ کا طریقہ جو علماء کو ہر وقت پیشِ نظر رکھنا چاہئے، اس کے نظر انداز ہونے ہی سے دعوت وتبلیغ اور بحث ومناظرہ

بے اثر بلکہ مضر ہوکر رہ جاتا ہے، مخالفین ضد پر آجاتے ہیں، ان کی گمراہی اور پختہ ہوجاتی ہے۔ (معارف القرآن ج:۷ ص:۲۹۲)

''بحث و مناظرے کا ایک اہم اُصول جو اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کو دورانِ مناظرہ ایسے واضح دلائل پیش کرنے چاہئیں کہ مخاطب جن کی قوت وصحت کی تردید نہ کر سکے، مگر ساتھ ساتھ داعی کا اپنا لب ولہجہ شفیقانہ اور مٹھاس والا ہونا چاہئے تاکہ مخاطب خود داعی کے لب ولہجہ اور دلائل ہی پر غور کر کے حق وباطل کے درمیان فرق کر سکے۔''

ارشادِ ربانی

۲۔ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ (الانعام)

ترجمہ:- اور تم لوگ بُرا نہ کہو اُن کو جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا، پس وہ بُرا کہنے لگیں گے اللہ کو بے ادبی سے بدون سمجھے، اسی طرح ہم نے مزین کر دیا ہر ایک فرقے کی نظر میں ان کے اعمال کو، پھر ان سب کو اپنے رَبّ کے پاس پہنچنا ہے، تب وہ جتلا دے گا ان کو جو کچھ وہ کرتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

اور دُشنام مت دو ان (معبودانِ باطلہ) کو جن کی یہ (مشرک) لوگ خدا (کی توحید) کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں، کیونکہ (تمہارے ایسا کرنے سے) پھر وہ براہِ جہل حد سے گزر کر (یعنی غصّے میں آکر) اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کریں گے (اور اس کا تعجب نہ کیا جائے کہ ایسی گستاخی کرنے والوں کو ساتھ کے ساتھ سزا کیوں نہیں مل جاتی، کیونکہ) ہم نے (دُنیا میں تو) اسی طرح (جیسا ہو رہا ہے) ہر طریقے والوں کو ان کا عمل

(بھلا ہو یا بُرا ہو) مرغوب بنا رکھا ہے (یعنی ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں کہ ہر ایک کو اپنا طریقہ پسند ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ عالم اصل میں ابتلاء و امتحان کا ہے، پس اس میں سزا ضرور نہیں) پھر (البتہ اپنے وقت پر) اپنے رَبّ ہی کے پاس ان (سب) کو جانا ہے، سو (اس وقت) وہ ان کو جتلا دے گا جو کچھ بھی وہ (دُنیا میں) کیا کرتے تھے (اور مجرمین کو سزا دیدے گا)۔

"وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ" یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان بتوں کو بُرا نہ کہیں جن کو ان لوگوں نے خدا بنا رکھا ہے، جس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کو بُرا کہنے لگیں اپنی بے راہ روی اور بے سمجھی سے۔

اس میں "لَا تَسُبُّوا" لفظ "سَبّ" سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں گالی دینا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے فطری اخلاق کی بنا پر پہلے ہی اس کے پابند تھے، کبھی بچپن میں بھی کسی انسان بلکہ کسی جانور کے لئے بھی گالی کا لفظ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر جاری نہیں ہوا، ممکن ہے بعض صحابہ کرامؓ کی زبان سے کبھی کوئی سخت کلمہ نکل بھی گیا ہو، جس کو مشرکینِ مکہ نے گالی سے تعبیر کیا اور قریشی سرداروں کے اس وفد نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس معاملے کو رکھ کر یہ اعلان کر دیا کہ آپ ہمارے بتوں کو سبّ وشتم کرنے سے باز نہ آئیں گے تو ہم آپ کے خدا کو سبّ وشتم کریں گے۔

اس پر قرآنی حکم یہ نازل ہوا، جس کے ذریعے مسلمانوں کو روک دیا گیا کہ وہ مشرکین کے معبوداتِ باطلہ کے متعلق کوئی سخت کلمہ نہ کہا کریں، اس آیت میں یہ بات خاص طور سے قابلِ نظر ہے کہ اس سے پہلی آیت میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہو رہا تھا، مثلاً ارشاد ہے: "اِتَّبِعْ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ" اور "اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ" اور "مَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا" اور "مَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ" ان تمام صیغوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کریں یا ایسا نہ کریں، اس کے بعد اِس آیت میں طرزِ خطاب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پھیر کر عام مسلمانوں کی طرف کر دیا

گیا، فرمایا: "لَا تَسُبُّوا" اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کبھی کسی کو گالی دی ہی نہیں تھی، ان کو براہِ راست اس کلام کا مخاطب بنانا ان کی دِل شکنی کا سبب ہوسکتا ہے، اس لئے خطاب عام کردیا گیا، اور تمام صحابہ کرامؓ بھی اس میں احتیاط فرمانے لگے۔ (کذا فی البحر المحیط)

رہا یہ معاملہ کی قرآنِ کریم کی بہت سی آیات میں بتوں کا تذکرہ سخت الفاظ میں آیا ہے، اور وہ آیات منسوخ بھی نہیں، ان کی تلاوت اب بھی ہوتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی میں جہاں کہیں ایسے الفاظ آئے ہیں وہ بطور مناظرہ کسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے وارِد ہوئے ہیں، وہاں کسی کی دِل آزاری نہ پیشِ نظر ہے، اور نہ کوئی سمجھ دار اِنسان ان سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اس میں بتوں کو بُرا کہنا یا مشرکین کو چڑانا منظور ہے، اور یہ ایک ایسا کھلا ہوا فرق ہے جس کو ہر زبان کے اہلِ محاورہ بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ کبھی کسی شخص کا کوئی عیب یا بُرائی کسی مسئلے کی تنقیح کے لئے ذکر کی جاتی ہے، جیسے عام طور پر عدالتوں میں ہر روز سامنے آتا رہتا ہے، لیکن عدالت کے سامنے ہونے والے بیان کو دُنیا میں کوئی آدمی یہ نہیں کہتا کہ فلاں نے فلاں کو گالی دی ہے، اسی طرح ڈاکٹروں اور حکیموں کے سامنے انسان کے بہت سے ایسے عیب بیان کئے جاتے ہیں کہ ان کو دُوسری جگہ اور دُوسری طرح کوئی بیان کرے گا تو گالی سمجھی جائے، لیکن بغرضِ علاج ان کے بیان کرنے کو کوئی گالی دینا نہیں کہتا۔

اسی طرح قرآنِ کریم نے جابجا بتوں کے بے حس و بے شعور اور بے علم و قدرت اور بے بس ہونے کو اس پیرایہ میں بیان فرمایا ہے کہ سمجھنے والے حقیقت کو سمجھ لیں اور نہ سمجھنے والوں کی غلطی یا کوتاہ نظری واضح ہوجائے، جس کے نتیجے میں ارشاد ہوا ہے: "ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ" یعنی یہ بت بھی کمزور ہیں اور ان کے چاہنے والے بھی کمزور، یا یہ ارشاد ہوا ہے: "اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ" یعنی تم اور جن بتوں کی تم عبادت کرتے ہو وہ سب جہنم کا ایندھن ہیں۔ یہاں بھی کسی کو بُرا بھلا کہنا مقصود نہیں، گمراہی اور

غلطی کا انجام بد بیان کرنا مقصود ہے، اور فقہاء رحمہم اللہ نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص اس آیت کو بھی مشرکین کی چڑانے کے سبب سے پڑھے تو اس کے لئے اس وقت یہ تلاوت کرنا بھی سبِ ممنوع میں داخل اور ناجائز ہے، جیسے مواضعِ مکروہہ میں تلاوتِ قرآن کا ناجائز ہونا سب کو معلوم ہے۔ (رُوح المعانی)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک اور قرآنِ کریم میں تو نہ پہلے کبھی ایسا کلام آیا تھا جس کو لوگ گالی سمجھیں، اور نہ آئندہ آنے کا کوئی خطرہ تھا، ہاں! مسلمانوں سے اس کا اِمکان تھا، ان کو اس آیت نے ایسا کرنے سے روک دیا۔

اس واقعہ اور اس پر قرآنی ہدایت نے ایک بڑے علم کا دروازہ کھول دیا اور چند اُصولی مسائل اس سے نکل آئے۔

گناہ کا سبب بننا بھی گناہ ہے

مثلاً ایک اُصول یہ نکل آیا کہ جو کام اپنی ذات کے اعتبار سے جائز بلکہ کسی درجے میں محمود بھی ہو مگر اس کے کرنے سے کوئی فساد لازم آتا ہو، یا اس کے نتیجے میں لوگ مبتلائے معصیت ہوتے ہوں، وہ کام بھی ممنوع ہو جاتا ہے، کیونکہ معبوداتِ باطلہ یعنی بتوں کو بُرا کہنا کم از کم جائز تو ضرور ہے اور اِیمانی غیرت کے تقاضے سے کہا جائے تو شاید اپنی ذات میں ثواب اور محمود بھی ہو، مگر چونکہ اس کے نتیجے میں یہ اندیشہ ہو گیا کہ لوگ اللہ جل شانہٗ کو بُرا کہیں گے تو بتوں کو بُرا کہنے والے اس بُرائی کا سبب بن جائیں گے، اس لئے اس جائز کام کو بھی منع کر دیا گیا۔

اس کی ایک اور مثال بھی حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ: کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی نہ دے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ تو کسی شخص سے ممکن ہی نہیں کہ اپنے ماں باپ کو گالی دے، فرمایا کہ: ہاں! انسان خود تو ان کو گالی نہیں دیتا، لیکن جب وہ کسی دُوسرے شخص کے

ماں باپ کوگالی دے اوراس کے نتیجے میں وہ دُوسرا شخص اس کے ماں باپ کوگالی دے، تو اس گالی دِلوانے کا سبب یہ بیٹا بنا، تو یہ بھی ایسا ہی ہے جیسے اُس نے خود گالی دی۔

اسی معاملے کی ایک دُوسری مثال عہدِ رِسالت میں یہ پیش آئی کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ: بیت اللہ شریف زمانۂ جاہلیت کے کسی حادثے میں منہدم ہوگیا تھا، تو قریشِ مکہ نے بعثت ونبوّت سے پہلے اس کی تعمیر کرائی، اس تعمیر میں چند چیزیں بناءِ اِبراہیمی کے خلاف ہوگئیں، ایک تو یہ کہ جس حصے کو ''حطیم'' کہا جاتا ہے یہ بھی بیت اللہ کا جز ہے، تعمیر میں اس کو سرمایہ کم ہونے کی بنا پر چھوڑ دیا، دُوسرے بیت اللہ شریف کے دو دروازے شرقی اور غربی تھے، ایک داخل ہونے کے لئے، دُوسرا باہر نکلنے کے لئے، اہلِ جاہلیت نے غربی دروازہ بند کرکے صرف ایک کردیا، اور وہ بھی سطحِ زمین سے بلند کردیا تاکہ بیت اللہ شریف میں داخلہ صرف ان کی مرضی و اِجازت سے ہوسکے، ہر شخص بے محابہ نہ جاسکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میرا دِل چاہتا ہے کہ بیت اللہ کی موجودہ تعمیر کو منہدم کرکے حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعمیر کے بالکل مطابق بنادُوں، مگر خطرہ یہ ہے کہ تمہاری قوم یعنی عام عرب ابھی ابھی مسلمان ہوئے ہیں، بیت اللہ کو منہدم کرنے سے کہیں ان کے دِلوں میں کچھ شبہات نہ پیدا ہوجائیں، اس لئے میں نے اپنے ارادے کو ترک کردیا۔

ظاہر ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر کو بناءِ اِبراہیمی کے مطابق بنانا ایک طاعت اور کارِ ثواب تھا، مگر اس پر لوگوں کی ناواقفیت کے سبب ایک خطرے کا ترتب دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارادے کو ترک فرمادیا، اس واقعے سے بھی یہی اُصول مستفاد ہوا کہ اگر کسی جائز بلکہ ثواب کے کام پر کوئی مفسدہ لازم آتا ہو تو وہ جائز کام بھی ممنوع ہوجاتا ہے۔

لیکن اس پر ایک قوی اِشکال ہے، جو کہ ''رُوح المعانی'' میں ابومنصور سے نقل کیا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جہاد وقتال لازم فرمایا ہے، حالانکہ قتال کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ مسلمان کسی غیرمسلم کو قتل کرنے کا ارادہ کرے گا تو وہ مسلمان کو قتل کریں گے، اور

مسلمان کا قتل حرام ہے، تو اس اُصول پر جہاد بھی ممنوع ہو جانا چاہئے، ایسے ہی ہماری تبلیغِ اسلام اور تأویلاتِ قرآن پر، نیز اَذان اور نماز پر بہت سے کفار مذاق اُڑاتے اور مضحکہ بناتے ہیں، تو کیا ہم ان کے اس غلط رویہ کی بنا پر اپنی عبادات سے دستبردار ہو جائیں گے؟

اس کا جواب خود ابو منصور نے یہ دیا ہے کہ یہ اِشکال ایک ضروری شرط کے نظر انداز کر دینے سے پیدا ہو گیا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ جائز کام جس کو لزومِ مفسدہ کی وجہ سے منع کر دیا گیا ہے، اسلام کے مقاصد اور ضروری کاموں میں سے نہ ہو، جیسے معبوداتِ باطلہ کو بُرا کہنا، اس سے اسلام کا کوئی مقصد متعلق نہیں، اسی طرح بیت اللہ کی تعمیر کو بناء اِبراہیمی کے مطابق بنانا اس پر بھی کوئی اسلامی مقصد موقوف نہیں، اس لئے جب اس پر کسی دِینی مفسدہ کا خطرہ لاحق ہو تو ان کاموں کو ترک کر دیا گیا، اور جو کام ایسے ہیں کہ اسلام میں خود مقصود ہیں یا کوئی مقصودِ اسلامی اس پر موقوف ہے، اگر دُوسرے لوگوں کی غلط روی سے ان پر کوئی مفسدہ اور خرابی مرتب بھی ہوتی نظر آئے تو ان مقاصد کو ہرگز ترک نہ کیا جائے گا بلکہ اس کی کوشش کی جائے گی کہ یہ کام تو اپنی جگہ جاری رہیں اور پیش آنے والے مفاسد جہاں تک ممکن ہو بند ہو جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حسن بصریؒ اور اِمام محمد بن سیرینؒ دونوں حضرات ایک جنازے کی نماز میں شرکت کے لئے چلے، وہاں دیکھا کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی اجتماع ہے، اس کو دیکھ کر ابنِ سیرینؒ واپس ہو گئے، مگر حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ: لوگوں کی غلط رَوِش کی وجہ سے ہم اپنے ضروری کام کیسے چھوڑ دیں؟ نمازِ جنازہ فرض ہے، اس کو اس مفسدہ کی وجہ سے ترک نہیں کیا جا سکتا، ہاں! اس کی کوشش تا بمقدور کی جائے گی کہ یہ مفسدہ مٹ جائے۔

یہ واقعہ بھی ''رُوح المعانی'' میں نقل کیا گیا ہے۔

اس لئے خلاصہ اس اُصول کا جو آیتِ مذکورہ سے نکلا یہ ہو گیا کہ جو کام اپنی ذات میں جائز بلکہ طاعت و ثواب بھی ہو مگر مقاصدِ شرعیہ میں سے نہ ہو اگر اس کے کرنے پر کچھ

مفاسد لازم آجائیں تو وہ کام ترک کردینا واجب ہوجاتا ہے، بخلاف مقاصدِ شرعیہ کے کہ وہ لزومِ مفاسد کی وجہ سے ترک نہیں کئے جاسکتے۔

اس اُصول سے فقہائے اُمت نے ہزاروں مسائل کے اَحکام نکالے ہیں، فقہاء نے فرمایا ہے کہ: کسی شخص کا بیٹا نافرمان ہو اور وہ یہ جانتا ہو کہ اس کو کسی کام کے کرنے کے لئے کہوں گا تو اِنکار کرے گا اور اس کے خلاف کرے گا، جس سے اس کا سخت گناہگار ہونا لازم آئے گا، تو ایسی صورت میں باپ کو چاہئے کہ اس کو حکم کے انداز میں کسی کام کے کرنے یا چھوڑنے کو نہ کہے، بلکہ نصیحت کے انداز میں اس طرح کہے کہ فلاں کام کرلیا جائے تو بہت اچھا ہو، تاکہ انکار یا خلاف کرنے کی صورت میں ایک جدید نافرمانی کا گناہ اس پر عائد نہ ہوجائے۔ (خلاصۃ الفتاویٰ)

اسی طرح کسی کو وعظ و نصیحت کرنے میں بھی اگر قرائن سے یہ معلوم ہوجائے کہ وہ نصیحت قبول کرنے کے بجائے کوئی ایسا غلط انداز اِختیار کرے گا جس کے نتیجے میں وہ اور زیادہ گناہ میں مبتلا ہوجائے گا، تو ایسی صورت میں نصیحت ترک کردینا بہتر ہے۔ اِمام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں اس موضوع پر ایک مستقل باب رکھا ہے: "باب من ترك بعض الاختيار مخافة ان يقصر فهم بعض الناس فيقعوا في اشد منه" یعنی بعض اوقات جائز بلکہ مستحسن چیزوں کو اس لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اس سے کم فہم عوام کو کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ ہوتا ہے، بشرطیکہ یہ کام مقاصدِ اسلامیہ میں داخل نہ ہو۔

مگر جو کام مقاصدِ اسلامیہ میں داخل ہیں خواہ فرائض و واجبات ہوں یا سننِ مؤکدہ یا دُوسری قسم کے شعائرِ اسلامی، اگر ان کے ادا کرنے سے کچھ کم فہم لوگ غلطی میں مبتلا ہونے لگیں تو ان کاموں کو ہرگز نہ چھوڑا جائے گا، بلکہ دُوسرے طریقوں سے لوگوں کی غلط فہمی اور غلط کاری کو دُور کرنے کی کوشش کی جائے گی، ابتدائے اسلام کے واقعات شاہد ہیں

کہ نماز وتلاوت اور تبلیغِ اسلام کی وجہ سے مشرکینِ مکہ کو اِشتعال ہوتا تھا، مگر اس کی وجہ سے ان شعائرِ اسلام کو کبھی ترک نہیں کیا گیا، بلکہ خود آیتِ مذکورہ کے شانِ نزول میں جو واقعہ ابوجہل وغیرہ رُؤسائے قریش کا ذکر کیا گیا ہے، اس کا حاصل یہی تھا کہ قریشی سردار اس پر صلح کرنا چاہتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم توحید کی تبلیغ کرنا چھوڑ دیں، جس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں یہ کام کسی حال میں نہیں کرسکتا، اگر چہ وہ آفتاب وماہتاب لاکر میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔ (معارف القرآن ج:۳ ص:۴۱۹)

فضول بحث سے اِجتناب

''اس آیتِ کریمہ میں داعی کو یہ سبق دیا جارہا ہے کہ جب بھی کسی مشرک، کافر یا مخالف العقیدہ کو دعوت دو تو دورانِ دعوت ان کے معبود یا ان کے اَحبار وعلماء جن سے وہ محبت کرتے ہیں، بُرا بھلا نہ کہو، کیونکہ اس سے ان کی دِل آزاری ہوگی جس کی وجہ سے وہ تم سے اور تمہاری دعوت سے متنفر ہوجائیں گے، بلکہ تمہارے مذہب ومعبود کے بھی مزید دُشمن بن جائیں گے۔''

ارشادِ ربانی

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ (البقرۃ)

ترجمہ:- اور ہر کسی کے واسطے ایک جانب ہے، یعنی قبلہ کہ وہ منہ کرتا ہے اس طرف، سوتم سبقت کرو نیکیوں میں، جہاں کہیں تم ہوگے کرلائے گا تم کو اِکٹھا، بے شک اللہ ہر چیز کرسکتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (دُوسری حکمت تحویلِ قبلہ میں یہ ہے کہ عادۃ اللہ جاری ہے کہ) ہر (مذہب

والے) شخص کے واسطے ایک ایک قبلہ رہا ہے، جس کی طرف وہ (عبادت میں) منہ کرتا رہا ہے (چونکہ شریعتِ محمدیہ بھی ایک مستقل دِین ہے، اس کا قبلہ بھی ایک خاص ہوگیا، جب حکمت سب پر ظاہر ہوچکی) سو (مسلمانو) تم (اب اس بحث کو چھوڑ کر اپنے دِین کے) نیک کاموں میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو (کیونکہ ایک روز اپنے مالک سے سابقہ پڑنا ہے، چنانچہ) تم خواہ کہیں ہوگے (لیکن) اللہ تعالیٰ تم سب کو (اپنے اجلاس میں) حاضر کردیں گے (اس وقت نیکیوں پر جزا اور اَعمالِ بد پر سزا ہوگی اور) بالیقین اللہ تعالیٰ ہر اَمر پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

"فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ" اس سے پہلے جملے میں یہ فرمایا تھا کہ مختلف قوموں کے مختلف قبلے ہیں، کوئی ایک دُوسرے کے قبلے کو تسلیم نہیں کرتا، اس لئے اپنے قبلے کے حق ہونے پر ان لوگوں سے بحث فضول ہے۔ اس جملے کا حاصل یہ ہے کہ جب یہ معلوم ہے کہ اس بحث سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، تو پھر اس فضول بحث کو چھوڑ کر اپنے اصلی کام میں لگ جانا چاہئے، اور وہ کام ہے نیک کاموں میں دوڑ دُھوپ اور آگے بڑھنے کی کوشش، اور چونکہ فضول بحثوں میں وقت ضائع کرنا اور مسابقت الی الخیرات میں سستی کرنا، عموماً آخرت سے غفلت کے سبب ہوتے ہیں، جس کو اپنی آخرت اور اَنجام کی فکر درپیش ہو وہ کبھی فضول بحثوں میں نہیں اُلجھتا، اپنی منزل طے کرنے کی فکر میں رہتا ہے، اس لئے اگلے جملے میں آخرت کی یاد دِلانے کے لئے ارشاد فرمایا: "اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا" جس کا مطلب یہ ہے کہ بحثوں میں ہار جیت اور لوگوں کے اعتراضات سے بچنے کی فکر سب چند روزہ دُنیا کے لئے ہے، اور عنقریب وہ دن آنے والا ہے جس میں اللہ تعالیٰ تمام اَقوامِ عالم کو ایک جگہ جمع کرکے حساب لیں گے، عقل مند کا کام یہ ہے کہ اپنے اوقات اس کی فکر میں صَرف کرے۔ (معارف القرآن ج:۱ ص:۳۸۶)

متفقہ اُمور سے دعوت کا آغاز

ارشادِ ربانی

قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللہَ
وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْـًٔا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللہِ ؕ فَاِنْ
تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْھَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ (آل عمران)

ترجمہ:- تو کہہ اے اہلِ کتاب! آؤ ایک بات کی طرف جو برابر ہے ہم میں اور تم میں کہ بندگی نہ کریں مگر اللہ کی اور شریک نہ ٹھہراویں اس کا کسی کو اور نہ بناوے کوئی کسی کو رَبّ سوائے اللہ کے، پھر اگر وہ قبول نہ کریں تو کہہ دو گواہ رہو کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے کہ اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان (مُسلّم ہونے میں) برابر ہے (وہ) یہ (ہے) کہ بجز اللہ تعالیٰ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی کسی دُوسرے کو رَبّ قرار نہ دے خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر، پھر اگر (اس کے بعد بھی) وہ لوگ (حق سے) اِعراض کریں تو تم (مسلمان) لوگ کہہ دو کہ تم (ہمارے) اس (اقرار) کے گواہ رہو کہ ہم تو (اس بات کے) ماننے والے ہیں (اگر تم نہ مانو تو تم جانو)۔

معارف ومسائل

"تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ" اس آیت سے تبلیغ و دعوت کا ایک اہم

اُصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی جماعت کو دعوت دینے کا خواہش مند ہو جو عقائد و نظریات میں اس سے مختلف ہو، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ مخالف العقیدہ جماعت کو صرف اسی چیز پر جمع ہونے کی دعوت دی جائے جس پر دونوں کا اتفاق ہو سکتا ہو، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب رُوم کے بادشاہ ہرقل کو اِسلام کی دعوت دی تو ایسے مسئلے کی طرف دی جس پر دونوں کا اتفاق تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر، وہ دعوت نامہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:-

بسم الله الرحمٰن الرحيم، من محمد عبدالله ورسوله الٰی هرقل عظيم الرُّوم، سلام علٰی من اتبع الهدیٰ، امّا بعد، فانی ادعوك بدعاية الاسلام أسلِم تَسلم، يؤتك الله أجرك مرّتين فان تولّيت فانّ عليك اثم اليريسيين، يَآ أَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (بخاری)

ترجمہ:- میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے، یہ خط محمد، اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی جانب سے، رُوم کے بادشاہ ہرقل کی جانب ہے، سلامتی ہو اس شخص کے لئے جو راہِ ہدایت کی پیروی کرے، بعد اس کے میں تجھے اسلام کے بلاوے کی طرف دعوت دیتا ہوں، اسلام لا تو سلامت رہے گا، اور اللہ تعالیٰ تجھ کو دُہرا اَجر دے گا، اور اگر تو اِعراض کرے گا تو تجھ پر ان سب کسانوں کا وبال ہوگا جو تیری رعایا ہیں۔ اے اہلِ کتاب! ایک ایسی بات پر آ کر جمع ہو جاؤ جو ہم اور تم دونوں میں برابر ہے، یہ کہ ہم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ

شریک کریں، اور نہ ہم اللہ کو چھوڑ کر آپس میں اپنوں کو ربّ بنائیں۔

(معارف القرآن ج:۲ ص:۸۷)

۴- انبیائے کرام علیہم السلام کا طریقۂ دعوت

" تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ لوگوں کا تعلق اللہ تبارک وتعالیٰ سے قائم فرمائیں، اور ان کو اِلہامی تعلیمات کی طرف دعوت دیں۔

انبیائے کرام علیہم السلام اس دعوت کے اوّلین قائد تھے، اور اسی سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی خاتم النبیّین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی بات کا حکم دیا کہ وہ لوگوں کو اِلہامی تعلیمات کی دعوت دیں، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی تعمیل میں اپنا دن رات ایک کر دیا۔ اس سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکالیف اور اِیذاؤں کا بھی سامنا رہا، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر صبر کرنے کی تلقین فرمائی اور گزشتہ انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت کا قرآنِ کریم میں تذکرہ فرما کر تسلی کا سامان فرمایا۔

ذیل میں انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت کا طریقۂ کار قرآنی آیات کی روشنی میں ذکر کیا گیا ہے جو ہر داعیِ حق کے لئے مشعلِ راہ ہے۔"

حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت

ارشادِ ربانی

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ

قَرۡیَتِکُمۡ ۚ اِنَّہُمۡ اُنَاسٌ یَّتَطَہَّرُوۡنَ ﴿۸۲﴾ فَاَنۡجَیۡنٰہُ وَاَہۡلَہٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَہٗ ۫ۖ کَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِیۡنَ ﴿۸۳﴾ وَاَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہِمۡ مَّطَرًا ؕ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۸۴﴾ (الاعراف)

ترجمہ:- اور بھیجا لوط کو، جب کہا اس نے اپنی قوم کو: کیا تم کرتے ہو ایسی بے حیائی کہ تم سے پہلے نہیں کیا اس کو کسی نے جہان میں، تم تو دوڑتے ہو مردوں پر شہوت کے مارے عورتوں کو چھوڑ کر، بلکہ تم لوگ ہو حد سے گزرنے والے۔ اور کچھ جواب نہ دیا اُس کی قوم نے مگر یہی کہا کہ: نکالو اِن کو اپنے شہر سے، یہ لوگ بہت ہی پاک رہنا چاہتے ہیں۔ پھر بچا دیا ہم نے اُس کو اور اُس کے گھر والوں کو مگر اس کی عورت، کہ رہ گئی وہاں کے رہنے والوں میں۔ اور برسایا ہم نے اُن کے اُوپر مینہ یعنی پتھروں کا، پھر دیکھ، کیا ہوا انجام گنہگاروں کا۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے لوط (علیہ السلام) کو (چند بستیوں کی طرف پیغمبر بنا کر) بھیجا جبکہ انہوں نے اپنی قوم (یعنی اپنی اُمت) سے فرمایا کہ: تم ایسا فحش کام کرتے ہو جس کو تم سے پہلے کسی نے دُنیا جہان والوں میں سے نہیں کیا (یعنی) تم مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو عورتوں کو چھوڑ کر (اور اس کام کے اِرتکاب میں یہ نہیں کہ تم کو کوئی دھوکا ہو گیا ہو) بلکہ (اس باب میں) تم حد (اِنسانیت) ہی سے گزر گئے ہو اور (ان مضامین کا) ان کی قوم سے کوئی (معقول) جواب نہ بن پڑا بجز اس کے کہ (آخر میں بیہودگی کی راہ سے) آپس میں کہنے لگے کہ ان لوگوں کو (یعنی لوط علیہ السلام کو اور ان کے ساتھ مؤمنین کو) تم اپنی (اس) بستی سے نکال دو (کیونکہ) یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں (اور ہم کو گندہ بتلاتے ہیں، پھر گندوں میں پاکوں کا کیا کام، یہ بات انہوں نے براہِ تمسخر کہی تھی) سو (جب

یہاں تک نوبت پہنچی تو) ہم نے (اس قوم پر عذاب نازل کیا اور) لوط (علیہ السلام) کو اور ان کے متعلقین کو (یعنی ان کے گھر والوں کو اور دُوسرے ایمان والوں کو بھی اس عذاب سے) بچالیا (اس طرح کہ وہاں سے نکل جانے کا پہلے ہی حکم ہوگیا) بجز ان کی بیوی کے کہ وہ (بوجہ ایمان نہ لانے کے) ان ہی لوگوں میں رہی جو عذاب میں رہ گئے تھے اور (وہ عذاب جوان پر نازل ہوا یہ تھا کہ) ہم نے ان پر ایک نئی طرح کا مینہ برسایا (کہ وہ پتھروں کی بارش تھی) سو (اے دیکھنے والے) دیکھ تو سہی ان مجرموں کا انجام کیسا ہوا (اگر تو غور کرے گا تو تعجب کرے گا اور سمجھے گا کہ نافرمانی کا کیا انجام ہوتا ہے)۔

معارف ومسائل

انبیاء علیہم السلام اور اُن کی اُمتوں کے قصص کا جو سلسلہ اُوپر سے چل رہا ہے اُس کا چوتھا قصہ حضرت لوط علیہ السلام کا ہے۔

لوط علیہ السلام حضرت خلیل اللہ اِبراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں، دونوں کا اصل وطن مغربی عراق میں بصرہ کے قریب اَرضِ بابل کے نام سے معروف تھا، اس میں بت پرستی کا عام رواج تھا، خلیل اللہ علیہ السلام کا گھرانہ خود بت پرستی میں مبتلا تھا، حق تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے اِبراہیم علیہ السلام کو رسول بناکر بھیجا، قوم نے مخالفت کی جس کی نوبت آتشِ نمرود تک پہنچی، خود والد نے گھر سے نکال دینے کی دھمکیاں دیں۔

اپنے گھرانے میں سے صرف زوجہ محترمہ حضرت سارہ اور بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام مسلمان ہوئے، "فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ" بالآخر انہیں دونوں کو ساتھ لے کر وطن سے ملکِ شام کی طرف ہجرت فرمائی۔ نہرِ اُردُن پر پہنچنے کے بعد بحکمِ خداوندی حضرت ابراہیم علیہ السلام علاقہ کنعان میں جاکر مقیم ہوئے جو بیت المقدس کے قریب ہے۔

اور لوط علیہ السلام کو بھی حق تعالیٰ نے نبوّت عطا فرماکر اُردُن اور بیت المقدس کے درمیان مقامِ سدوم کے لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا۔ یہ علاقہ پانچ اچھے

بڑے شہروں پر مشتمل تھا، جن کے نام سدوم، عمورہ، ادمہ، صبوبیم اور بالع یا صوغر تھے، ان کے مجموعے کو قرآنِ کریم نے موتفکۃ اور موتفکات کے الفاظ میں کئی جگہ بیان فرمایا ہے۔ سدوم ان شہروں کا دار الحکومۃ اور مرکز سمجھا جاتا تھا، حضرت لوط علیہ السلام نے یہیں قیام فرمایا۔ زمین سرسبز و شاداب تھی، ہر طرح کے غلے اور پھلوں کی کثرت تھی، (یہ تاریخی تفصیلات بحرِ محیط، مظہری، ابنِ کثیر، المنار وغیرہ میں مذکور ہیں)۔

انسان کی عام عادت قرآنِ کریم نے بیان فرمائی ہے: "كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۙ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۭ" (سورۃ العلق) یعنی انسان سرکشی کرنے لگتا ہے، جب یہ دیکھتا ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں رہا۔ ان لوگوں پر بھی حق تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے دروازے کھول دیئے تھے، عام انسانی عادت کے تحت دولت و ثروت کے نشے میں مبتلا ہو کر عیش و عشرت اور ہویٰ و ہوس کے اُس کنارے پر پہنچ گئے کہ انسانی غیرت و حیاء اور اچھے بُرے کی فطری تمیز بھی کھو بیٹھے۔ ایسے خلافِ فطرت فواحش میں مبتلا ہو گئے جو حرام اور گناہ ہونے کے علاوہ فطرتِ سلیمہ کے لئے نفرت اور ایسے گھن کے کام ہیں کہ عام جانور بھی اس کے پاس نہیں جاتے۔

حضرت لوط علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے مأمور فرمایا، اُنہوں نے اپنی قوم کو خطاب کر کے فرمایا: "اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ" یعنی بطور تنبیہ کے فرمایا: کیا تم ایسا فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے سارے جہان میں کسی نے نہیں کیا۔

زنا کے بارے میں تو قرآنِ کریم نے "اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً" بغیر الف لام کے ذکر کیا ہے، اور یہاں الف لام کے ساتھ "اَلْفَاحِشَةَ" فرما کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ خلافِ فطرت بدکاری گویا تمام فواحش کا مجموعہ اور زنا سے زیادہ شدید جرم ہے۔

پھر یہ فرمایا کہ یہ بدکاری تم سے پہلے سارے جہان میں کسی نے نہیں کی۔ عمرو بن دینارؒ نے فرمایا کہ: اس قوم سے پہلے دُنیا میں کبھی ایسی حرکت نہ دیکھی گئی تھی (مظہری)۔ اور

نہ اہلِ سدوم سے پہلے کسی بُرے سے بُرے انسان کا ذہن اس طرف گیا تھا۔ اُموی خلیفہ عبدالملک نے کہا کہ: اگر قرآن میں قومِ لوط کا واقعہ مذکور نہ ہوتا تو میں کبھی گمان نہیں کرسکتا تھا کہ کوئی انسان ایسا کام کرسکتا ہے۔ (ابنِ کثیر)

اس میں ان کی بے حیائی پر دو حیثیت سے تنبیہ کی گئی، اوّل تو یہ کہ بہت سے گناہوں میں انسان اپنے ماحول یا اپنے اسلاف کی تقلید کی وجہ سے مبتلا ہوجاتا ہے، گو وہ بھی کوئی شرعی عذر نہیں، مگر عرفاً اُس کو کسی نہ کسی درجے میں معذور کہا جاسکتا ہے۔ مگر ایسا گناہ جو پہلے کسی نے نہیں کیا، نہ اُس کے لئے خاص مقتضیات ہیں، یہ اور بھی زیادہ وبال ہے۔ دُوسرے اس حیثیت سے کہ کسی بُرے کام یا بُری رسم کو جو شخص اِیجاد کرتا ہے اُس پر اپنے فعل کا گناہ اور عذاب تو ہوتا ہی ہے، اُس کے ساتھ اُن تمام لوگوں کا عذاب و وبال بھی اسی کی گردن پر ہوتا ہے جو قیامت تک اس کے فعل سے متأثر ہوکر مبتلائے گناہ ہوجاتے ہیں۔

دُوسری آیت میں ان کی اس بے حیائی کو زیادہ واضح الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا کہ: تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو۔ اس میں اشارہ کردیا کہ انسان کی طبعی اور فطری خواہش کی تسکین کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک حلال اور جائز طریقہ عورتوں سے نکاح کرنے کا مقرّر فرمادیا ہے، اُس کو چھوڑ کر غیرفطری طریقے کو اِختیار کرنا نری خباثتِ نفس اور گندہ ذہنی کا ثبوت ہے۔

اسی لئے صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ نے اس جرم کو عام بدکاری سے زیادہ شدید جرم و گناہ قرار دیا ہے، اِمامِ اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا: ایسا فعل کرنے والے کو ایسی ہی سزا دینا چاہئے جیسے قومِ لوط کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی کہ آسمان سے پتھر برسے، زمین کا تختہ اُلٹ گیا، اس لئے اس شخص کو کسی اُونچے پہاڑ سے گراکر اُوپر سے پتھراؤ کردیا جائے۔ مسندِ احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابنِ ماجہ میں بروایت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کام کرنے والوں کے بارے میں فرمایا:

"فاقتلوا الفاعل والمفعول به" یعنی اس کام کے فاعل ومفعول دونوں کو قتل کر دیا جائے۔ (ابنِ کثیر)

آخرِ آیت میں فرمایا: "بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ" یعنی تم ایسی قوم ہو جو حدِ اِنسانیت سے گزر گئی ہے، یعنی تمہارا اصل مرض یہ ہے کہ تم ہر کام میں اُس کی حد سے نکل جاتے ہو، جنسی خواہش کے بارے میں بھی ایسا ہی ہوا کہ خدا تعالیٰ کی مقرّر کردہ حد سے نکل کر خلاف وضعِ فطری میں مبتلا ہو گئے۔

تیسری آیت میں حضرت لوط علیہ السلام کی نصیحت کے جواب میں ان کی قوم کا جواب اس طرح ذکر فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں سے کوئی معقول جواب تو بن نہیں سکا، ضد میں آکر آپس میں یہ کہنے لگے کہ یہ لوگ بڑی پاکی اور صفائی کے مدعی ہیں، ان کا علاج یہ ہے کہ ان کو اپنی بستی سے نکال دو۔

تیسری اور چوتھی آیتوں میں قومِ سدوم کی اس کج روی اور بے حیائی کی سزائے آسمانی کا ذکر ہے اور یہ کہ اس پوری قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا، صرف لوط علیہ السلام اور ان کے چند ساتھی عذاب سے محفوظ رہے۔ قرآنِ کریم کے الفاظ میں: "فَاَنْجَیْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ" آیا ہے، یعنی ہم نے لوط اور اُن کے اہل کو عذاب سے نجات دی۔ یہ "اَهْــل" کون لوگ تھے؟ بعض حضراتِ مفسرین کا قول ہے کہ "اہل" میں دو لڑکیاں تھیں جو مسلمان ہوئی تھیں، بیوی بھی مسلمان نہ ہوئی تھی۔ قرآن مجید کی ایک دُوسری آیت میں: "فَمَا وَجَدْنَا فِیْهَا غَیْرَ بَیْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۳۶﴾" (الذاریات) مذکور ہے کہ اُن تمام بستیوں میں ایک گھر کے سوا کوئی مسلمان نہ تھا۔ اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ لوط علیہ السلام کے صرف گھر کے آدمی مسلمان تھے، جن کو عذاب سے نجات ملی، اُن میں بھی بیوی داخل نہ تھی۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ "اہل" سے مراد عام ہے اپنے گھر والے اور دُوسرے متعلقین جو مسلمان ہو چکے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ گنے چنے چند مسلمان تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے عذاب

سے بچانے کے لئے حضرت لوط علیہ السلام کو حکم دے دیا کہ بیوی کے سوا دُوسرے اہل و متعلقین کو لے کر آخرِ رات میں اس بستی سے نکل جائیں اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں، کیونکہ جس وقت آپ اس بستی سے نکل جائیں گے تو بستی والوں پر فوراً عذاب آجائے گا۔

حضرت لوط علیہ السلام نے حکمِ خداوندی کی تعمیل کی، اپنے اہل و متعلقین کو لے کر آخرِ شب میں سدوم سے نکل گئے، بیوی کے متعلق دو روایتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ ساتھ چلی ہی نہیں، دُوسری یہ کہ کچھ دُور تک ساتھ چلی مگر حکمِ خداوندی کے خلاف پیچھے مڑ کر بستی والوں کا حال دیکھنا چاہتی تھی تو اس کو عذاب نے پکڑ لیا۔ قرآن مجید کے مختلف مقامات میں اس واقعے کو مجمل اور مفصل بیان فرمایا گیا ہے۔ یہاں تیسری آیت میں صرف اتنا مذکور ہے کہ ہم نے لوط علیہ السلام اور اُن کے اہل و متعلقین کو عذاب سے نجات دے دی مگر ان کی بیوی عذاب میں رہ گئی۔ نجات دینے کی یہ صورت کہ یہ لوگ آخرِ رات میں بستی سے نکل جائیں اور مڑ کر نہ دیکھیں دُوسری آیات میں مذکور ہے۔

چوتھی آیت میں اس قوم پر نازل ہونے والے عذاب کو مختصر لفظوں میں صرف اتنا ذکر کیا گیا ہے کہ ان پر ایک عجیب قسم کی بارش بھیجی گئی۔ اور سورۂ ہود میں اس عذاب کی مفصل کیفیت یہ بیان فرمائی ہے: "فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۭ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾" یعنی جب ہمارا عذاب آپہنچا تو کر ڈالی ہم نے وہ بستی اُوپر تلے اور برسائے اُن پر پتھر کنکر کے تہ بہ تہ نشان کئے ہوئے تیرے رَبّ کے پاس، اور نہیں ہے وہ بستی ان ظالموں سے کچھ دُور۔

اس سے معلوم ہوا کہ اُوپر سے پتھروں کی بارش بھی ہوئی اور نیچے سے زمین کے پورے طبقے کو جبرئیلِ امین نے اُٹھا کر اوندھا پلٹ دیا۔ اور جن پتھروں کی بارش برسی، وہ تہ بر تہ تھے یعنی ایسی مسلسل بارش ہوئی کہ تہ بر تہ جمع ہوگئے اور یہ پتھر نشان کئے ہوئے تھے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ ہر ایک پتھر پر اُس شخص کا نام لکھا ہوا تھا، جس کی ہلاکت کے لئے

پھینکا گیا تھا، اور سورۂ حجر کی آیات میں اس عذاب سے پہلے یہ بھی مذکور ہے: "فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾" یعنی آ پکڑا اُن کو چنگھاڑ نے سورج نکلتے وقت۔

اس سے معلوم ہوا کہ پہلے آسمان سے کوئی سخت آواز چنگھاڑ کی صورت میں آئی، پھر اس کے بعد دُوسرے عذاب آئے، ظاہر الفاظ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ چنگھاڑ کے بعد پہلے زمین کا تختہ اُلٹ دیا گیا، پھر اُس پر اُن کی مزید تذلیل وتحقیر کے لئے پتھراؤ کیا گیا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے پتھراؤ کیا گیا ہو، بعد میں زمین کا تختہ اُلٹا دیا گیا ہو، کیونکہ قرآنی اُسلوبِ بیان میں یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کا ذکر پہلے ہوا ہو وہ وقوع کے اعتبار سے بھی پہلے ہو۔

قومِ لوط کے ہولناک عذابوں میں سے زمین کا تختہ اُلٹ دینے کی سزا اُن کے فحش و بے حیائی عمل کے ساتھ خاص مناسبت بھی رکھتی ہے، کہ اُنہوں نے قلبِ موضوع کا ارتکاب کیا ہے۔

سورۂ ہود کی آیات کے آخر میں قرآنِ کریم نے اہلِ عرب کی مزید تنبیہ کے لئے یہ بھی فرمایا کہ: "وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ" یعنی یہ اُلٹی ہوئی بستیاں ان ظالموں سے کچھ دُور نہیں، سفرِ شام کے راستے پر ہر وقت ان کے سامنے آتی ہیں، مگر حیرت ہے کہ یہ اُس سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔

اور یہ منظر صرف نزولِ قرآن کے زمانے میں نہیں، آج بھی موجود ہے، بیت المقدس اور نہرِ اُردُن کے درمیان آج بھی یہ قطعۂ زمین بحرِ لوط یا بحرِ میّت کے نام سے موسوم ہے، اس کی زمین سطحِ سمندر سے بہت زیادہ گہرائی میں ہے اور اُس کے ایک خاص حصے پر ایک دریا کی صورت میں ایک عجیب قسم کا پانی موجود ہے جس میں کوئی جاندار مچھلی، مینڈک وغیرہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے اُس کو بحرِ میّت بولتے ہیں، یہی مقام سدوم کا بتلایا جاتا ہے، نَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ عَذَابِهٖ وَغَضَبِهٖ۔ (معارف القرآن ج:۴ ص:۶۱۵)

حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت

ارشادِ ربانی

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ
اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٦٥﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ
سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٦٦﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ
رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٧﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ
اَمِيْنٌ ﴿٦٨﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ
لِيُنْذِرَكُمْ ۗ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي
الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٦٩﴾ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ
اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ
الصّٰدِقِيْنَ ﴿٧٠﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ۗ
اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ
سُلْطٰنٍ ۗ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿٧١﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ
بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٢﴾
(الاعراف)

ترجمہ:- اور قومِ عاد کی طرف بھیجا اُن کے بھائی ہود کو، بولا: اے میری قوم! بندگی کرو اللہ کی، کوئی نہیں تمہارا معبود اس کے سوا، سو کیا تم ڈرتے نہیں۔ بولے سردار جو کافر تھے اُس کی قوم میں: ہم تو دیکھتے ہیں تجھ کو عقل نہیں اور ہم تجھ کو جھوٹا گمان کرتے ہیں۔ بولا: اے میری قوم! میں کچھ بے عقل نہیں لیکن میں بھیجا ہوا ہوں پروردگارِ عالم کا۔ پہنچاتا ہوں تم کو پیغام اپنے رَبّ کے اور میں تمہارا خیر خواہ ہوں

اطمینان کے لائق۔ کیا تم کو تعجب ہوا کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رَبّ کی طرف سے ایک مرد کی زبانی جو تم ہی میں سے ہے تا کہ تم کو ڈرائے، اور یاد کرو جبکہ تمہیں سردار کر دیا پیچھے قومِ نوح کے اور زیادہ کر دیا تمہارے بدن کا پھیلاؤ، سو یاد کرو اللہ کے احسان تا کہ تمہارا بھلا ہو۔ بولے: کیا تو اس واسطے ہمارے پاس آیا کہ ہم بندگی کریں اللہ اکیلے کی اور چھوڑ دیں جن کو پوجتے رہے ہمارے باپ دادے، پس تو لے آ ہمارے پاس جس چیز سے تو ہم کو ڈراتا ہے اگر تو سچا ہے۔ کہا: تم پر واقع ہو چکا ہے تمہارے رَبّ کی طرف سے عذاب اور غصہ، کیوں جھگڑتے ہو مجھ سے ان ناموں پر کہ رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے، نہیں اُتاری اللہ نے ان کی کوئی سند، سو منتظر رہو، میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔ پھر ہم نے بچالیا اُس کو اور جو اس کے ساتھ تھے اپنی رحمت سے، اور جڑ کاٹی ان کی جو جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو اور نہیں مانتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے قومِ عاد کی طرف ان کے (برادری یا وطن کے) بھائی (حضرت) ہود (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا، انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا: اے میری قوم! تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں، (اور بت پرستی چھوڑ دو، جیسا آگے: "وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا" سے معلوم ہوتا ہے) سو کیا تم (ایسے بڑے جرمِ عظیم یعنی شرک کے مرتکب ہو کر عذابِ اِلٰہی سے) نہیں ڈرتے۔ ان کی قوم میں جو آبرو دار لوگ کافر تھے انہوں نے (جواب میں) کہا کہ: ہم تم کو کم عقلی میں

(مبتلا) دیکھتے ہیں (کہ توحید کی تعلیم کر رہے ہو اور عذاب سے ڈرا رہے ہو) اور ہم بے شک تم کو جھوٹے لوگوں میں سے سمجھتے ہیں (یعنی نعوذ باللہ نہ تو توحید صحیح مسئلہ ہے اور نہ عذاب کا آنا صحیح ہے) انہوں نے فرمایا کہ: اے میری قوم! مجھ میں ذرا بھی کم عقلی نہیں لیکن (چونکہ) میں پروردگارِ عالم کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں (انہوں نے مجھ کو تعلیمِ توحید اور اِنذارِ عذاب کا حکم کیا ہے اس لئے اپنا منصبی کام کرتا ہوں کہ) تم کو اپنے پروردگار کے پیغام (اور اَحکام) پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا خیرخواہ امانت دار ہوں (کیونکہ توحید و اِیمان میں تمہارا ہی نفع ہے) اور (تم جو میرے بشر ہونے سے میری نبوّت کا انکار کرتے ہو، جیسا سورۂ ابراہیم میں بعد ذکرِ قومِ نوح و عاد و ثمود کے ہے: "قَالُوٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا" اور سورۂ فُصِّلَتْ میں بعد ذکرِ عاد و ثمود کے ہے: "قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً.... الخ" تو) کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت جو تمہاری ہی جنس کا (بشر) ہے کوئی نصیحت کی بات آگئی (وہ نصیحت کی بات وہی ہے جو مذکور ہوئی: "يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ... الیٰ قولہ... اَفَلَا تَتَّقُوْنَ") تاکہ وہ شخص تم کو (عذابِ اِلٰہی سے) ڈراوے (یعنی یہ تو کوئی تعجب کی بات نہیں، کیا بشریت و نبوّت میں منافاۃ ہے، اُوپر "اَفَلَا تَتَّقُوْنَ" میں ترہیب تھی، آگے ترغیب ہے) اور (اے قوم!) تم یہ حالت یاد کرو (اور یاد کر کے احسان مانو اور اطاعت کرو) کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو قومِ نوح کے بعد (رُوئے زمین پر) آباد کیا اور ڈیل ڈول میں تم کو پھیلاؤ (بھی) زیادہ دیا سو خدا تعالیٰ کی (ان) نعمتوں کو یاد کرو (اور یاد کر کے احسان مانو اور اطاعت کرو) تاکہ تم کو (ہر طرح کی) فلاح ہو۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ: کیا (خوب) آپ ہمارے پاس اس واسطے آئے ہوں گے کہ ہم صرف اللہ ہی کی عبادت کیا کریں اور جن (بتوں) کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے ہم ان (کی عبادت) کو چھوڑ دیں (یعنی ہم ایسا نہ کریں گے) اور ہم کو (نہ ماننے پر) جس عذاب کی دھمکی دیتے ہو (جیسا "اَفَلَا تَتَّقُوْنَ" سے معلوم ہوتا ہے) اس (عذاب) کو

ہمارے پاس منگوادو اگر تم سچے ہو۔ انہوں نے فرمایا کہ: (تمہاری سرکشی کی جب یہ حالت ہے تو) بس اب تم پر خدا کی طرف سے عذاب اور غضب آیا ہی چاہتا ہے (پس عذاب کے شبہ کا جواب تو اس وقت معلوم ہو جائے گا اور باقی توحید پر جو شبہ ہے کہ ان بتوں کو معبود کہتے ہو، جن کا نام تو تم نے معبود رکھ لیا ہے، لیکن واقع میں ان کے معبود ہونے کی کوئی دلیل ہی نہیں تو) کیا تم مجھ سے ایسے (بے حقیقت) ناموں کے باب میں جھگڑتے ہو (یعنی وہ مسمیات بمنزلۂ بعض اسماء کے ہیں) جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے (آپ ہی) ٹھہرالیا ہے (لیکن) ان کے معبود ہونے کی خدا تعالیٰ نے کوئی دلیل (نقلی یا عقلی) نہیں بھیجی (یعنی جدال میں مدعی کے ذمہ دلیل ہے اور مقابل کی دلیل کا جواب بھی، سو تم نہ دلیل قائم کر سکتے ہو، نہ میری دلیل کا جواب دے سکتے ہو، پھر جدال کا کیا معنی) سو تم (اب جدال ختم کرو اور عذابِ الٰہی کے) منتظر رہو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔ غرض (عذاب آیا اور) ہم نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو (یعنی مؤمنین کو) اپنی رحمت (وکرم) سے (اس عذاب سے) بچالیا اور ان لوگوں کی جڑ تک کاٹ دی (یعنی بالکل ہلاک کر دیا) جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا اور وہ (بوجہ غایت قساوت کے) ایمان لانے والے نہ تھے (یعنی اگر ہلاک بھی نہ ہوتے جب بھی ایمان نہ لاتے، اس لئے ہم نے بمقتضائے اس وقت کی حکمت کے خاتمہ ہی کر دیا)۔

معارف ومسائل

عاد اور ثمود کی مختصر تاریخ

''عاد'' اصل میں ایک شخص کا نام ہے جو نوح علیہ السلام کی پانچویں نسل اور اُن کے بیٹے سام کی اولاد میں ہے۔ پھر اس شخص کی اولاد اور پوری قوم ''عاد'' کے نام سے مشہور ہوگئی۔ قرآنِ کریم میں عاد کے ساتھ کہیں لفظ ''عادِ اُولیٰ'' اور کہیں ''اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ'' بھی آیا

ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قومِ عاد کو ''اِرم'' بھی کہا جاتا ہے۔ اور عادِ اُولیٰ کے مقابلے میں کوئی عادِ ثانیہ بھی ہے، اس کی تحقیق میں مفسرین اور مؤرخین کے اقوال مختلف ہیں، زیادہ مشہور یہ ہے کہ عاد کے دادا کا نام ''اِرَم'' ہے، اس کے ایک بیٹے یعنی عوص کی اولاد میں عاد ہے، یہ ''عادِ اُولیٰ'' کہلاتا ہے، اور دُوسرے بیٹے جثو کا بیٹا ثمود ہے، یہ ''عادِ ثانی'' کہلاتا ہے۔ اس تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ عاد اور ثمود دونوں اِرم کی دو شاخیں ہیں، ایک شاخ کو عادِ اُولیٰ اور دُوسری کو ثمود یا عادِ ثانیہ بھی کہا جاتا ہے، اور لفظِ ''اِرَم'' عاد و ثمود دونوں کے لئے مشترک ہے۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ قومِ عاد پر جس وقت عذاب آیا تو ان کا ایک وفد مکہ معظّمہ گیا ہوا تھا، وہ عذاب سے محفوظ رہا، اُس کو ''عادِ اُخریٰ'' کہتے ہیں۔ (بیان القرآن)

اور ''ہودؑ'' (علیہ السلام) ایک نبی کا نام ہے، یہ بھی نوح علیہ السلام کی پانچویں نسل اور سام کی اولاد میں ہیں، قومِ عاد اور حضرت ہود علیہ السلام کا نسب نامہ چوتھی پشت میں سام پر جمع ہوجاتا ہے، اس لئے ہود علیہ السلام عاد کے نسبی بھائی ہیں، اسی لئے ''اَخَاھُمْ ھُوْدًا'' فرمایا گیا۔

قومِ عاد کے تیرہ خاندان تھے، عمان سے لے کر حضر موت اور یمن تک ان کی بستیاں تھیں، ان کی زمینیں بڑی سرسبز و شاداب تھیں، ہر قسم کے باغات تھے، رہنے کے لئے بڑے بڑے شاندار محلات بناتے تھے، بڑے قد آور، قوی الجثہ آدمی تھے، آیاتِ مذکورہ میں ''زَادَکُمْ فِی الْخَلْقِ بَصْطَۃً'' کا یہی مطلب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دُنیا کی ساری ہی نعمتوں کے دروازے ان پر کھول دیئے تھے، مگر ان کی کج فہمی نے انہی نعمتوں کو ان کے لئے وبالِ جان بنادیا، اپنی قوّت و شوکت کے نشے میں بدمست ہوکر ''مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً'' کی ڈینگ مارنے لگے۔

اور رَبّ العالمین جس کی نعمتوں کی بارش ان پر ہو رہی تھی، اس کو چھوڑ کر بت پرستی میں مبتلا ہوگئے۔

حضرت ہود علیہ السلام کا نسب اور ان کے بعض حالات

اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے ہود علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا، جو خود انہیں کے خاندان سے تھے۔ اور ابوالبرکات جونی جو اَنسابِ عرب کے بڑے ماہر مشہور ہیں، اُنہوں نے لکھا ہے کہ ہود علیہ السلام کے بیٹے یعرب بن قحطان ہیں، جو یمن میں جا کر آباد ہوئے اور یمنی اقوام انہیں کی نسل ہیں، اور عربی زبان کی ابتداء انہیں سے ہوئی، اور یعربؔ کی مناسبت سے ہی زبان کا نام ''عربی'' اور اس کے بولنے والوں کو ''عرب'' کہا گیا۔ (بحرِمحیط)

مگر صحیح یہ ہے کہ عربی زبان تو عہدِ نوح علیہ السلام سے جاری تھی، کشتیٔ نوح کے ایک رفیق جرہم تھے، جو عربی زبان بولتے تھے (بحرِ محیط)، اور یہی جرہم ہیں جن سے مکہ معظّمہ کی آبادی شروع ہوئی۔ ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ یمن میں عربی زبان کی ابتدا یعرب بن قحطان سے ہوئی اور ابوالبرکات کی تحقیق کا یہی مطلب ہو۔

حضرت ہود علیہ السلام نے قومِ عاد کو بت پرستی چھوڑ کر توحید اِختیار کرنے اور ظلم وجور چھوڑ کر عدل وانصاف اِختیار کرنے کی تلقین فرمائی، مگر یہ لوگ اپنی دولت وقوت کے نشے میں سرشار تھے، بات نہ مانی، جس کے نتیجے میں اُن پر پہلا عذاب تو یہ آیا کہ تین سال تک مسلسل بارش بند ہوگئی، ان کی زمینیں خشک ریگستانی صحرا بن گئی، باغات جل گئے، مگر اس پر بھی یہ لوگ شرک وبت پرستی سے باز نہ آئے تو آٹھ دن اور سات راتوں تک ان پر شدید قسم کی آندھی کا عذاب مسلط ہوا، جس نے ان کے رہے سہے باغات اور محلات کو زمین پر بچھا دیا، ان کے آدمی اور جانور ہوا میں اُڑتے اور پھر سر کے بل آ کر گرتے تھے۔ اس طرح یہ قومِ عاد پوری کی پوری ہلاک کردی گئی۔ آیاتِ مذکورہ میں جو اِرشاد ہے: ''وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا'' یعنی ہم نے جھٹلانے والوں کی نسل قطع کردی، اس کا مطلب بعض حضرات نے یہی قرار دیا ہے کہ اس وقت جو لوگ موجود تھے وہ سب فنا کردیئے گئے۔ اور بعض

حضرات نے اس لفظ کے یہ معنی قرار دیئے ہیں کہ آئندہ کے لئے بھی قومِ عاد کی نسل اللہ تعالیٰ نے منقطع کردی۔

حضرت ہود علیہ السلام کی بات نہ ماننے اور کفر وشرک میں مبتلا رہنے پر جب ان کی قوم پر عذاب آیا تو ہود علیہ السلام اور ان کے رُفقاء نے ایک حظیرہ (گھیر) میں پناہ لی، یہ عجیب بات تھی کہ اس طوفانی ہوا سے بڑے بڑے محلات تو منہدم ہورہے تھے مگر اس گھیر میں ہوا نہایت معتدل ہوکر داخل ہوتی تھی۔ ہود علیہ السلام کے سب رُفقاء عین نزولِ عذاب کے وقت بھی اسی جگہ مطمئن بیٹھے رہے، ان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی۔قوم کے ہلاک ہوجانے کے بعد مکہ معظمہ منتقل ہوگئے اور پھر یہیں وفات پائی۔ (بحرِمحیط)

قومِ عاد کا عذاب ہوا کے طوفان کے صورت میں آنا قرآن مجید میں صراحۃً مذکور اور منصوص ہے، اور سورۂ مؤمنون میں قصۂ نوح علیہ السلام ذکر کرنے کے بعد جو اِرشاد ہوا ہے: "ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝۳۱" یعنی پھر ہم نے ان کے بعد ایک اور جماعت پیدا کی، ظاہر یہ ہے کہ اس جماعت سے مراد قومِ عاد ہے۔ پھر اس جماعت کے اعمال واقوال بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: "فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ" یعنی پکڑ لیا اُن کو ایک سخت آواز نے۔ اس ارشادِ قرآنی کی بنا پر بعض حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ قومِ عاد پر سخت قسم کی ہیبت ناک آواز کا عذاب مسلط ہوا تھا مگر ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں، ہوسکتا ہے کہ سخت آواز بھی ہوئی ہو اور ہوا کا طوفان بھی۔

یہ مختصر واقعہ ہے قومِ عاد اور حضرت ہود علیہ السلام کا، اس کی تفصیل قرآنی الفاظ کے ساتھ یہ ہے:-

پہلی آیت میں "وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ" یعنی ہم نے قومِ عاد کی طرف اُن کے بھائی ہود علیہ السلام کو ہدایت کے لئے بھیجا تو اُنہوں نے فرمایا: اے میری قوم! تم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اُس کے سوا

کوئی تمہارا معبود نہیں ہے، کیا تم ڈرتے نہیں؟

قومِ عاد سے پہلے قومِ نوح کا عذابِ عظیم ابھی تک لوگوں کے ذہنوں سے غائب نہ ہوا تھا، اس لئے حضرت ہود علیہ السلام کو عذاب کی شدّت وعظمت بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی، صرف اتنا فرمانا کافی سمجھا کہ کیا تم اللہ کے عذاب سے ڈرتے نہیں؟

دُوسری آیت میں ہے: "قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ" یعنی قوم کے سرداروں نے کہا کہ: ہم آپ کو بے وقوفی میں مبتلا پاتے ہیں اور ہمارا گمان یہ ہے کہ آپ جھوٹ بولنے والوں میں سے ہیں۔

یہ تقریباً ایسا ہی معارضہ ہے جیسا حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے ان سے کیا تھا، صرف بعض الفاظ کا فرق ہے، تیسری اور چوتھی آیت میں اس کا جواب بھی تقریباً اُسی انداز کا ہے جیسا نوح علیہ السلام نے دیا تھا، یعنی یہ کہ مجھ میں بے وقوفی کچھ نہیں، بات صرف اتنی ہے کہ میں ربّ العالمین کی طرف سے رسول اور پیغمبر بن کر آیا ہوں، اُس کے پیغامات تمہیں پہنچاتا ہوں، اور میں واضح طور پر تمہارا خیر خواہ ہوں، اس لئے تمہاری آبائی جہالتوں اور غلطیوں میں تمہارا ساتھ دینے کے بجائے میں تمہارے طبائع کے خلاف حق بات تمہیں پہنچاتا ہوں جس سے تم بُرا مانتے ہو۔

پانچویں آیت میں قومِ عاد کا وہی اعتراض ذکر کیا گیا ہے جو ان سے پہلے قومِ نوح نے پیش کیا تھا کہ ہم کسی اپنے ہی جیسے بشر اور اِنسان کو کیسے اپنا بڑا اور پیشوا مان لیں، کوئی فرشتہ ہوتا تو ممکن تھا کہ ہم مان لیتے۔ اس کا جواب بھی قرآنِ کریم نے وہی ذکر کیا جو نوح علیہ السلام نے دیا تھا کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کوئی انسان اللہ کا نبی ورسول ہوکر لوگوں کو ڈرانے کے لئے آجائے، کیونکہ درحقیقت انسان کے سمجھانے بجھانے کے لئے انسان ہی کا پیغمبر ہونا مؤثر ہوسکتا ہے۔

اس کے بعد ان کو وہ اِنعامات یاد دِلائے جو اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر مبذول

فرمائے ہیں، ارشاد فرمایا: ”وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ“ یعنی اس بات کو یاد کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو قومِ نوح کے بعد زمین کا مالک ومتصرف بنادیا اور ڈیل ڈول میں تم کو پھیلاؤ بھی زیادہ دیا، اُس کی ان نعمتوں کو یاد کرو تو تمہارا بھلا ہوگا۔

مگر اس سرکش، بدمست قوم نے ایک نہ سنی اور وہی جواب دیا جو عام طور پر گمراہ لوگ دیا کرتے ہیں کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم سے ہمارے باپ دادا کا مذہب چھڑادو اور سارے دیوتاؤں کو چھوڑ کر ہم صرف ایک خدا کو ماننے لگیں، یہ تو ہم سے نہ ہوگا، آپ جس عذاب کی دھمکی ہمیں دے رہے ہیں اس عذاب کو بلالو اگر تم سچے ہو۔

چھٹی آیت میں ہود علیہ السلام نے جواب دیا کہ: جب تمہاری سرکشی اور بے ہوشی کی یہ حالت ہے تو اَب تم پر خدا تعالیٰ کا غضب اور عذاب آیا ہی چاہتا ہے، تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی اب اُسی کا انتظار کرتے ہیں۔ قوم کے اس اشتعال آمیز جواب پر عذاب آنے کی خبر تو دے دی، لیکن پیغمبرانہ شفقت ونصیحت نے پھر مجبور کیا کہ اس کلام کے دوران میں یہ بھی فرمادیا کہ افسوس ہے! تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے بے عقل، بے جان چیزوں کو اپنا معبود بنالیا جن کے معبود ہونے پر نہ کوئی عقلی دلیل ہے نہ نقلی، اور پھر تم ان کی عبادت میں ایسے پختہ ہوگئے کہ ان کی حمایت میں مجھ سے جھگڑا کر رہے ہو۔

آخری آیت میں ارشاد فرمایا کہ ہود علیہ السلام کی ساری جدوجہد اور قومِ عاد کی سرکشی کا آخری انجام یہ ہوا کہ ہم نے ہود علیہ السلام اور اُن لوگوں کو جو اُن پر اِیمان لائے تھے، عذاب سے محفوظ رکھا، اور جھٹلانے والوں کی جڑ کاٹ دی اور وہ ایمان لانے والے نہ تھے۔

اس قصے میں غافل انسانوں کے لئے خدا کی یاد اور اطاعت میں لگ جانے کی ہدایت اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے سامانِ عبرت اور مبلغین ومصلحین کے لئے پیغمبرانہ طریقۂ تبلیغ واصلاح کی تعلیم ہے۔ (معارف القرآن ج:۳ ص:۵۹۹)

حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت

ارشادِ ربانی

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ
قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ
اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ
جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا
قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ
مُفْسِدِيْنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا
لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ
اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِيْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ
كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا
تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ
جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ
لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾ (الاعراف)

ترجمہ:- اور ثمود کی طرف بھیجا اُن کے بھائی صالح کو، بولا: اے میری قوم! بندگی کرو اللہ کی، کوئی نہیں تمہارا معبود اس کے سوا، تم کو پہنچ چکی ہے دلیل تمہارے ربّ کی طرف سے، یہ اُونٹنی اللہ کی ہے تمہارے لئے نشانی، سو اس کو چھوڑ دو کہ کھائے اللہ کی زمین میں اور اس کو ہاتھ نہ لگاؤ بُری طرح، پھر تم کو پکڑے گا عذاب دردناک۔ اور یاد کرو جبکہ تم کو سردار کر دیا عاد کے پیچھے اور ٹھکانا دیا تم کو زمین میں کہ

بناتے ہو نرم زمین میں محل اور تراشتے ہو پہاڑوں کے گھر، سو یاد کرو احسان اللہ کے اور مت مچاتے پھرو زمین میں فساد۔ کہنے لگے سردار جو متکبر تھے اس کی قوم میں غریب لوگوں کو کہ جو ان میں ایمان لا چکے تھے: کیا تم کو یقین ہے کہ صالح کو بھیجا ہے اُس کے رَبّ نے؟ بولے: ہم کو تو جو وہ لے کر آیا اس پر یقین ہے۔ کہنے لگے وہ لوگ جو متکبر تھے: جس پر تم کو یقین ہے، ہم اس کو نہیں مانتے۔ پھر انہوں نے کاٹ ڈالا اُونٹنی کو اور پھر گئے اپنے رَبّ کے حکم سے، اور بولے: اے صالح! لے کر آ ہم پر جس سے تو ہم کو ڈراتا تھا اگر تو رسول ہے۔ پس آ پکڑا اُن کو زلزلے نے، پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھر میں اوندھے پڑے۔ پھر صالح اُلٹا پھرا اُن سے اور بولا: اے میری قوم! میں پہنچا چکا تم کو پیغام اپنے رَبّ کا اور خیر خواہی کی تمہاری، لیکن تم کو محبت نہیں خیر خواہوں سے۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا، انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا کہ: اے میری قوم! تم (صرف) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں، (انہوں نے ایک خاص معجزے کی درخواست کی کہ اس پتھر میں سے ایک اُونٹنی پیدا ہو تو ہم ایمان لائیں، چنانچہ آپ کی دُعا سے ایسا ہی ہوا کہ وہ پتھر پھٹا اور اس کے اندر سے ایک بڑی اُونٹنی نکلی، رواہ محمد بن اسحاق، آپ نے فرمایا کہ:) تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل (میرے رسول ہونے کی) آچکی ہے (آگے اس کا بیان ہے) یہ اُونٹنی ہے اللہ کی جو تمہارے لئے دلیل (بنا کر ظاہر کی گئی) ہے (اور اسی لئے اللہ کی اُونٹنی کہلائی کہ اللہ کی دلیل

ہے) سو (علاوہ اس کے کہ میری رِسالت پر دلیل ہے، خود اس کے بھی کچھ حقوق ہیں، مِن جملہ ان کے یہ ہے کہ) اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں (گھاس چارہ) کھاتی پھرا کرے (اسی طرح اپنی باری کے دن پانی پیتی رہے، جیسا دُوسری آیت میں ہے) اور اس کو بُرائی (اور تکلیف دہی) کے ساتھ ہاتھ بھی مت لگانا، کبھی تم کو دردناک عذاب آ پکڑے۔ اور (اے قوم!) تم یہ حالت یاد کرو (اور یاد کر کے احسان مانو اور اطاعت کرو) کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو (قوم) عاد کے بعد (رُوئے زمین پر) آباد کیا اور تم کو زمین پر رہنے کو (دِلخواہ) ٹھکانا دیا کہ نرم زمین پر (بھی بڑے بڑے) محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں (بھی) گھر بناتے ہو، سو خدا تعالیٰ کی (ان) نعمتوں کو (اور دُوسری نعمتوں کو بھی) یاد کرو (اور کفر و شرک کے ذریعے) زمین میں فساد مت پھیلاؤ (یعنی ایمان لے آؤ، مگر باوجود اس قدر فہمائش کے کچھ غرباء ایمان لائے اور ان میں اور رئیسوں میں یہ گفتگو ہوئی، یعنی) ان کی قوم میں جو متکبر سردار تھے انہوں نے غریب لوگوں سے جو کہ ان میں سے ایمان لے آئے تھے پوچھا کہ: کیا تم کو اس بات کا یقین ہے کہ صالح (علیہ السلام) اپنے ربّ کی طرف سے (پیغمبر بنا کر) بھیجے ہوئے (آئے) ہیں؟ انہوں نے (جواب میں) کہا کہ: بے شک ہم تو اس (حکم) پر پورا یقین رکھتے ہیں جو ان کو دے کر بھیجا گیا ہے، وہ متکبر لوگ کہنے لگے کہ: تم جس چیز پر یقین لائے ہو ہم تو اس کے منکر ہیں۔ غرض (نہ صالح علیہ السلام پر اِیمان لائے اور نہ اُونٹنی کے حقوق ادا کئے بلکہ) اس اُونٹنی کو (بھی) مار ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم (ماننے) سے (بھی) سرکشی کی (وہ حکم اعتقادِ توحید و رِسالت تھا) اور (اس پر یہ بے باکی کہ) کہنے لگے کہ: اے صالح! جس (عذاب) کی آپ ہم کو دھمکی دیتے تھے اس کو منگوایئے اگر آپ پیغمبر ہیں (کیونکہ پیغمبر کا صادق ہونا لازم ہے)، پس پکڑا ان کو زلزلے نے سو اپنے گھر میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے، اس وقت صالح (علیہ السلام) ان سے منہ موڑ کر چلے اور (بطور حسرت کے فرضی خطاب کر کے) فرمانے لگے کہ: اے میری قوم! میں نے تو تم کو اپنے پروردگار کا حکم پہنچا دیا تھا (جس پر عمل کرنا موجبِ فلاح

تھا) اور میں نے تمہاری (بہت) خیر خواہی کی (کہ کس طرح شفقت سے سمجھایا) لیکن (افسوس تو یہ ہے کہ) تم لوگ (اپنے) خیر خواہوں کو پسند ہی نہیں کرتے تھے (اس لئے ایک نہ سنی اور آخر روزِ بد دیکھا)۔

معارف و مسائل

• ان آیات میں حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم ثمود کے حالات کا تذکرہ ہے، جیسے اس سے پہلے قومِ نوح اور قومِ ہود (علیہما السلام) کا ذکر آچکا ہے، اور سورۂ اعراف کے آخر تک بھی انبیائے سابقین علیہم السلام اور ان کی قوموں کے احوال، انبیاء کی دعوتِ حق پر اُن کے کفر و انکار کے انجامِ بد کا بیان ہے۔

آیاتِ مذکورہ میں سے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا: ''وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا'' اس سے پہلے قومِ عاد کے تذکرے میں بیان ہو چکا ہے کہ عاد و ثمود ایک ہی دادا کی اولاد میں دو شخصوں کا نام ہے، ان کی اولاد بھی ان کے نام سے موسوم ہو کر دو قومیں بن گئیں، ایک قومِ عادِ دُوسری قومِ ثمود کہلاتی ہے۔ عرب کے شمال مغرب میں بستے تھے اور ان کے بڑے شہر کا نام ''حجر'' تھا، جس کو اَب عموماً ''مدائن صالح'' کہا جاتا ہے۔ قومِ عاد کی طرح قومِ ثمود بھی دولت مند، قوی اور بہادر قوم، اور سنگ تراشی اور فنِ تعمیر میں ماہر تھی، کھلی زمین پر بڑے بڑے محلات بنانے کے علاوہ پہاڑوں کو کھود کر ان میں طرح طرح کی عمارتیں بناتے تھے۔ ''اَرض القرآن'' میں مولانا سیّد سلیمان ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ان کی تعمیری یادگاریں اب تک باقی ہیں، ان پر اِرَمی اور ثمودی خط میں کتبے منقوش ہیں۔

دُنیا کی دولت و ثروَت کا نتیجہ عموماً یہی ہوتا ہے کہ ایسے لوگ خدا و آخرت سے غافل ہو کر غلط راستوں پر پڑ جاتے ہیں، قومِ ثمود کا بھی یہی حال ہوا۔

حالانکہ ان سے پہلے قومِ نوح کے عذاب کے واقعات کا تذکرہ ابھی تک دُنیا میں موجود تھا، اور پھر ان کے بھائی قومِ عاد کی ہلاکت کے واقعات تو تازہ ہی تھے، مگر

دولت وقوت کے نشے کا خاصہ ہی یہ ہے کہ ابھی ایک شخص کی بنیاد منہدم ہوتی ہے دُوسرا اس کی خاک کے ڈھیر پر اپنی تعمیر کھڑی کر لیتا ہے اور پہلے کے واقعات کو بھول جاتا ہے۔ قومِ عاد کی تباہی اور ہلاکت کے بعد قومِ ثمود اُن کے مکانات اور زمینوں کی وارث بنی اور اُنہیں مقامات پر اپنے عشرت کدے تیار کئے جن میں اُن کے بھائی ہلاک ہو چکے تھے، اور ٹھیک وہی اعمال وافعال شروع کر دیئے جو قومِ عاد نے کئے تھے کہ خدا و آخرت سے غافل ہو کر شرک و بت پرستی میں لگ گئے، اللہ تعالیٰ نے اپنی عادتِ مستمرہ کے مطابق ان کی ہدایت کے لئے حضرت صالح علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا، صالح علیہ السلام نسب و وطن کے اعتبار سے قومِ ثمود ہی کے ایک فرد تھے، کیونکہ یہ بھی سام ہی کی اولاد میں سے تھے، اسی لئے قرآنِ کریم میں ان کو قومِ ثمود کا بھائی فرمایا ہے "اَخَاهُمْ صٰلِحًا"۔ صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو دعوت دی وہ وہی دعوت ہے جو آدم علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک سب انبیاء علیہم السلام دیتے چلے آئے ہیں، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے: "وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ" (النحل: ۳۶) یعنی ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیجا کہ وہ لوگوں کو یہ ہدایت کرے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور بت پرستی سے بچو۔ عام انبیائے سابقین علیہم السلام کی طرح صالح علیہ السلام نے بھی قوم سے یہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنا رَبّ اور خالق و مالک سمجھو، اس کے سوا کوئی معبود بنانے کے لائق نہیں، فرمایا: "یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ"۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا: "قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ" یعنی اب تو ایک کھلا ہوا نشان بھی تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس آ پہنچا ہے، اس نشان سے مراد ایک عجیب وغریب ناقہ ہے جس کا اجمالی ذکر اس آیت میں بھی ہے اور قرآنِ کریم کی مختلف سورتوں میں اُس کی مزید تفصیلات مذکور ہیں۔ واقعہ اس ناقہ کا یہ تھا کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی جوانی کے زمانے سے اپنی قوم کو دعوتِ توحید دینا شروع کی اور برابر اس میں لگے رہے، یہاں تک کہ بڑھاپے کے آثار شروع ہو گئے، صالح علیہ السلام کے بار بار اصرار

سے تنگ ہو کر ان کی قوم نے یہ قرار دیا کہ ان سے کوئی ایسا مطالبہ کرو جس کو یہ پورا نہ کر سکیں اور ہم ان کی مخالفت میں سرخرو ہو جائیں۔ مطالبہ یہ کیا کہ اگر آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں تو ہماری فلاں پہاڑی جس کا نام ''کاتبہ'' تھا اس کے اندر سے ایک ایسی اُونٹنی نکال دیجئے جو دس مہینے کی گابھن ہو اور قوی و تندرست ہو۔

صالح علیہ السلام نے اوّل ان سے عہد لیا کہ اگر میں یہ تمہارا مطالبہ پورا کرا دُوں تو تم سب مجھ پر اور میری دعوت پر اِیمان لے آؤ گے۔ جب سب نے معاہدہ کر لیا تو صالح علیہ السلام نے دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ آپ کے لئے تو کوئی کام دُشوار نہیں، ان کا مطالبہ پورا فرما دیں۔ دُعا کرتے ہی پہاڑی کے اندر جنبش پیدا ہوئی، اور اس کی ایک بڑی چٹان پھٹ کر اس میں سے ایک اُونٹنی اُسی طرح کی نکل آئی جیسا مطالبہ کیا تھا۔

صالح علیہ السلام کا یہ کھلا ہوا حیرت انگیز معجزہ دیکھ کر اُن میں سے کچھ لوگ تو مسلمان ہو گئے، اور باقی تمام قوم نے بھی ارادہ کر لیا کہ ایمان لے آئیں، مگر قوم کے چند سردار جو بتوں کے خاص پجاری اور بت پرستی کے اِمام تھے، اُنہوں نے ان کو بہکا کر اسلام قبول کرنے سے روک دیا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے جب دیکھا کہ قوم نے عہد شکنی کی اور خطرہ ہوا کہ ان پر کوئی عذاب آ جائے تو پیغمبرانہ شفقت کی بنا پر ان کو یہ نصیحت فرمائی کہ اس اُونٹنی کی حفاظت کرو، اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ، تو شاید تم عذاب سے محفوظ رہو، ورنہ فوراً تم پر عذاب آ جائے گا۔ یہی مضمون آیتِ مذکورہ کے ان جملوں میں ارشاد ہوا ہے: ''هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ'' یعنی یہ اُونٹنی ہے اللہ کی، جو تمہارے لئے دلیل ہے، سو اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرا کرے، اور اس کو بُرائی کے ساتھ ہاتھ نہ لگانا، ورنہ تم کو عذابِ اَلیم آ پکڑے گا۔ اس ناقہ کو ''ناقۃ اللہ'' اس لئے کہا گیا کہ اللہ کی قدرتِ کاملہ کی دلیل اور صالح علیہ السلام کے معجزے کے طور پر حیرت انگیز طریق سے پیدا ہوئی، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ''رُوح اللہ'' فرمایا گیا کہ اُن کی پیدائش بھی معجزانہ انداز سے ہوئی تھی۔ ''تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ'' میں اس کی

طرف اشارہ ہے کہ اس ناقہ کے کھانے پینے میں تمہاری مِلک اور تمہارے گھر سے کچھ نہیں جاتا، زمین اللہ کی ہے، اس کی پیداوار کا پیدا کرنے والا وہی ہے، اُس کی اُونٹنی کو اُس کی زمین میں آزاد چھوڑ دو کہ عام چراگاہوں میں کھاتی رہے۔

قومِ ثمود جس کنویں سے پانی پیتے پلاتے تھے اُسی سے یہ اُونٹنی بھی پانی پیتی تھی، مگر یہ عجیب الخلقت اُونٹنی جب پانی پیتی تو پورے کنویں کا پانی ختم کر دیتی تھی۔ حضرت صالح علیہ السلام نے باذنِ ربانی یہ فیصلہ فرما دیا تھا کہ ایک دن یہ اُونٹنی پانی پیئے گی اور دُوسرے دن قوم کے سب لوگ پانی لیں گے، اور جس روز یہ اُونٹنی پانی پیئے گی تو دُوسروں کو پانی کے بجائے اُونٹنی کا دُودھ اتنی مقدار میں مل جاتا تھا کہ وہ اپنے سارے برتن اُس سے بھر لیتے تھے۔ قرآن میں دُوسری جگہ اس تقسیم کا ذکر اس طرح آیا ہے: "وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾" (القمر) یعنی صالح علیہ السلام آپ اپنی قوم کو بتلا دیں کہ کنویں کا پانی اُن کے اور ناقۃ اللہ کے درمیان تقسیم ہوگا، ایک دن اُونٹنی کا اور دُوسرے دن پوری قوم کا، اور اس تقسیم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کی نگرانی مسلط ہوگی کہ کوئی اس کے خلاف نہ کر سکے۔ اور ایک دُوسری آیت میں ہے: "هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۵﴾" (الشعراء) یعنی یہ اللہ کی اُونٹنی ہے، ایک دن پانی کا حق اس کا، اور دُوسرے دن کا پانی تمہارے لئے معین و مقرّر ہے۔

دُوسری آیت میں اس وعدہ فراموش، سرکش قوم کی خیرخواہی اور ان کو عذابِ اِلٰہی سے بچانے کے لئے پھر اُن کو اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات یاد دِلائے کہ اب بھی یہ لوگ اپنی سرکشی سے باز آجائیں، فرمایا: "وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ" اس میں "خلفاء" خلیفہ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں قائم مقام اور نائب۔ اور "قصور" قصر کی جمع، اُونچی عالیشان عمارت اور محل کو کہا جاتا ہے۔ "تَنْحِتُوْنَ" نَـحْـتْ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں سنگ تراشی۔ "جِبَال" جبل کی جمع ہے، بمعنی پہاڑ۔ "بُيُوْتًا" بیت کی جمع ہے، جو گھر کے کمرے کے لئے بولا

جاتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ اُس نے قومِ عاد کو ہلاک کرکے اُن کی جگہ تم کو بسایا، اُن کی زمین اور مکانات تمہارے قبضے میں دے دیئے اور تم کو یہ صنعت سکھلا دی کہ کھلی زمین میں بڑے بڑے محلات بنا لیتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر ان میں کمرے اور مکانات بنا لیتے ہو۔ آخرِ آیت میں فرمایا: "فَاذْكُرُوٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ" یعنی اللہ کی نعمتیں یاد کرو اور ان کا احسان مانو، اُس کی اطاعت اختیار کرو اور زمین میں فساد پھیلاتے مت پھرو۔

اَحکام و مسائل

آیاتِ مذکورہ سے چند اُصولی اور فروعی مسائل معلوم ہوئے:۔

اوّل یہ کہ اُصولِ عقائد میں تمام انبیاء علیہم السلام متفق ہیں اور اُن کی شریعتیں متحد ہیں، سب کی دعوت توحید کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا اور اُس کی خلاف ورزی پر عذابِ دُنیا وآخرت سے ڈرانا۔

دُوسرے یہ کہ تمام پچھلی اُمتوں میں ہوتا بھی رہا ہے کہ قوموں کے بڑے دولت مند آبرو دار لوگوں نے ان کی دعوت کو قبول نہیں کیا، اور اُس کے نتیجے میں دُنیا میں بھی ہلاک وبرباد ہوئے اور آخرت میں بھی مستحقِ عذاب ہوئے۔

تیسرے تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں دُنیا میں کافروں پر بھی مبذول ہوتی ہیں، جیسا کہ قومِ عاد وثمود پر اللہ تعالیٰ نے دولت وقوت کے دروازے کھول دیئے تھے۔

چوتھے تفسیر قرطبی ہی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ بڑے بڑے محلات اور عالیشان مکانات کی تعمیر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں، اور اُن کا بنانا جائز ہے۔

یہ دُوسری بات ہے کہ انبیاء واولیاء اللہ نے اس کو اس لئے پسند نہیں فرمایا کہ یہ چیزیں انسان کو غفلت میں ڈال دینے والی ہیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو اُونچی

تعمیرات کے بارے میں ارشادات منقول ہیں، وہ اسی انداز کے ہیں۔

تیسری اور چوتھی آیت میں وہ مکالمہ اور مباحثہ ذکر کیا گیا ہے جو قومِ ثمود کے دو گروہوں کے درمیان ہوا، ایک وہ گروہ جو صالح علیہ السلام پر اِیمان لے آیا تھا، دُوسرا منکرین و کفار کا گروہ، ارشاد فرمایا: "قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ" یعنی کہا قومِ صالح میں سے اُن لوگوں نے جنھوں نے تکبر کیا اُن لوگوں سے جن کو حقیر وضعیف سمجھا جاتا تھا یعنی جو اِیمان لائے تھے۔

اِمام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں فرمایا کہ: اس جگہ ان دونوں گروہوں کے دو وصف قرآنِ کریم نے بتلائے، مگر کفار کا وصف بصیغۂ معروف بتلایا "اِسْتَکْبَرُوْا" اور مؤمنین کا وصف بصیغۂ مجہول بتلایا "اُسْتُضْعِفُوْا" اس میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ کفار کا یہ حال کہ وہ تکبر کرتے تھے خود اُن کا اپنا فعل تھا جو قابلِ مؤاخذہ وملامت اور انجامِ کار موجبِ عذاب ہوا۔ اور مؤمنین کا جو وصف یہ لوگ بیان کرتے تھے کہ وہ ذلیل وحقیر اور ضعیف ہیں، یہ کفار کا کہنا ہے، خود مؤمنین کا واقعی حال اور وصف نہیں جس پر کوئی ملامت ہو سکے بلکہ ملامت ان لوگوں پر ہے جو بلاوجہ ان کو حقیر وضعیف کہتے اور سمجھتے ہیں۔ آگے وہ مکالمہ جو دونوں گروہوں میں ہوا یہ ہے کہ کفار نے مؤمنین سے کہا کہ کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح علیہ السلام اپنے رَبّ کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول ہیں؟

مؤمنین نے جواب دیا کہ: جو ہدایت وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دے کر بھیجے گئے ہیں ہم ان سب پر یقین واِیمان رکھتے ہیں۔

تفسیر کشاف میں ہے کہ قومِ ثمود کے مؤمنین نے کیسا بلیغ جواب دیا ہے کہ تم جس بحث میں پڑے ہوئے ہو کہ یہ رسول ہیں یا نہیں، یہ بات قابلِ بحث ہی نہیں، بلکہ بدیہی اور یقینی ہے، اور یہ بھی یقینی ہے کہ وہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لایا ہوا پیغام ہے، بات کچھ ہو سکتی ہے تو یہ کہ کون اُن پر اِیمان لاتا ہے کون نہیں؟ سو ہم تو بحمد اللہ اُن کی لائی ہوئی سب ہدایات پر اِیمان رکھتے ہیں۔

مگر ان کے بلیغ جواب پر بھی قوم نے وہی سرکشی کی بات کی کہ جس پر تم ایمان لائے ہو، ہم اُس کے منکر ہیں۔ دُنیا کی محبت اور دولت وقوّت کے نشے سے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے کہ وہ انسان کی آنکھوں کا پردہ بن جاتے ہیں اور وہ بدیہی چیزوں کا انکار کرنے لگتا ہے۔

پچھلی آیات میں آچکا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی دُعا سے پہاڑ کی ایک بڑی چٹان شق ہو کر اس سے ایک عجیب وغریب اُونٹنی پیدا ہوگئی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے اس اُونٹنی کو بھی اس قوم کے لئے آخری امتحان اس طرح بنادیا تھا کہ جس کنویں سے ساری بستی کے لوگ اور اُن کے مویشی پانی حاصل کرتے تھے، یہ اس کا سارا پانی پی جاتی تھی، اس لئے صالح علیہ السلام نے ان کے لئے باری مقرّر کردی تھی کہ ایک دن یہ اُونٹنی پانی پیئے، دُوسرے دن بستی والے۔

قومِ ثمود اس اُونٹنی کی وجہ سے ایک تکلیف میں مبتلا تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ ہلاک ہوجائے، مگر خود ایسی حرکت کرنے سے ڈرتے تھے کہ خدا تعالیٰ کا عذاب آجائے گا۔

شیطان کا سب سے بڑا وہ فریب جس میں مبتلا ہو کر اِنسان اپنی ہوش وعقل کھو بیٹھتا ہے، وہ عورت کا فتنہ ہے، قوم کی دو حسین وجمیل عورتوں نے یہ بازی لگادی کہ جو شخص اس ناقہ کو قتل کردے گا ہم اور ہماری لڑکیوں میں سے جس کو چاہے وہ اس کی ہے۔

قوم کے دونو جوان "مِصْدَعْ" اور "قَدَار" اس نشے میں مدہوش ہو کر اس ناقہ کو قتل کرنے کے لئے نکلے اور ناقہ کے راستے میں ایک پتھر کی چٹان کے نیچے چھپ کر بیٹھ گئے، جب ناقہ سامنے آئی تو مصدع نے تیر کا وار کیا اور قدار نے تلوار سے اس کی ٹانگیں کاٹ کر قتل کردیا۔

قرآنِ کریم نے اسی کو قومِ ثمود کا سب سے بڑا شقی اور بدبخت قرار دیا ہے: "اِذِ انۢبَعَثَ اَشْقٰهَا ﴿۱۲﴾" (الشمس) کیونکہ اس کے سبب پوری قوم عذاب میں گرفتار ہوگئی۔

حضرت صالح علیہ السلام نے ناقہ کے قتل کا واقعہ معلوم ہونے کے بعد قوم کو بحکمِ خداوندی بتلادیا کہ اب تمہاری زندگی کے صرف تین دن باقی ہیں، "تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ

اَیَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾" (سورۂ ہود) یعنی تین دن اور اپنے گھروں میں آرام کرلو (اس کے بعد عذاب آنے والا ہے) اور یہ وعدہ سچا ہے اس میں خلاف کا امکان نہیں۔ مگر جس قوم کا وقتِ خراب آجاتا ہے اس کے لئے کوئی نصیحت و تنبیہ کارگر نہیں ہوتی، حضرت صالح علیہ السلام کے اس ارشاد پر بھی ان بدبخت لوگوں نے مذاق اُڑانا شروع کیا اور کہنے لگے کہ: یہ عذاب کیسے اور کہاں سے آئے گا؟ اور اُس کی علامت کیا ہوگی؟

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ: لو عذاب کی علامت بھی سن لو، کل جمعرات کے روز تم سب کے چہرے سخت زرد ہوجائیں گے، مرد و عورت، بچہ بوڑھا کوئی اس سے مستثنیٰ نہ ہوگا، پھر پرسوں جمعہ کے روز سب کے چہرے سخت سرخ ہوجائیں گے اور ترسوں ہفتے کو سب کے چہرے شدید سیاہ ہوجائیں گے، اور یہ دن تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ بدنصیب قوم نے یہ سن کر بھی بجائے اس کے کہ توبہ و اِستغفار کی طرف متوجہ ہوجاتے یہ فیصلہ کیا کہ صالح علیہ السلام ہی کو قتل کردیا جائے، کیونکہ اگر یہ سچے ہیں اور ہم پر عذاب آنا ہی ہے تو ہم اپنے سے پہلے ان کا کام تمام کیوں نہ کردیں، اور اگر جھوٹے ہیں تو اپنے جھوٹ کا خمیازہ بھگتیں۔ قوم کے اس ارادے کا تذکرہ قرآن میں دُوسری جگہ تفصیل سے موجود ہے۔ قوم کے اس متفقہ فیصلے کے ماتحت کچھ لوگ رات کو حضرت صالح علیہ السلام کے مکان پر قتل کے ارادے سے گئے، مگر اللہ تعالیٰ نے راستے ہی میں ان پر پتھر برسا کر ہلاک کردیا: "وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾" (النمل) یعنی اُنہوں نے بھی ایک خفیہ تدبیر کی اور ہم نے بھی ایسی تدبیر کی کہ اُن کو اُس کی خبر نہ ہوئی۔

اور جب جمعرات کی صبح ہوئی تو صالح علیہ السلام کے کہنے کے مطابق سب کے چہرے ایسے زرد ہوگئے جیسے گہرا زرد رنگ پھیر دیا گیا ہو، عذاب کی پہلی علامت کے سچا ہونے کے بعد بھی ظالموں کو اس طرف کوئی توجہ نہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ پر اِیمان لاتے اور اپنی غلط کاریوں سے باز آجاتے، بلکہ ان کا غیظ و غضب حضرت صالح علیہ السلام پر اور بڑھ گیا اور پوری قوم اُن کے قتل کی فکر میں پھرنے لگی۔ اللہ تعالیٰ اپنے قہر سے بچائے، اُس کی بھی

علامات ہوتی ہیں کہ قلوب و دِماغ اوندھے ہو جاتے ہیں، نفع کو نقصان اور نقصان کو نفع، اچھے کو بُرا اور بُرے کو اچھا سمجھنے لگتے ہیں۔

بالآخر دُوسرا دن آیا تو پیش گوئی کے مطابق سب کے چہرے سرخ ہو گئے اور تیسرے دن سخت سیاہ ہو گئے، اب تو یہ سب کے سب اپنی زندگی سے مایوس ہو کر اِنتظار کرنے لگے کہ عذاب کس طرح آتا ہے۔

اسی حال میں زمین سے ایک شدید زلزلہ آیا اور اُوپر سے سخت ہیبت ناک چیخ اور شدید آواز ہوئی، جس سے سب کے سب بیک وقت بیٹھے بیٹھے اوندھے گر کر مر گئے۔ زلزلے کا ذکر تو ان آیات میں موجود ہے جو اُوپر مذکور ہوئی ہیں: "فَاَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ" رجفہ کے معنی ہیں زلزلہ۔

اور دُوسری آیات میں: "فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّيۡحَةُ" بھی آیا ہے، صیحہ کے معنی ہیں چیخ اور شدید آواز۔ دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ دونوں طرح کے عذاب ان پر جمع ہو گئے تھے، زمین سے زلزلہ اور اُوپر سے صیحہ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ: "فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ" جٰثِمِيۡنَ مصدر جثوم سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں بے حس وحرکت ہو کر ایک جگہ پڑ جانا، یا بیٹھ رہنا (قاموس)۔ معنی یہ ہیں کہ جو جس حال میں تھا وہیں ڈھیر ہو گیا، نَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ قَهۡرِهٖ وَعَذَابِهٖ۔

قومِ ثمود کے اس قصے کے اہم اجزاء تو خود قرآنِ کریم کی مختلف سورتوں میں مذکور ہیں، اور کچھ اجزاء رواياتِ حدیث میں مذکور ہیں، کچھ وہ بھی ہیں جو مفسرین نے اسرائیلی روایات سے لئے ہیں، مگر اُن پر کسی واقعے اور حقیقت کے ثبوت کا مدار نہیں۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ غزوۂ تبوک کے سفر میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا گزر اس مقام "حجر" پر ہوا جہاں قومِ ثمود پر عذاب آیا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو ہدایت فرمائی کہ اس عذاب زدہ بستی کی زمین میں کوئی اندر نہ جائے اور نہ اُس کے کنویں کا پانی استعمال کرے۔ (مظہری)

اور بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: قومِ ثمود پر جب عذاب آیا تو ان میں بجز ایک شخص ابورغال کے کوئی نہیں بچا، یہ شخص اس وقت حرمِ مکہ میں پہنچا ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے حرمِ مکہ کے احترام کے سبب اُس وقت اس کو عذاب سے بچالیا اور بالآخر جب یہ حرم سے نکلا تو وہی عذاب جو اس کی قوم پر آیا تھا اس پر بھی آگیا اور یہیں ہلاک ہوگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مکہ سے باہر ابورغال کی قبر کا نشان بھی دِکھلایا اور یہ بھی فرمایا کہ اس کے ساتھ ایک سونے کی چھڑی بھی دفن ہوگئی تھی، صحابہ کرامؓ نے قبر کھولی تو سونے کی چھڑی مل گئی وہ نکال لی۔ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ طائف کے باشندے بنوثقیف اسی ابورغال کی اولاد ہیں۔ (مظہری)

ان معذّب قوموں کی بستیوں کو اللہ تعالیٰ نے آنے والی نسلوں کے لئے عبرت کدے بنا کر قائم رکھا ہے اور قرآنِ کریم نے عرب کے لوگوں کو بار بار اس پر متنبہ کیا ہے کہ تمہارے سفرِ شام کے راستے پر یہ مقامات آج بھی داستانِ عبرت بنے ہوئے ہیں، "لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا"۔

قومِ صالح کے واقعۂ عذاب کے آخر میں ارشاد ہے: "فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ" یعنی قوم پر عذاب نازل ہونے کے بعد حضرت صالح علیہ السلام اور ان پر اِیمان لانے والے مؤمنین بھی اس جگہ کو چھوڑ کر کسی دُوسری جگہ چلے گئے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ چار ہزار مؤمنین تھے، ان سب کو لے کر یمن کے علاقے حضرموت میں چلے گئے اور وہیں حضرت صالح علیہ السلام کی وفات ہوئی۔ اور بعض روایات سے اُن کا مکہ معظمہ چلے جانا اور وہیں وفات ہونا معلوم ہوتا ہے۔

ظاہر عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے چلتے وقت اپنی قوم کو خطاب کرکے فرمایا کہ: اے میری قوم! میں نے تم کو اپنے رَبّ کا پیغام پہنچادیا اور تمہاری خیرخواہی کی مگر افسوس! تم خیرخواہوں کو ہی پسند نہیں کرتے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ساری قوم عذاب سے ہلاک ہوچکی تو اَب ان کو خطاب کرنے سے کیا فائدہ؟ جواب یہ ہے کہ ایک فائدہ تو یہی ہے کہ اُس سے لوگوں کو عبرت ہو اور یہ خطاب ایسا ہی ہے جیسے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر میں مرے ہوئے قریشی مشرکین کو خطاب کرکے کچھ کلمات ارشاد فرمائے تھے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کا یہ فرمانا نزولِ عذاب اور ہلاکتِ قوم سے پہلے ہوا ہو، اگرچہ بیان میں اُس کو مؤخر ذکر کیا ہے۔ (معارف القرآن ج:۳ ص:۶۰۳ تا ۶۱۳)

حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت

ارشادِ ربانی

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٨٥﴾ وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوا إِذْ كُنتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ ۖ وَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿٨٦﴾ وَإِن كَانَ طَائِفَةٌ مِّنكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ وَطَائِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا فَاصْبِرُوا حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿٨٧﴾ (الاعراف)

ترجمہ:- اور مدین کی طرف بھیجا ان کے بھائی شعیب کو، بولا: اے میری قوم! بندگی کرو اللہ کی، کوئی نہیں تمہارا معبود اُس کے سوا، تمہارے پاس پہنچ چکی ہے دلیل تمہارے رَبّ کی طرف سے سو پوری کرو ماپ اور تول، اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو اُن کی چیزیں اور

مت خرابی ڈالو زمین میں اُس کی اصلاح کے بعد، یہ بہتر ہے
تمہارے لئے اگرتم ایمان والے ہو، اور مت بیٹھو راستوں پر کہ ڈراؤ
اور روکو اللہ کے راستے سے اُس کو جو کہ ایمان لائے اُس پر اور ڈھونڈو
اس میں عیب، اور یاد کرو جبکہ تھے تم بہت تھوڑے، پھر تم کو بڑھا دیا،
اور دیکھو کیا ہوا انجام فساد کرنے والوں کا۔ اور اگر تم میں سے ایک
فرقہ ایمان لایا اس پر جو میرے ہاتھ بھیجا گیا اور ایک فرقہ ایمان نہیں
لایا تو صبر کرو جب تک اللہ فیصلہ کرے درمیان ہمارے، اور وہ سب
سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے مدین (والوں) کی طرف ان کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا انہوں نے (اہلِ مدین سے) فرمایا کہ: میری قوم! تم (صرف) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (بننے کے قابل) نہیں، تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے (میرے نبی ہونے پر) واضح دلیل (کہ کوئی معجزہ ہے) آچکی ہے (جب میری نبوّت ثابت ہے) تو (اَحکامِ شرعیہ میں میرا کہنا مانو، چنانچہ میں کہتا ہوں کہ) تم ناپ اور تول پوری پوری کیا کرو اور لوگوں کا ان کی چیزوں میں نقصان مت کیا کرو (جیسا کہ تمہاری عادت ہے)، اور رُوئے زمین میں بعد اس کے کہ (تعلیم وتوحید و بعثتِ انبیاء وایجاب عدل وادائے حقوقِ مکیال ومیزان سے) اس کی دُرستی (تجویز) کردی گئی، فساد مت پھیلاؤ (یعنی ان اَحکام کی مخالفت اور کفر مت کرو کہ موجبِ فساد ہے) یہ (جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرنا) تمہارے لئے (دُنیا وآخرت دونوں میں) نافع ہے اگر تم (میری) تصدیق کرو (جس پر دلیل قائم ہے اور تصدیق کر کے عمل کرو تو اُمورِ مذکورہ دارین میں نافع ہیں، آخرت میں تو ظاہر ہے کہ نجات ہوگی، اور دُنیا میں عمل بالشرع سے امن وانتظام قائم رہتا ہے، خاص کر پورا ناپنے تولنے میں بوجہ اعتبار بڑھنے کے تجارت کو

ترقی ہوتی ہے)، اور تم سڑکوں پر اس غرض سے مت بیٹھا کرو کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو (ایمان لانے پر) دھمکیاں دو اور (ان کو) اللہ کی راہ (یعنی ایمان) سے روکو اور اس (راہ) میں کجی (اور شبہات) تلاش میں لگے رہو (کہ بے جا اعتراض سوچ سوچ کر لوگوں کو بہکاؤ، یہ لوگ ضلال مذکورِ سابق کے ساتھ اس اضلال میں بھی مبتلا تھے کہ سڑکوں پر بیٹھ کر آنے والوں کو بہکاتے کہ شعیب علیہ السلام پر ایمان نہ لانا، نہیں تو ہم تم کو مار ڈالیں گے۔ آگے تذکیرِ نعمت سے ترغیب اور تذکیرِ نقمت سے ترہیب ہے، یعنی) اور اس حال کو یاد کرو جبکہ تم (شمار میں یا مال میں) کم تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تم کو (شمار یا مال میں) زیادہ کر دیا (یہ تو ترغیب تھی ایمان لانے پر) اور دیکھو تو کیسا بُرا انجام ہوا فساد (یعنی کفر و تکذیب وظلم) کرنے والوں کا (جیسے قومِ نوح اور عاد اور ثمود گزر چکے ہیں، اسی طرح تم پر عذاب آنے کا اندیشہ ہے، یہ ترہیب ہے کفر پر) اور اگر (تم کو عذاب نہ آنے کا اس سے شبہ ہو کہ) تم میں سے بعضے (تو) اس حکم پر جس کو دے کر مجھ کو بھیجا گیا ہے ایمان لائے ہیں اور بعضے ایمان نہیں لائے (اور پھر بھی دونوں فریق ایک ہی حالت میں ہیں، یہ نہیں کہ ایمان نہ لانے والوں پر عذاب آگیا ہو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا عذاب سے ڈرانا بے اصل ہے) تو (اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ فوراً عذاب نہ آنے سے کیسے معلوم ہوا کہ عذاب نہ آئے گا) ذرا ٹھہر جاؤ یہاں تک کہ ہمارے (یعنی دونوں فریق کے) درمیان میں اللہ تعالیٰ (عملی) فیصلہ کئے دیتے ہیں (یعنی عذاب نازل کر کے مؤمنین کو نجات دیں گے اور کفار کو ہلاک کریں گے) اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہیں (کہ ان کا فیصلہ بالکل مناسب ہی ہوتا ہے)۔

معارف ومسائل

انبیاء علیہم السلام کے قصص جن کا سلسلہ گزشتہ آیات سے چل رہا ہے، اُن میں پانچواں قصہ حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا ہے، جو آیاتِ متذکرہ میں بیان ہوا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام، محمد بن اسحاق کی روایت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے ''مدین'' کی اولاد میں سے ہیں اور حضرت لوط علیہ السلام سے بھی رشتۂ قرابت رکھتے ہیں۔ ''مدین'' حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں، ان کی نسل واولاد بھی ''مدین'' کے نام سے معروف ہوگئی اور جس بستی میں ان کا قیام تھا اُس کو بھی ''مدین'' کہتے ہیں۔ گویا ''مدین'' ایک قوم کا بھی نام ہے اور ایک شہر کا بھی۔ یہ شہر آج بھی شرقِ اُردُن کی بندرگاہ ''معان'' کے قریب موجود ہے۔ قرآنِ کریم میں دُوسری جگہ موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں ارشاد ہے: "وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ" اس میں یہی بستی مراد ہے (ابنِ کثیر)۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو اُن کے حسنِ بیان کی وجہ سے خطیب الانبیاء کہا جاتا تھا (ابنِ کثیر، بحرِ محیط)۔

حضرت شعیب علیہ السلام جس قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں، قرآنِ کریم نے کہیں اُن کا اہلِ مدین اور اَصحابِ مدین کے نام سے ذکر کیا ہے اور کہیں ''اَصحابُ الایکہ'' کے نام سے۔ "اَیکَہ" کے معنی جنگل اور بن کے ہیں۔

بعض حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ یہ دونوں قومیں الگ الگ تھیں، دونوں کی بستیاں بھی الگ تھیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام ان میں سے پہلے ایک قوم کی طرف بھیجے گئے، ان کی ہلاکت کے بعد دُوسری قوم کی طرف مبعوث فرمائے گئے۔ دونوں قوموں پر جو عذاب آیا اُس کے الفاظ بھی مختلف ہیں، اَصحابِ مدین پر کہیں ''صیحہ'' اور کہیں ''رجفہ'' مذکور ہے، اور اَصحابِ ایکہ پر ''عذاب ظلہ'' ذکر کیا گیا ہے۔ ''صیحہ'' کے معنی چنگھاڑ اور سخت آواز کے، اور ''رجفہ'' کے معنی زلزلہ ہیں، اور ''ظلہ'' سائبان کو کہا جاتا ہے۔ اَصحابِ ایکہ پر عذاب کی یہ صورت ہوئی کہ اوّل چند روز ان کی پوری بستی میں سخت گرمی پڑی، جس سے ساری قوم بلبلا اُٹھی، پھر اُن کے قریب جنگل پر ایک گہرا بادل آیا جس سے اُس جنگل میں سایہ ہوگیا، اور ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں، یہ دیکھ کر سارے بستی کے آدمی اس بادل کے سایہ

میں جمع ہو گئے، اس طرح یہ خدائی مجرم بغیر کسی وارنٹ اور سپاہی کے اپنے پاؤں چل کر اپنی ہلاکت کی جگہ پہنچ گئے، جب سب جمع ہو گئے تو بادل سے آگ برسی اور زمین میں بھی زلزلہ آیا جس سے یہ سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

اور بعض حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ اُصحابِ مدین اور اُصحابِ ایکہ ایک ہی قوم کا نام ہے اور عذاب کی جو تین قسمیں ابھی ذکر کی گئی ہیں، تینوں اسی قوم پر جمع ہو گئیں، پہلے بادل سے آگ برسی، پھر اُس کے ساتھ سخت آواز چنگھاڑ کی شکل میں آئی، پھر زمین میں زلزلہ آیا۔ ابنِ کثیرؒ نے اسی کو اِختیار کیا ہے۔

بہر حال یہ دونوں قومیں الگ الگ ہوں یا ایک ہی قوم کے دو نام ہوں، حضرت شعیب علیہ السلام نے جو پیغامِ حق ان کو دیا وہ پہلی اور دُوسری آیات میں مذکور ہے، اس پیغام کی تفسیر سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ اسلام جو تمام انبیاء علیہم السلام کی مشترک دعوت ہے، اس کا خلاصہ ادائے حقوق ہے، پھر حقوق دو قسم کے ہیں، ایک براہِ راست اللہ تعالیٰ کا حق جس کے کرنے یا چھوڑنے سے انسانوں کا کوئی معتد بہ نفع نقصان متعلق نہیں، جیسے عبادات، نماز روزہ وغیرہ۔ دُوسرے حقوق العباد جن کا تعلق انسانوں سے ہے، اور یہ قوم ان دونوں حقوق سے بے خبر اور دونوں کے خلاف کام کر رہی تھی۔

یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولوں پر اِیمان نہ لا کر حقوق اللہ کی خلاف ورزی کر رہے تھے اور اس کے ساتھ خرید و فروخت میں ناپ تول گھٹا کر لوگوں کے حقوق کو ضائع کر رہے تھے، اور اُس پر مزید یہ کہ راستوں اور سڑکوں کے دہانوں پر بیٹھ جاتے اور آنے والوں کو ڈرا دھمکا کر لوٹتے اور شعیب علیہ السلام پر اِیمان لانے سے روکتے تھے، اس طرح رُوئے زمین پر فساد مچا رکھا تھا۔ یہ ان کے شدید جرائم تھے جن کی اصلاح کے لئے حضرت شعیب علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا۔

آیاتِ مذکورہ میں سے پہلی دو آیتوں میں اس قوم کی اصلاح کے لئے حضرت

شعیب علیہ السلام نے تین باتیں فرمائیں، اوّل: "يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ" یعنی اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، اُس کے سوا کوئی تمہارا معبود بننے کے لائق نہیں۔

یہ وہی دعوتِ توحید ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام دیتے آئے ہیں اور جو تمام عقائد و اعمال کی رُوح ہے، چونکہ یہ قوم بھی مخلوق پرستی میں مبتلا اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اُس کے حقوق سے غافل تھی اس لئے اُن کو بھی سب سے پہلے یہی پیغام دیا گیا، اور فرمایا: "قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ" یعنی تمہارے پاس تمہارے رَبّ کی طرف سے واضح دلیل آچکی ہے، یہاں "واضح دلیل" سے مراد وہ معجزات ہیں جو حضرت شعیب علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے، تفسیر بحرِ محیط میں مختلف صورتیں ان کے معجزات کی ذکر کی ہیں۔

دُوسری بات یہ فرمائی: "فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ" اس میں "کیل" کے معنی ناپ اور "میزان" بمعنی وزن تولنے کے معنی میں ہیں، اور "بخس" کے معنی کسی کے حق میں کمی کر کے نقصان پہنچانے کے ہیں۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم ناپ تول پورا کیا کرو اور لوگوں کی چیزوں میں کمی کر کے اُن کو نقصان نہ پہنچایا کرو۔

اس میں پہلے تو ایک خاص جرم سے منع فرمایا گیا جو خرید و فروخت کے وقت ناپ تول میں کمی کی صورت سے کیا جاتا تھا، بعد میں "وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ" فرما کر ہر طرح کے حقوق میں کتر بیونت اور کمی کوتاہی کو عام کر دیا، خواہ وہ مال سے متعلق ہو یا عزّت و آبرو سے یا کسی دُوسری چیز سے۔ (بحرِ محیط)

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ناپ تول میں حق سے کم دینا حرام ہے، اسی طرح دُوسرے حقوقِ انسانی میں کمی کرنا بھی حرام ہے، کسی کی عزّت و آبرو پر حملہ کرنا، یا کسی کے درجے اور رُتبے کے موافق اس کا احترام نہ کرنا، جس جس کی اطاعت واجب ہے اُن کی اطاعت میں کوتاہی کرنا، یا جس شخص کی تعظیم و تکریم واجب ہے اُس میں کوتاہی برتنا، یہ سب اُمور اسی جرم میں داخل ہیں جو شعیب علیہ السلام کی قوم کیا کرتی تھی۔ حجۃ الوداع کے خطبے

میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی آبروکواُن کے خون کے برابرواجب الاحترام اورقابلِ حفاظت قراردیاہے،اس کا بھی حاصل یہی ہے۔

قرآن مجید میں جہاں "مُطَفِّفِیْنَ" اور "تَطفیف" کاذکرآیاہےاُس میں یہ سب چیزیں داخل ہیں۔حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کوجلدی جلدی رُکوع سجدے کرتے ہوئے دیکھاتوفرمایا:"قد طفّفت"یعنی تونے ناپ تول میں کمی کردی (مؤطاامام مالکؒ)۔مرادیہ ہے کہ نماز کا جوحق تھاوہ تونے پورانہ کیا۔اس میں حقِ نماز پورااُدا نہ کرنے کوتطفیف کےلفظ سے تعبیرکیاگیاہے۔ (معارف القرآن ج:۳ ص:۶۲۱)

حضرت یوسف علیہ السلام کی دعوت

ارشادِ ربانی

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۗ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۗ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ۗ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ۗ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۗ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۗ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۗ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۗ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۗ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾ (یوسف)

ترجمہ:-اور داخل ہوئے قید خانے میں اس کے ساتھ دو جوان، کہنے لگا ان میں سے ایک: میں دیکھتا ہوں کہ میں نچوڑتا ہوں شراب، اور دُوسرے نے کہا کہ: میں دیکھتا ہوں کہ اُٹھا رہا ہوں اپنے سر پر روٹی کہ جانور کھاتے ہیں اس میں سے، بتلا ہم کو اس کی تعبیر، ہم دیکھتے ہیں تجھ کو نیکی والا۔ بولا: نہ آنے پائے گا تم کو کھانا جو ہر روز تم کو ملتا ہے مگر بتا چکوں گا تم کو اس کی تعبیر اس کے آنے سے پہلے، یہ علم ہے کہ مجھ کو سکھایا میرے رَبّ نے، میں نے چھوڑا دِین اس قوم کا کہ ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور آخرت سے وہ لوگ منکر ہیں، اور پکڑا میں نے دِین اپنے باپ دادوں کا ابراہیم اور اِسحاق اور یعقوب کا، ہمارا کام نہیں کہ شریک کریں اللہ کا کسی چیز کو، یہ فضل ہے اللہ کا ہم پر اور سب لوگوں پر لیکن بہت لوگ احسان نہیں مانتے۔ اے رفیقو قید خانے کے! بھلا کئی معبود جدا جدا بہتر یا اللہ اکیلا زبردست۔ کچھ نہیں پوجتے ہو سوائے اس کے مگر نام ہیں جو رکھ لیئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے، نہیں اُتاری اللہ نے ان کی کوئی سند، حکومت نہیں ہے کسی کی سوائے اللہ کے، اس نے فرمادیا کہ نہ پوجو مگر اسی کو، یہی ہے راستہ سیدھا، پر بہت لوگ نہیں جانتے۔

خلاصۂ تفسیر

اور یوسف (علیہ السلام) کے ساتھ (یعنی اس زمانے میں) اور بھی دو غلام (بادشاہ کے) جیل خانے میں داخل ہوئے (جن میں ایک ساقی تھا، دُوسرا روٹی پکانے والا باورچی، اور ان کی قید کا سبب یہ شبہ تھا کہ انہوں نے کھانے میں اور شراب میں زہر ملاکر بادشاہ کو دیا ہے، ان کا مقدمہ زیرِ تحقیق تھا اس لئے قید کردیئے گئے، انہوں نے جو حضرت

یوسف علیہ السلام میں بزرگی کے آثار پائے تو) ان میں سے ایک نے (حضرت یوسف علیہ السلام سے) کہا کہ: میں اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ (جیسے) شراب (بنانے کے لئے انگور کا شیرہ) نچوڑ رہا ہوں (اور بادشاہ کو وہ شراب پلا رہا ہوں) اور دُوسرے نے کہا کہ: میں اپنے کو اس طرح دیکھتا ہوں کہ (جیسے) اپنے سر پر روٹیاں لئے جاتا ہوں (اور) اس میں سے پرندے (نوچ نوچ کر) کھاتے ہیں، ہم کو اس خواب کی (جو ہم دونوں نے دیکھا ہے) تعبیر بتلایئے، آپ ہم کو نیک آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ یوسف (علیہ السلام) نے (جب یہ دیکھا کہ یہ لوگ اعتقاد کے ساتھ میری طرف مائل ہوئے ہیں تو چاہا کہ ان کو سب سے پہلے ایمان کی دعوت دی جائے، اس لئے اوّل اپنا نبی ہونا ایک معجزے سے ثابت کرنے کے لئے) فرمایا کہ (دیکھو) جو کھانا تمہارے پاس آتا ہے جو کہ تم کو کھانے کے لئے (جیل خانے میں) ملتا ہے میں اس کے آنے سے پہلے اس کی حقیقت تم کو بتلا دیا کرتا ہوں (کہ فلاں چیز آوے گی اور ایسی ایسی ہوگی اور) یہ بتلا دینا اس علم کی بدولت ہے جو مجھ کو میرے رَبّ نے تعلیم فرمایا ہے (یعنی مجھ کو وحی سے معلوم ہو جاتا ہے، تو یہ ایک معجزہ ہے جو دلیلِ نبوّت ہے اور اس وقت یہ معجزہ خاص طور پر اس لئے مناسب تھا کہ جس واقعے میں قیدیوں نے تعبیر کے لئے ان کی طرف رُجوع کیا، وہ واقعہ بھی کھانے ہی سے متعلق تھا، اِثباتِ نبوّت کے بعد آگے اِثباتِ توحید کا مضمون بیان فرمایا کہ) میں نے ان لوگوں کا مذہب (پہلے ہی سے) چھوڑ رکھا ہے جو اللہ پر اِیمان نہیں لائے اور وہ لوگ آخرت کے بھی منکر ہیں، اور میں نے اپنے ان (بزرگوار) باپ دادوں کا مذہب اختیار کر رکھا ہے ابراہیم کا اور اِسحاق کا اور یعقوب کا (علیہم السلام، اور اس مذہب کا رُکنِ اعظم یہ ہے کہ) ہم کو کسی طرح زیبا نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریکِ (عبادت) قرار دیں، یہ (عقیدۂ توحید) ہم پر اور (دُوسرے) لوگوں پر (بھی) خدا تعالیٰ کا ایک فضل ہے (کہ اس کی بدولت دُنیا و آخرت کی فلاح ہے) لیکن اکثر لوگ (اس نعمت کا) شکر (ادا) نہیں کرتے (یعنی توحید کو اِختیار نہیں کرتے) اے قیدخانے کے رفیقو! (ذرا سوچ کر بتلاؤ کہ عبادت

کے واسطے) متفرق معبود اچھے ہیں یا ایک معبودِ برحق جو سب سے زبردست ہے وہ اچھا۔ تم لوگ تو خدا کو چھوڑ کر صرف چند بے حقیقت ناموں کی عبادت کرتے ہو جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے (آپ ہی) ٹھہرالیا ہے، خدا تعالیٰ نے تو اُن (کے معبود ہونے) کی کوئی دلیل (عقلی یا نقلی) بھیجی نہیں (اور) حکم خدا ہی کا ہے، اس نے یہ حکم دیا ہے کہ بجز اس کے اور کسی کی عبادت مت کرو، یہی (توحید اور عبادت صرف حق تعالیٰ کے لئے مخصوص کرنا) سیدھا طریقہ ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اَحکام ومسائل

آیاتِ مذکورہ سے بہت سے اَحکام و مسائل اور فوائد و ہدایات حاصل ہوتے ہیں، ان میں غور کیجئے:-

پہلا مسئلہ:- یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام جیل میں بھیجے گئے جو مجرموں اور بدمعاشوں کی بستی ہوتی ہے، مگر یوسف علیہ السلام نے ان کے ساتھ بھی حسنِ اخلاق، حسنِ معاشرت کا وہ معاملہ کیا جس سے یہ سب گرویدہ ہوگئے، جس سے معلوم ہوا کہ مصلحین کے لئے لازم ہے کہ مجرموں، خطاکاروں سے شفقت و ہمدردی کا معاملہ کرکے ان کو اپنے سے مانوس و مربوط کریں، کسی قدم پر منافرت کا اظہار نہ ہونے دیں۔

تیسرا مسئلہ:- یہ معلوم ہوا کہ حق کی دعوت دینے والوں اور اصلاحِ خلق کی خدمت کرنے والوں کا طرزِ عمل یہ ہونا چاہئے کہ پہلے اپنے حسنِ اخلاق اور علمی و عملی کمالات کے ذریعہ خلق اللہ پر اپنا اعتماد قائم کریں، خواہ اس میں اُن کو کچھ اپنے کمالات کا اظہار بھی کرنا پڑے، جیسا یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر اپنا معجزہ بھی ذکر کیا اور اپنا خاندانِ نبوّت کا ایک فرد ہونا بھی ظاہر کیا، یہ اظہارِ کمال اگر اصلاحِ خلق کی نیت سے ہو، اپنی ذاتی بڑائی ثابت کرنے کے لئے نہ ہو، تو یہ وہ تزکیۂ نفس نہیں جس کی ممانعت قرآنِ کریم میں آئی ہے: "فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ" (النجم:۳۲) یعنی اپنی پاک نفسی کا اظہار نہ کرو۔ (تفسیر مظہری)

چوتھا مسئلہ:- تبلیغ وارشاد کا ایک اہم اُصول یہ بتلایا گیا ہے کہ داعی اور مصلح کا فرض ہے کہ ہر وقت، ہر حال میں اپنے وظیفۂ دعوت وتبلیغ کو سب کاموں سے مقدّم رکھے، کوئی اس کے پاس کسی کام کے لئے آئے، وہ اپنے اصلی کام کو نہ بھولے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس یہ قیدی تعبیرِ خواب دریافت کرنے کے لئے آئے تو یوسف علیہ السلام نے تعبیرِ خواب کے جواب سے پہلے دعوت وتبلیغ کے ذریعے ان کو رُشد وہدایت کا تحفہ عطا فرمایا، یہ نہ سمجھے کہ دعوت وتبلیغ کسی جلسے، یا کسی منبر یا اِسٹیج ہی پر ہوا کرتی ہے، شخصی ملاقاتوں اور نجی مذاکروں کے ذریعے یہ کام اس سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

پانچواں مسئلہ:- بھی اسی ارشاد واصلاح سے متعلق ہے کہ حکمت کے ساتھ وہ بات کہی جائے جو مخاطب کے دِلنشین ہو سکے، جیسا یوسف علیہ السلام نے ان کو یہ دِکھلایا کہ مجھے جو کوئی کمال حاصل ہوا وہ اس کا نتیجہ ہے کہ میں نے ملتِ کفر کو چھوڑ کر ملتِ اسلام کو اِختیار کیا، اور پھر کفر وشرک کی خرابیاں دِلنشین انداز میں بیان فرمائیں۔

چھٹا مسئلہ:- اس سے یہ ثابت ہوا کہ جو معاملہ مخاطب کے لئے تکلیف دہ اور ناگوار ہو اور اس کا اظہار ضروری ہو تو مخاطب کے سامنے جہاں تک ممکن ہو ایسے انداز سے ذکر کیا جائے کہ اس کو تکلیف کم سے کم پہنچے، جیسے تعبیرِ خواب میں ایک شخص کی ہلاکت متعین تھی، مگر یوسف علیہ السلام نے اس کو مبہم رکھا، یہ متعین کر کے نہیں کہا کہ تم سولی چڑھائے جاؤ گے (ابنِ کثیر، مظہری)۔ (معارف القرآن ج:۵ ص:۱۵۴)

❋❋❋

پانچواں باب

دعوتِ دِین کے ذرائع اور وسائل

''رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ طیبہ سے قبل عرب جہالت کے اندھیروں میں بھٹک رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبیٔ رحمت بنا کر مبعوث فرمایا اور پہلی وحی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اسی میں حصولِ علم و معرفت کا بیان ہوا، اور بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے قلم کو حصولِ علم کا بہترین ذریعہ بنایا ہے۔

داعی کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ دعوتِ دِین کے کام میں زبان وقلم کے دونوں ذرائع کو اِستعمال کرے اور دعوت سے قبل اپنے آپ کو علم وعمل سے آراستہ کرے، یعنی دعوتِ دِین کے اہم ترین ذرائع یہ تین ہیں، پہلا ذریعہ تحریر، دُوسرا تقریر اور تیسرا عملی نمونہ۔''

پہلا ذریعہ-تحریر

ارشادِ ربانی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۝۲ اِقۡرَاۡ وَرَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ ۝۳ الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۝۴ (العلق)

ترجمہ:- پڑھ اپنے رَبّ کے نام سے جو سب کا بنانے والا ہے۔ بنایا

آدمی کو جمے ہوئے لہو سے۔ پڑھ اور تیرا رَبّ بڑا کریم ہے، جس نے علم سکھایا قلم سے۔

خلاصہ تفسیر

اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (پر جو) قرآن (نازل ہوا کرے گا جس میں اس وقت کی نازل ہونے والی آیتیں بھی داخل ہیں) اپنے رَبّ کا نام لے کر پڑھا کیجئے (یعنی جب پڑھئے تو "بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" کہہ کر پڑھا کیجئے، جیسا کہ اس آیت میں: "فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ...الخ" میں قرآن کے ساتھ اعوذ باللہ پڑھنے کا حکم ہوا ہے اور ان دونوں اُمور سے جو اَصل مقصود ہے یعنی توکل و اِستعانت وہ تو واجب ہے اور زبان سے کہہ لینا مسنون و مندوب ہے، اور گو اصل مقصود کے اعتبار سے اس آیت کے نزول کے وقت بسم اللہ کا آپ کو معلوم ہونا ضروری نہیں لیکن بعض روایات میں اس سورت کے ساتھ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کا نازل ہونا بھی آیا ہے۔ أخرجه الواحدي عن عكرمة والحسن انهما قالا: ما نزل بسم الله الرحمٰن الرحيم وأوّل سورة اقرأ، وأخرجه ابن جرير وغيره عن ابن عباس انّه قال: أوّل ما نزل جبريل عليه السلام على النبي صلى الله عليه وسلم قال: يا محمد! استعذ ثم قل بسم الله الرحمٰن الرحيم۔ كذا في رُوح المعاني۔ اور ان آیتوں میں جو قرأۃ کو اِسم اِلٰہی کے ساتھ افتتاح کرنے کا حکم ہوا ہے، اس حکم میں خود ان آیتوں کا داخل ہونا ایسا ہے کہ جیسے کوئی شخص دُوسرے سے کہے کہ: "اِسۡمَعۡ مَا اَقُوۡلُ لَکَ" یعنی میں جو کچھ تجھ سے کہوں تو اس کو سن، تو خود اس جملے کے سننے کا حکم کرنا بھی اس کو مقصود ہے، پس حاصل یہ ہوگا کہ خواہ ان آیتوں کو پڑھو یا جو آیات بعد میں نازل ہوں گی ان کو پڑھو سب کی قراءت اسمِ اِلٰہی سے ہونا چاہئے اور آپ کو بعلم ضروری معلوم ہوگیا کہ یہ قرآن اور وحی ہے۔ اور حدیثوں میں جو آپ صلی اللہ

علیہ وسلم کا ڈر جانا اور ورقہ ابن نوفل سے بیان کرنا آیا ہے وہ بوجہ شبہ کے نہ تھا بلکہ خوف وہیبتِ وحی سے اضطراری تھا اور ورقہ سے بیان کرنا مزید اطمینان وزیادتِ ایقان کے لئے تھا، نہ کہ عدمِ ایقان کے سبب، اور معلّم متعلّم سے ابجد شروع کرانے کے وقت کہتا ہے کہ ہاں پڑھ! پس اس سے تکلیف مالا یطاق لازم نہیں آتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عذر فرمانا یا تو اس وجہ سے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جملے کے معنی متعین نہ ہوئے ہوں کہ مجھ سے کیا پڑھوانا چاہتے ہیں اور یہ اَمر کوئی خلافِ شان نہیں ہے، یا باوجود تعیینِ مراد کے اس سبب سے ہے کہ قراءت کا استعمال اکثر لکھی ہوئی چیز کو پڑھنے کے معنی میں آتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوجہ حرف شناس نہ ہونے کے یہ عذر فرمایا ہو اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کا دبانا بظنِ غالب واللہ اعلم بحقیقۃ الحال اس لئے ہوگا کہ آپ کے اندر بارِ وحی کے تحمّل کی استعداد پیدا کردیں اور لفظ رَبّ سے اشارہ اس طرف ہے کہ ہم آپ کی مکمل تربیت کریں گے اور نبوّت کے درجاتِ اعلیٰ پر پہنچادیں گے، آگے رَبّ کی صفت ہے یعنی وہ ایسا رَبّ ہے) جس نے (مخلوقات کو) پیدا کیا (اس وصف کی تخصیص میں یہ نکتہ ہے کہ حق تعالیٰ کی نعمتوں میں اوّل ظہور اس نعمت کا ہوتا ہے تو تذکیر میں اس کا مقدّم ہونا مناسب ہے اور نیز خلق دلیل ہے خالق پر اور سب سے اہم اور اَقدم معرفت خالق ہے، آگے بطور تخصیص بعد تعیم کے ارشاد ہے کہ) جس نے (سب مخلوقات میں سے بالخصوص) انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا (اس تخصیص کے بعد تعیم میں اشارہ ہے کہ نعمتِ خلق میں بھی عام مخلوقات سے زیادہ انسان پر اِنعام ہے کہ اس کو کس درجے تک ترقی دی کہ صورت کیسی بنائی، عقل وعلم سے مشرف بنایا، پس انسان کو زیادہ شکر اور ذکر کرنا چاہئے، اور تخصیص علق کی شاید اس لئے ہے کہ یہ ایک برزخی حالت ہے کہ اس کے قبل نطفہ اور غذا وعنصر ہے اور اس کے بعد مضغہ اور ترکیبِ عظام ونفخ رُوح ہے، پس گویا وہ جمیع احوالِ متقدمہ ومتاخرہ کے درمیان ہے، آگے قراءت کو مقصدِ اہم قرار دینے کے لئے ارشاد ہے) آپ قرآن پڑھا

کیجئے (حاصل یہ کہ پہلے امر یعنی اقرأ باسم ربک سے یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہاں اصل مقصود ذکر اسم اللہ ہے، بلکہ قراءت خود بھی فی نفسہا مقصود ہے کیونکہ تبلیغ کا ذریعہ یہی قراءت ہے، اور تبلیغ ہی اصل کام صاحبِ وحی کا ہے، پس اس تکرار میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت اور مامور بالتبلیغ ہونے کا اظہار بھی ہوگیا اور آگے اُس عذر کو رفع کردینے کی طرف اشارہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اوّل جبریل علیہ السلام سے پیش کیا تھا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، اس کے لئے ارشاد فرمایا کہ) آپ کا رَبّ بڑا کریم ہے (جو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور وہ ایسا ہے) جس نے (لکھے پڑھوں کو نوشتہ) قلم سے تعلیم دی۔

"اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ" یہاں لفظ "اِقْرَاْ" کو مکرّر لایا گیا ہے، جس کی ایک وجہ خلاصۂ تفسیر میں آچکی ہے، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پہلا اقرأ تو خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑھنے کے لئے فرمایا تھا، یہ دُوسرا تبلیغ ودعوت اور لوگوں کو پڑھانے کے لئے فرمایا، اور اگر محض تاکید کے لئے تکرار ہو تو وہ بھی کچھ بعید نہیں۔ اور صفت "اکرم" میں اس طرف اشارہ ہے کہ تخلیقِ عالم اور تخلیقِ انسان میں اللہ تعالیٰ کی اپنی کوئی غرض اور نفع نہیں بلکہ یہ سب بتقاضائے جود وکرم ہے کہ بے مانگے کائنات کو وجود کی نعمتِ عظمیٰ عطا فرمائی۔

"الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" تخلیقِ انسانی کے بعد اُس کی تعلیم کا بیان ہے، کیونکہ تعلیم ہی وہ چیز ہے جو اِنسان کو دُوسرے تمام حیوانات سے ممتاز اور تمام مخلوقات سے اشرف واعلیٰ بناتی ہے، پھر تعلیم کی عام صورتیں دو ہیں، ایک زبانی تعلیم، دُوسرے بذریعہ قلم وتحریر وخط سے۔ ابتدائے سورت میں لفظ "اِقْرَاْ" میں اگرچہ زبانی تعلیم ہی کی ابتدا ہے مگر اس آیت میں جہاں تعلیم دینے کا بیان آیا ہے اس میں قلمی تعلیم کو مقدّم کرکے بیان فرمایا ہے۔

قلم اور کتابت اوّلین ذریعۂ تعلیم

ایک صحیح حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے جس میں رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لما خلق اللہ الخلق کتب فی کتابہ فھو عندہ فوق العرش، ان رحمتی غلبت غضبی" یعنی اللہ تعالیٰ نے ازل میں جب مخلوق کو پیدا کیا تو اپنی کتاب میں جو عرش پر خدا تعالیٰ کے پاس ہے یہ کلمہ لکھا کہ: ''میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی''۔

اور حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أوّل ما خلق اللہ القلم، فقال لہ: أکتب! فکتب ما یکون الی یوم القیامۃ فھو عندہ فی الذّکر فوق عرشہ" یعنی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا اور اس کو حکم دیا کہ لکھے، اُس نے تمام چیزیں جو قیامت تک ہونے والی تھیں لکھ دیں، یہ کتاب اللہ تعالیٰ کے پاس عرش پر ہے۔ (قرطبی)

قلم کی تین قسمیں

علماء نے فرمایا ہے کہ عالم میں قلم تین ہیں، ایک سب سے پہلا قلم جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور تقدیرِ کائنات لکھنے کا اُس کو حکم دیا۔ دُوسرے فرشتوں کے قلم جس سے وہ تمام ہونے والے واقعات اور اُن کی مقادیر کو، نیز اِنسانوں کے اعمال کو لکھتے ہیں۔ تیسرے عام انسانوں کے قلم جن سے وہ اپنے کلام لکھتے اور اپنے مقاصد میں کام لیتے ہیں، اور کتابت درحقیقت بیان کی ایک قسم ہے، اور بیان انسان کی مخصوص صفت ہے (قرطبی)۔ اور اِمامِ تفسیر مجاہد رحمہ اللہ نے ابوعمرو سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات میں چار چیزیں اپنے دستِ قدرت سے خود بنائیں، اور اُن کے سوا باقی مخلوقات کے لئے حکم دیا "کُنْ" یعنی ہوجا، وہ موجود ہوگئیں، یہ چار چیزیں یہ ہیں: قلم، عرش، جنتِ عدن، آدم علیہ السلام۔

علمِ کتابت سب سے پہلے کس کو عطا ہوا؟

بعض حضرات نے فرمایا کہ سب سے پہلے یہ فنِ کتابت ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو سکھایا گیا تھا اور سب سے پہلے انہوں نے لکھنا شروع کیا (کعب احبار)۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سب سے پہلے یہ فن حضرت ادریس علیہ السلام کو ملا ہے، اور سب سے پہلے کاتب دُنیا میں وہی ہیں (ضحاک)۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر شخص جو کتابت کرتا ہے وہ تعلیم من جانب اللہ ہی ہے۔

خط و کتابت اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے

حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ: قلم اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو نہ کوئی دِین قائم رہتا، نہ دُنیا کے کاروبار دُرست ہوتے۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا اکرم یہ ہے کہ اُس نے اپنے بندوں کو اُن چیزوں کا علم دیا جن کو وہ نہیں جانتے تھے اور اُن کو جہل کی اندھیری سے نورِ علم کی طرف نکالا اور علمِ کتابت کی ترغیب دی کیونکہ اُس میں بے شمار اور بڑے منافع ہیں جن کا اللہ کے سوا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔ تمام علوم و حِکَم کی تدوین اور اوّلین و آخرین کی تاریخ ان کے حالات و مقالات اور اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتابیں سب قلم ہی کے ذریعے لکھی گئیں اور رہتی دُنیا تک باقی رہیں گی، اگر قلم نہ ہو تو دُنیا و دِین کے سارے ہی کام مختل ہو جائیں۔

علمائے سلف و خلف نے ہمیشہ تعلیمِ خط و کتابت کا بڑا اہتمام کیا ہے جس پر اُن کی تصانیف کے عظیم الشان ذخائر آج تک شاہد ہیں، افسوس ہے کہ ہمارے اس دور میں علماء وطلباء نے اس اہم ضرورت کو ایسا نظر انداز کیا ہے کہ سینکڑوں میں دو چار آدمی مشکل سے تحریرِ کتابت کے جاننے والے نکلتے ہیں، فالی اللہ المشتکیٰ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اُمیّت

حق تعالیٰ جل شانہٗ نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو لوگوں کے فکر وقیاس سے بالاتر بنانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش سے لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی حالات تک سب ایسے بنائے تھے کہ جن میں کوئی انسان اپنی ذاتی کوشش ومحنت سے کوئی کمال حاصل نہیں کرسکتا۔ جائے پیدائش کے لئے عرب کا صحرا تجویز ہوا جو متمدن دُنیا اور علم وحکمت کے گہواروں سے بالکل کٹا ہوا تھا اور راستے اور مواصلات اتنے دُشوارگزار تھے کہ شام وعراق اور مصر وغیرہ کے متمدن شہروں سے یہاں کے لوگوں کا کوئی جوڑ نہ تھا، اسی لئے عرب سب کے سب ہی اُمیّین کہلاتے ہیں، ایسے ملک اور ایسے قبائل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور پھر حق تعالیٰ نے ایسے سامان کئے کہ عرب کے لوگوں میں جو خال خال کوئی علم وحکمت اور خط وکتابت سیکھ لیتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس کے سیکھنے کا بھی موقع نہ دیا گیا، ان حالات میں پیدا ہونے والے انسان سے علم وحکمت اور اخلاقِ فاضلہ عالیہ کا کس کو تصوّر ہوسکتا ہے، اچانک حق تعالیٰ نے خلعتِ نبوّت سے نوازا اور علم وحکمت کا غیر منقطع سلسلہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر جاری فرمادیا، فصاحت وبلاغت میں عرب کے بڑے بڑے شعراء وبلغاء آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عاجز ہوگئے، یہ ایک ایسا کھلا ہوا معجزہ تھا کہ ہر آنکھوں والا اس کو دیکھ کر یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالاتِ انسانی سعی وعمل کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے غیبی عطیات ہیں، خط وکتابت کی تعلیم نہ دینے میں بھی یہی حکمت تھی۔ (مأخوذ از قرطبی)

(معارف القرآن ج:۸ ص:۷۵۸)

دُوسرا ذریعہ تقریر

ارشادِ ربانی

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۚ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ④ (ابراہیم)

ترجمہ:- اور کوئی رسول نہیں بھیجا ہم نے مگر بولی بولنے والا اپنی قوم کی، تا کہ ان کو سمجھائے، پھر راستہ بُھلاتا ہے اللہ جس کو چاہے اور راستہ دِکھلا دیتا ہے جس کو چاہے، اور وہ ہے زبردست حکمتوں والا۔

خلاصہ تفسیر

اور (اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے میں جو بعض کفار کو یہ شبہ ہے کہ یہ عربی کیوں ہے، جس سے احتمال ہوتا ہے کہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے تصنیف کرلیا ہوگا، عجمی زبان میں کیوں نہیں تا کہ یہ احتمال ہی نہ ہوتا، اور قرآن دُوسری کتبِ سماویہ سے عجمی ہونے میں متوافق بھی ہوتا تو یہ شبہ محض لغو ہے کیونکہ) ہم نے تمام (پہلے) پیغمبروں کو (بھی) انہی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، تا کہ (ان کی زبان میں) ان سے (اَحکامِ اِلٰہیہ کو) بیان کریں (کہ اصل مقصود واضح بیان ہے، تو سب کتابوں کا ایک زبان میں ہونا کوئی مقصد نہیں) پھر (بیان کرنے کے بعد) جس کو اللہ تعالیٰ چاہے گمراہ کرتے ہیں (کہ وہ ان اَحکام کو قبول نہیں کرتا) اور جس کو چاہیں ہدایت کرتے ہیں (کہ وہ ان اَحکام کو قبول کرلیتا ہے) اور وہی (سب اُمور پر) غالب ہے (اور) حکمت والا ہے (پس غالب ہونے کے سبب سب کو ہدایت کرسکتا تھا، مگر بہت سی حکمتیں اس کو مقتضی نہ ہوئیں)۔

معارف ومسائل

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت اور سہولت کا ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب بھی کوئی رسول کسی قوم کی طرف بھیجا ہے تو اس قوم کا ہم زبان بھیجا ہے تاکہ وہ اَحکامِ اِلٰہیہ انہی کی زبان اور انہی کے محاورات میں بتلائے اور ان کو اس کا سمجھنا آسان ہو، اگر رسول کی زبان اُمت کی زبان سے مختلف ہوتی تو ظاہر ہے کہ اس کے اَحکام سمجھنے میں اُمت کو ترجمہ کرنے کرانے کی مشقت بھی اُٹھانی پڑتی اور پھر بھی اَحکام کو صحیح سمجھنا مشکوک رہتا، اس لئے اگر عبرانی زبان بولنے والوں کی طرف کوئی رسول بھیجا تو رسول کی زبان بھی عبرانی ہی تھی، فارسیوں کے رسول کی زبان بھی فارسی، بربریوں کے رسول کی زبان بربری ہی رکھی گئی، خواہ اس صورت سے کہ جس شخص کو رسول بنایا گیا وہ خود اسی قوم کا فرد ہو اور مادری زبان اسی قوم کی زبان ہو، یا یہ کہ اس کی پیدائشی اور مادری زبان اگرچہ کچھ اور ہو مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا فرمائے کہ اس نے اس قوم کی زبان سیکھ لی، جیسے حضرت لوط علیہ السلام اگرچہ اصل باشندے عراق کے تھے جہاں کی زبان فارسی تھی، لیکن ملکِ شام کی طرف ہجرت کرنے کے بعد انہی لوگوں میں شادی کی اور شامیوں کی زبان ہی ان کی زبان بن گئی، تب اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک خطۂ شام کا نبی بنایا۔

اور ہمارے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت مکان ومقام کے اعتبار سے پوری دُنیا کے لئے اور زمانے کے اعتبار سے قیامت تک کے لئے عام ہے، دُنیا کی کوئی قوم کسی ملک کی رہنے والی، کسی زبان کی بولنے والی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائرۂ رسالت ونبوّت سے باہر نہیں، اور قیامت تک جتنی قومیں اور زبانیں نئی پیدا ہوں گی، وہ بھی سب کے سب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمتِ دعوت میں داخل ہوں گی، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے: "یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا" یعنی "اے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف"، اور صحیح بخاری ومسلم میں بروایت جابر رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیاء کے درمیان اپنی پانچ امتیازی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''مجھ سے پہلے ہر رسول و نبی خاص اپنی قوم و برادری کی طرف مبعوث ہوا کرتا تھا، اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام اقوامِ بنی آدم کی طرف مبعوث فرمایا''۔

حق تعالیٰ نے اس عالم میں انسانی آبادی کو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع فرمایا، اور انہی کو اِنسانوں کا سب سے پہلا نبی اور پیغمبر بنایا، پھر اِنسانی آبادی جس طرح اپنی عمرانی اور اِقتصادی حیثیت سے پھیلتی اور ترقی کرتی رہی، اسی کی مناسبت سے رُشد و ہدایت کے انتظامات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف رسولوں، پیغمبروں کے ذریعے ہوتے رہے، زمانے کے ہر دور اور ہر قوم کے مناسبِ حال اَحکام اور شریعتیں نازل ہوتی رہیں، یہاں تک کہ عالمِ اِنسانی کا نشو و نما سنِ کمال کو پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے سیّد الاوّلین والآخرین اِمام الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پوری دُنیا کا رسول بنا کر بھیجا اور جو کتاب و شریعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی وہ پورے عالم اور قیامت تک کے پورے زمانے کے لئے کامل و مکمل کر کے دی، اور ارشاد فرمایا: ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ'' یعنی ''میں نے آج تمہارے لئے دِین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمہارے لئے پوری کر دی''۔

پچھلے انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں بھی اپنے وقت اور اپنے خطے کے اعتبار سے کامل و مکمل تھیں، ان کو بھی ناقص نہیں کہا جاسکتا، لیکن شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا کمال کسی خاص وقت اور خاص خطے کے ساتھ مخصوص نہیں، یہ کامل علی الاطلاق ہے، اسی حیثیت سے تکمیلِ دِین اس شریعت کے ساتھ مخصوص ہے اور اسی وجہ سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوّت ختم کر دیا گیا۔

قرآنِ کریم اور عربی مبین

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح پچھلی اُمتوں کے رسول ان کے ہم زبان بھیجے گئے، ان کو ترجمہ کرنے کی محنت کی ضرورت نہ رہی، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم

صرف عربوں میں عربی زبان کے ساتھ کیوں مبعوث ہوئے؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب قرآن بھی عربی زبان ہی میں کیوں نازل ہوئی؟ لیکن غور وفکر سے کام لیا جائے تو جواب صاف ہے، ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دعوت تمام اَقوامِ دُنیا کے لئے عام ہوئی جن میں سینکڑوں زبانیں رائج ہیں تو ان سب کی ہدایت کے لئے دو ہی صورتیں ممکن تھیں، ایک یہ کہ قرآن ہر قوم کی زبان میں جدا جدا نازل ہوتا اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات بھی ہر قوم کی زبان میں جدا جدا ہوتیں، اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے سامنے اس کا انتظام کوئی دُشوار نہ تھا، لیکن تمام اقوامِ عالم کے لئے ایک رسول، ایک کتاب، ایک شریعت بھیجنے کا جو ایک عظیم مقصد ان تمام اقوامِ عالم میں ہزاروں طرح کے اختلافات کے باوجود دینی، اخلاقی، معاشرتی وحدت اور یک جہتی پیدا کرنا ہے، وہ اُس صورت سے حاصل نہ ہوتا۔

اس کے علاوہ جب ہر قوم، ہر ملک کا قرآن و حدیث الگ زبان میں ہوتے تو اس میں تحریفِ قرآن کے بے شمار راستے کھل جاتے اور قرآنِ کریم کے کلام کا محفوظ ہونا جو اس کی ایسی خصوصیت ہے کہ اغیار اور منکرینِ قرآن بھی اس کے تسلیم کرنے سے گریز نہیں کرسکتے یہ معجزانہ خصوصیت قائم نہ رہتی، اور ایک ہی دین، ایک ہی کتاب کے ہوتے ہوئے اس کے ماننے والوں کی اتنی مختلف راہیں ہوجاتیں کہ کوئی نقطۂ وحدت ہی باقی نہ رہتا، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ قرآنِ کریم کے ایک عربی زبان میں نازل ہونے کے باوجود اس کی تعبیر و تفسیر میں کس قدر اختلافات جائز حدود میں پیش آئے، اور ناجائز و باطل طریقوں سے اختلاف کی تو کوئی حد نہیں، لیکن ان سب کے باوجود مسلمانوں کی قومی وحدت اور ممتاز تشخص ان سب لوگوں میں موجود ہے جو قرآن پر کسی درجے میں بھی عامل ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رِسالت و بعثت کا پوری اَقوامِ دُنیا کے لئے عام ہونے کی صورت میں ان سب کی تعلیم و ہدایت کی یہ صورت کہ قرآن ہر

قوم کی زبان میں الگ الگ ہوتا، اس کو تو کوئی ادنیٰ سمجھ کا آدمی بھی دُرست نہیں سمجھ سکتا، اس لئے ضروری ہوا کہ قرآن کسی ایک ہی زبان میں آئے اور رسول کی زبان بھی وہی قرآن کی زبان ہو، پھر دُوسری ملکی اور علاقائی زبانوں میں اس کے ترجمے پہنچائے اور پھیلائے جائیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب علماء ہر قوم، ہر ملک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ہدایات کو اپنی اپنی قوم و ملک کی زبان میں سمجھائیں اور شائع کریں، اس کے لئے حق تعالیٰ شانہٗ نے تمام دُنیا کی زبانوں میں سے عربی زبان کا انتخاب فرمایا جس کی بہت سی وجوہ ہیں۔

عربی زبان کی خصوصیت

اوّل یہ کہ عربی زبان آسمان کی دفتری زبان ہے، فرشتوں کی زبان عربی ہے، لوحِ محفوظ کی زبان عربی ہے، جیسا کہ آیتِ قرآن ”بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾“ (البروج) سے معلوم ہوتا ہے، اور جنت، جو اِنسان کا وطنِ اصلی ہے اور جہاں اس کو لَوٹ کر جانا ہے، اس کی زبان بھی عربی ہے۔ طبرانی، مستدرک حاکم، شعب الایمان بیہقی میں بروایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما منقول ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اَحِبُّوا الْعَرَبَ لِثَلٰثٍ لِاَنِّيْ عَرَبِيٌّ وَالْقُرْاٰنُ عَرَبِيٌّ وَكَلَامُ اَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ“ (اس روایت کو حاکم نے مستدرک میں صحیح کہا ہے، جامع صغیر میں بھی صحیح کی علامت بتائی ہے، بعض محدثین نے اس کو ضعیف و مجروح کہا ہے)۔ حافظ ابنِ تیمیہؒ نے کہا ہے کہ مضمون اس حدیث کا ثابت ہے درجۂ حسن سے کم نہیں (فیض القدیر شرح جامع الصغیر ج:۱ ص:۱۷۹)۔

معنی حدیث کے یہ ہیں کہ تم لوگ تین وجہ سے عرب سے محبت کرو، ایک یہ کہ میں عربی ہوں، دُوسرے یہ کہ قرآن عربی ہے، تیسرے یہ کہ اہلِ جنت کی زبان عربی ہے۔

تفسیر قرطبی وغیرہ میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی زبان جنت میں عربی تھی، زمین پر نازل ہونے اور توبہ قبول ہونے کے بعد عربی ہی زبان میں کچھ تغیرات ہوکر سریانی زبان پیدا ہوگئی۔

اس سے اُن روایات کی بھی تائید وتقویت ہوتی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ سے منقول ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں انبیاء پر نازل فرمائی ہیں، ان کی اصلی زبان عربی ہی تھی، جبرئیلِ امین نے قومی زبان میں ترجمہ کرکے پیغمبروں کو بتلایا اور انہوں نے اپنی قومی زبان میں اُمتوں کو پہنچایا۔ یہ روایات علامہ سیوطیؒ نے اتقان میں اور آیتِ مذکورہ کے ذیل میں اکثر مفسرین نے نقل کی ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سب آسمانی کتابوں کی اصل زبان عربی ہے، مگر قرآنِ کریم کے سوا دُوسری کتابیں ملکی اور قومی زبانوں میں ترجمہ کرکے دی گئی ہیں، اس لئے ان کے معانی تو سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، مگر الفاظ بدلے ہوئے ہیں۔ یہ صرف قرآن کی خصوصیت ہے کہ اس کے معانی کی طرح الفاظ بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے آئے ہوئے ہیں، اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے یہ دعویٰ کیا کہ سارا جہان جن واِنس جمع ہوکر بھی قرآن کی ایک چھوٹی سورۃ بلکہ ایک آیت کی مثال نہیں بناسکتے، کیونکہ وہ معنوی اور لفظی حیثیت سے کلامِ اِلٰہی اور ایک صفتِ اِلٰہیہ ہے جس کی کوئی نقل نہیں اُتارسکتا۔ معنوی حیثیت سے تو دُوسری آسمانی کتابیں بھی کلامِ اِلٰہی ہیں، مگر ان میں شاید اصل عربی الفاظ کے بجائے ترجمہ ہونے ہی کی وجہ سے یہ دعویٰ کسی دُوسری آسمانی کتاب نے نہیں کیا، ورنہ قرآن کی طرح کلامِ اِلٰہی ہونے کی حیثیت سے ہر کتاب کی یکتائی اور بے مثال ہونا یقینی تھا۔

عربی زبان کے انتخاب کی ایک وجہ خود اس زبان کی ذاتی صلاحیتیں بھی ہیں کہ ایک مفہوم کی ادائیگی کے لئے اس میں بے شمار صورتیں اور طریقے ہیں۔

اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر عربی زبان سے ایک مناسبت عطا فرمائی ہے، جس کی وجہ سے ہر شخص بآسانی عربی زبان بقدرِ ضرورت سیکھ

لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ جس ملک میں پہنچے، تھوڑے ہی عرصے میں بغیر کسی جبر واِکراہ کے پورے ملک کی زبان عربی ہوگئی، مصر، شام، عراق سب میں کسی کی زبان بھی عربی نہ تھی، جو آج عربی ممالک کہلاتے ہیں۔

ایک یہ وجہ بھی ہے کہ عرب لوگ اگرچہ اسلام سے پہلے سخت بداَعمالیوں کے شکار تھے، مگر اس قوم کی صلاحیتیں اور ملکات اور جذبات ان حالتوں میں بھی بے نظیر تھے، یہی وجہ تھی کہ حق تعالیٰ نے اپنے سب سے بڑے اور آخری رسول کو ان میں پیدا فرمایا، اور ان کی زبان کو قرآن کے لئے اختیار فرمایا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے انہی کی ہدایت و تعلیم کا حکم دیا: "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ ﴿۲۱۴﴾" (الشعراء) اور سب سے پہلے اسی قوم کے ایسے افراد اپنے رسول کے گرد جمع فرمادیئے جنھوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان، مال، اولاد سب کچھ قربان کیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو جانوں سے زیادہ عزیز سمجھا، اور اس طرح ان پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و تعلیم کا وہ گہرا رنگ چڑھا کہ پوری دُنیا میں ایک ایسا مثالی معاشرہ پیدا ہوگیا جس کی نظیر اس سے پہلے آسمان و زمین نے نہیں دیکھی تھی، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بے مثال جماعت کو قرآنی تعلیمات کے پھیلانے اور شائع کرنے کے لئے کھڑا کردیا اور فرمایا:-

"بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَةً"، یعنی "مجھ سے سنی ہوئی ہر بات کو اُمت تک پہنچادو" جاں نثار صحابہؓ نے اس ہدایت کو پلّے باندھا اور دُنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ کر قرآن اور اس کی تعلیمات کو جہان میں پھیلادیا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر پچیس سال گزرنے نہ پائے تھے کہ قرآن کی آواز مشرق و مغرب میں گونجنے لگی۔

دُوسری طرف حق تعالیٰ نے تقدیری اور تکوینی طور پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمتِ دعوت جس میں دُنیا کے مشرکین اور اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ سب داخل ہیں، ان میں ایک خاص ملکہ اور جذبہ تعلیم و تعلّم اور تصنیف و تألیف، تبلیغ و اِشاعت کا ایسا پیدا فرمادیا کہ اس کی نظیر دُنیا کی پچھلی تاریخ میں نہیں ملتی، اس کے نتیجے میں عجمی اَقوام میں نہ صرف

قرآن وسنت کے علوم حاصل کرنے کا قوی جذبہ پیدا ہوا بلکہ عربی زبان کو حاصل کرنے اور اس کی ترویج واِشاعت میں عجمیوں کا قدم عرب سے پیچھے نہیں رہا۔

یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ اس وقت عربی لغت اور محاورات اور اس کے قواعدِ نحو وصَرف (گرامر) پر جتنی کتابیں دُنیا میں موجود ہیں، وہ بیشتر عجمیوں کی لکھی ہوئی ہیں، قرآن وسنت کی جمع وتدوین پھر تفسیر وتشریح میں بھی ان کا حصہ عربوں سے کم نہیں رہا۔

اس طرح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب عربی ہونے کے باوجود پورے عالم پر محیط ہوگئی، اور دعوت وتبلیغ کی حدتک عرب وعجم کا فرق مٹ گیا، ہر ملک وقوم اور ہر عجمی زبان کے لوگوں میں ایسے علماء پیدا ہوگئے جنہوں نے قرآن وسنت کی تعلیمات کو اپنی قومی زبان میں نہایت سہولت کے ساتھ پہنچادیا اور رسول کو قوم کی زبان میں بھیجنے کی جو حکمت تھی وہ حاصل ہوگئی۔

آخر آیت میں فرمایا کہ ہم نے لوگوں کی سہولت کے لئے اپنے رسولوں کو ان کی زبان میں اس لئے بھیجا کہ وہ ہمارے اَحکام ان کو اچھی طرح سمجھا دیں، لیکن ہدایت اور گمراہی پھر بھی کسی انسان کے بس میں نہیں، اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت میں ہے، وہ جس کو چاہتے ہیں گمراہی میں رکھتے ہیں، جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں، وہ بڑی قوت اور حکمت والے ہیں۔ (معارف القرآن ج:۵ ص:۲۱۱)

تیسرا ذریعہ عملی سیرت

ارشادِ ربانی

۱- اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۝۴۵

(العنکبوت)

ترجمہ:- تو پڑھ جو اُتری تیری طرف کتاب اور قائم رکھ نماز، بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی اور بُری بات سے، اور اللہ کی یاد ہے سب سے بڑی، اور اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو۔

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آپ رسول ہیں، اس لئے) جو کتاب آپ پر وحی کی گئی ہے آپ (تبلیغ کے واسطے) اس کو (لوگوں کے سامنے) پڑھا کیجئے (اور تبلیغِ قولی کے ساتھ تبلیغِ عملی بھی کیجئے کہ دِین کے کام ان کو عمل کر کے بھی بتلایئے، خصوصاً) نماز کی پابندی رکھئے (کیونکہ تمام اعمال میں نماز اعظم عبادت بھی ہے اور اس کے اثرات بھی دُور رَس ہیں کہ) بے شک نماز (اپنی وضع کے اعتبار سے) بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی رہتی ہے (یعنی بزبانِ حال کہتی ہے کہ تو جس معبود کی انتہائی تعظیم کر رہا ہے اور اس کی اطاعت کا اقرار کر رہا ہے، فحشاء اور منکر میں مبتلا ہونا اس کی شان میں بے ادبی ہے) اور (اسی طرح نماز کے سوا جتنے نیک کام ہیں سب پابندی کے لائق ہیں، کیونکہ وہ سب قولاً یا فعلاً اللہ کی یاد ہی ہیں) اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے اور (اگر تم اللہ کی یاد میں غفلت کرو تو یہ بھی سن لو کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو جانتا ہے (جیسا کرو گے ویسا بدلہ ملے گا)۔

معارف و مسائل

"اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ" سابقہ آیات میں چند انبیاء علیہم السلام اور ان کی اُمتوں کا ذکر تھا، جن میں چند بڑے بڑے سرکش کفار اور ان پر طرح طرح کے عذابوں کا بیان تھا، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنینِ اُمت کے لئے تسلی بھی ہے کہ انبیائے سابقین نے مخالفین کی کیسی کیسی اِیذاؤں پر صبر کیا، اور اس کی تلقین بھی کہ تبلیغ و دعوت کے کام میں کسی حال میں ہمت نہیں ہارنا چاہئے۔ (معارف القرآن ج:۶ ص:۶۹۵)

ارشادِ ربانی

۲- قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾ (سورۂ ہود)

ترجمہ:- بولا: اے قوم! دیکھوتو اگر مجھ کو سمجھ آ گئی اپنے رَبّ کی طرف سے اور اس نے روزی دی مجھ کو نیک روزی، اور میں یہ نہیں چاہتا کہ بعد کو خود کروں وہ کام جو تم سے چھڑاؤں، میں تو چاہتا ہوں سنوارنا جہاں تک ہو سکے اور بن آنا ہے اللہ کی مدد سے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف میرا رُجوع ہے۔

خلاصۂ تفسیر

شعیب (علیہ السلام) نے فرمایا: اے میری قوم! (تم جو مجھ سے چاہتے ہو کہ میں توحید و عدل کی نصیحت نہ کروں تو) بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رَبّ کی جانب سے دلیل پر (قائم) ہوں (جس سے توحید و عدل ثابت ہے) اور اس نے مجھ کو اپنی طرف سے ایک عمدہ دولت (یعنی نبوّت) دی ہو (جس سے مجھ پر تبلیغ ان اَحکام کی واجب ہو، یعنی توحید و عدل کا حق ہونا بھی ثابت اور ان کی تبلیغ بھی واجب) تو پھر کیسے تبلیغ نہ کروں اور میں (جس طرح ان باتوں کی تم کو تعلیم کرتا ہوں، خود بھی تو اس پر عمل کرتا ہوں) یہ نہیں چاہتا ہوں کہ تمہارے برخلاف ان کاموں کو کروں جن سے تم کو منع کرتا ہوں (برخلاف سے یہ ہی مراد ہے کہ تم کو اور راہ بتلاؤں اور خود اور راہ پر چلوں، مطلب یہ ہے کہ میری نصیحت محض خیر خواہی و دِل سوزی سے ہے جس کا قرینہ یہ ہے کہ میں وہی باتیں بتلاتا ہوں جو اپنے نفس کے لئے بھی

پسند کرتا ہوں، غرض) میں تو اصلاح چاہتا ہوں جہاں تک میرے اِمکان میں ہے اور مجھ کو جو کچھ (عمل و اصلاح کی) توفیق ہو جاتی ہے صرف اللہ ہی کی مدد سے ہے (ورنہ کیا میں اور کیا میرا اِرادہ) اسی پر میں بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف (تمام اُمور میں) رُجوع کرتا ہوں (خلاصہ یہ کہ توحید وعدل کے وجوب پر دلائل بھی قائم، اور بأمرِ خداوندی اس کی تبلیغ، اور ناصح ایسا دِل سوز اور مصلح، پھر بھی نہیں مانتے بلکہ اُلٹی مجھ سے اُمید رکھتے ہو کہ میں کہنا چھوڑ دُوں چونکہ اس تقریر میں دِل سوزی اور اصلاح کی اپنی طرف نسبت کی ہے، اس لئے ''مَاتَوْفِيْقِیْ...الخ'' فرمادیا، یہاں تک تو ان کے قول کا جواب ہوگیا۔

''وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰی مَآ اَنْهٰكُمْ عَنْهُ'' یعنی یہ بھی تو سمجھو کہ میں جس چیز سے تمہیں روکتا ہوں خود بھی تو اس کے پاس نہیں جاتا، اگر میں تمہیں منع کرتا اور خود اس کا اِرتکاب کرتا تو تمہارے لئے کہنے کی گنجائش تھی۔

اِس سے معلوم ہوا کہ داعی اور واعظ ومبلغ کے عمل کو اس کی وعظ ونصیحت میں بڑا دخل ہوتا ہے، جس چیز پر واعظ خود عامل نہ ہو، اُس کی بات کا دُوسروں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

(معارف القرآن ج:۴ ص:۶۶۳)

***

چھٹا باب

داعی کے اوصاف

اِخلاص

"اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف انبیائے کرام علیہم السلام کے واقعات سنا کر مصائب پر صبر کی تلقین فرمائی۔ خاص طور پر بے غرض نصیحت کرنے کا حکم دیا، بلکہ فرمایا کہ آپ ان مشرکین کے سامنے اس بات کا اعلان فرمادیں۔"

ارشادِ ربانی

۱۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۖ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ ۗ قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ
إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ ﴿٩٠﴾ (الانعام)

ترجمہ:- یہ وہ لوگ تھے جن کو ہدایت کی اللہ نے، سو تو چل ان کے طریقے پر، تو کہہ دے کہ میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کچھ مزدوری، یہ تو محض نصیحت ہے جہان کے لوگوں کو۔

خلاصۂ تفسیر

(اور ہم جو غم نہ کرنے کو اور صبر کرنے کو کہتے ہیں تو وجہ یہ ہے کہ سب انبیاء نے ایسا ہی کیا ہے، چنانچہ) یہ حضرات (مذکورین) ایسے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے (اس صبر کی) ہدایت کی تھی سو (اس باب میں) آپ بھی انہی کے طریقِ (صبر) پر چلئے (چونکہ آپ کو بھی اس کی ہدایت کی گئی ہے، کیونکہ ان سے آپ کو نفع نہ کوئی ضرر ہے جس کی وجہ سے غم اور بے

صبری ہو اور اس مضمون کے اظہار کے واسطے ان سے تبلیغ کے وقت) آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میں تم سے (اس تبلیغِ قرآن) پر کچھ معاوضہ نہیں چاہتا (جس کے ملنے سے نفع اور نہ ملنے سے ضرر ہو، بے غرض نصیحت کرتا ہوں) یہ (قرآن) تو صرف تمام جہانوں کے واسطے ایک نصیحت ہے (جس کو ماننے سے تمہارا ہی نفع اور نہ ماننے سے تمہارا ہی نقصان ہے)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصیت کے ساتھ ایک ایسے اعلان کا حکم دیا گیا جس کا اعلان تمام انبیائے سابقین علیہم السلام بھی کرتے چلے آئے ہیں، وہ یہ کہ: "قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ" یعنی میں تمہاری زندگی سنوارنے کے لئے جو ہدایات تمہیں دے رہا ہوں اس پر تم سے کوئی فیس اور معاوضہ نہیں لیتا، تم اس کو مان لو تو میرا کوئی نفع نہیں، اور نہ مانو تو کوئی نقصان نہیں، یہ تو تمام دُنیا جہان کے لوگوں کے لئے نصیحت وخیر خواہی کا پیغام ہے، تعلیم وتبلیغ پر کوئی معاوضہ نہ لینا تمام انبیاء علیہم السلام میں ہمیشہ مشترک چلا آیا ہے اور تبلیغ کے مؤثر ہونے میں اس کا بڑا دخل ہے۔

(معارف القرآن ج:۳ ص:۳۹۰)

ارشادِ ربانی

۲- وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝ يٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (سورۂ ہود)

ترجمہ:- اور عاد کی طرف ہم نے بھیجا ان کے بھائی ہود کو، بولا: اے قوم! بندگی کرو اللہ کی، کوئی تمہارا حاکم نہیں سوائے اس کے، تم سب جھوٹ کہتے ہو۔ اے قوم! میں تم سے نہیں مانگتا اس پر مزدوری، میری مزدوری اسی پر ہے جس نے مجھ کو پیدا کیا، پھر کیا تم نہیں سمجھتے۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (قوم) عاد کی طرف ان کے (برادری یا وطن کے) بھائی (حضرت) ہود (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا، انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا: اے میری قوم! تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں، تم (اس بت پرستی کے اعتقاد میں) محض مفتری ہو (کیونکہ اس کا باطل ہونا دلیل سے ثابت ہے)، اے میری قوم! (میری نبوّت جو دلائل سے ثابت ہے اس کی مزید تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ) میں تم سے (تبلیغ) پر کچھ معاوضہ نہیں مانگتا، میرا معاوضہ تو صرف اس (اللہ) کے ذمہ ہے جس نے مجھ کو (عدم محض سے) پیدا کیا، پھر کیا تم (اس کو) نہیں سمجھتے (کہ دلیلِ نبوّت موجود ہے اور اس کے خلاف کوئی وجہ شبہ کی نہیں، پھر نبوّت میں شبہ کی کیا وجہ)۔

وعظ و نصیحت اور دعوتِ دین پر اُجرت

قرآنِ کریم نے یہ بات تقریباً سب ہی انبیاء علیہم السلام کی زبان سے نقل کی ہے کہ ہم تم سے اپنی دعوت و محنت کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا اگر معاوضہ لیا جائے تو دعوت مؤثر نہیں رہتی، جس پر تجربہ شاہد ہے کہ وعظ و نصیحت پر اُجرت لینے والوں کی بات سامعین پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

(معارف القرآن ج:۴ ص:۶۴۱)

تقویٰ، خشیت و انابت

ارشادِ ربانی

۱- وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۗ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ (الٓمّٓ السجدة)

ترجمہ:- اور کئے ہم نے ان میں پیشوا جو راہ چلاتے تھے ہمارے حکم

سے جب وہ صبر کرتے رہے اور رہے ہماری باتوں پر یقین کرتے۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) میں بہت سے (دِین کے) پیشوا بنادیئے تھے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے جبکہ وہ لوگ (تکلیف پر) صبر کئے رہے اور ہماری آیتوں کا یقین رکھتے تھے (اس لئے ان کی اشاعت اور خلق کی ہدایت میں مشقت گوارا کرتے تھے، یہ تسلی ہے مؤمنین کو کہ تم لوگ صبر کرو، اور جب تم صاحبِ یقین ہو اور یقین کا مقتضا صبر کرنا ہے تو تم کو صبر ضروری ہے، اس وقت ہم تم کو بھی ائمہ دِین بنادیں گے)۔

راہنما اور مقتدا کی شرائط

"وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ" یعنی ہم نے بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگوں کو اِمام اور پیشوا و مقتداء بنادیا جو اپنے پیغمبر کے نائب ہونے کی حیثیت سے باذنِ ربانی لوگوں کو ہدایت کیا کرتے تھے، جبکہ انہوں نے صبر کیا، اور جبکہ وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں۔

اس آیت میں علمائے بنی اسرائیل میں سے بعض کو اِمامت و پیشوائی کا درجہ عطا فرمانے کے دو سبب ذکر فرمائے ہیں۔ اوّل صبر کرنا، دُوسرے آیاتِ اِلٰہیہ پر یقین کرنا۔ صبر کرنے کا مفہوم عربی زبان کے اعتبار سے بہت وسیع اور عام ہے، اس کے لفظی معنی باندھنے اور ثابت رہنے کے ہیں، اس جگہ صبر سے مراد اَحکامِ اِلٰہیہ کی پابندی پر ثابت قدم رہنا اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام یا مکروہ قرار دیا ہے ان سے اپنے نفس کو روکنا ہے، جس میں تمام احکامِ شریعت کی پابندی آجاتی ہے اور یہ بہت بڑا عملی کمال ہے۔ دُوسرا سبب ان کا آیاتِ اِلٰہیہ پر یقین رکھنا ہے، اس میں آیات کے مفہوم کو سمجھنا، پھر سمجھ کر اس پر یقین کرنا دونوں داخل ہیں، یہ بہت بڑا کمالِ علمی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اِمامت و پیشوائی کے لائق اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف وہ لوگ ہیں جو عمل میں بھی کامل ہوں اور علم میں بھی۔ (معارف القرآن ج:۷ ص:۴۷)

ارشادِ ربانی

۲- فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝ (الاعلیٰ)

ترجمہ:- سو تو سمجھا دے اگر فائدہ کرے سمجھانا۔

خلاصۂ تفسیر

تو آپ (جس طرح خود تسبیح و تقدیس کرتے ہیں، اُس طرح دُوسروں کو بھی) نصیحت کیا کیجئے اگر نصیحت کرنا مفید ہوتا ہو (مگر جیسا کہ ظاہر اور معلوم ہے کہ نصیحت اپنی ذات میں ہمیشہ مفید ہی ہوتی ہے، کما قال تعالیٰ: "فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝" (الذّٰریٰت) حاصل یہ ہوا کہ جب نصیحت نفع کی چیز ہے تو آپ نصیحت کرنے کا اہتمام کریں)۔

"فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى" سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے فریضۂ پیغمبری کے ادا کرنے میں حق تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی سہولتوں کا بیان تھا، اس آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس فریضے کی ادائیگی کا حکم ہے اور معنی الفاظ آیت کے یہ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو تبلیغ و نصیحت کیجئے اگر نصیحت نفع دیتی ہو۔ یہ الفاظ اگرچہ شرط کے آئے ہیں مگر درحقیقت مقصود کوئی شرط نہیں بلکہ اس کا تاکیدی حکم دینا ہے، جس کی مثال ہمارے عرف میں یہ ہے کہ کسی شخص کو بطور تنبیہ کے کہا جائے کہ: "اگر تو آدمی ہے تو فلاں کام کرنا ہوگا" یا "اگر تو فلاں کا بیٹا ہے تو تجھے ایسا کرنا چاہئے" یہاں مقصود شرط نہیں ہوتی بلکہ اس کا اظہار ہوتا ہے کہ جب تو آدمی زاد ہے یا جبکہ تو فلاں بزرگ یا شریف آدمی کا بیٹا ہے تو تجھ پر یہ کام لازم ہے، مطلب یہ ہے کہ نصیحت و تبلیغ کا نافع و مفید ہونا تو متعین و متیقن ہے، اس لئے اس نافع چیز کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی وقت نہ چھوڑیں۔

(معارف القرآن ج:۸ ص:۷۲۰)

''دعوت وتبلیغ کا کام انتہائی مشکل اور کٹھن کام ہے، اس راستے میں داعی کو بہت سے مصائب اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس لئے ہر مرحلے میں تائید خداوندی کی ضرورت رہتی ہے، قرآن پاک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات بیان کرتے ہوئے اس صفت کو بطورِ خاص ذکر کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بھی اللہ تعالیٰ کی نصرت واعانت کے ساتھ تھی۔''

ارشادِ ربانی

۳۔ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۝٤٦ (الاحزاب)

ترجمہ:- اور بلانے والا اللہ کی طرف اس کے حکم سے اور چمکتا ہوا چراغ۔

خلاصۂ تفسیر

اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں (اور یہ تبشیر و انذار ودعوت تبلیغاً ہے) اور (یوں خود اپنی ذات وصفات وکمالات وعبادات وعادات وغیرہا مجموعی حالات کے اعتبار سے) آپ (سرتا پا نمونۂ ہدایت ہونے میں بمنزلہ) ایک روشن چراغ (کے) ہیں (کہ آپ کی ہر حالت طالبانِ اَنوار کے لئے سرمایۂ ہدایت ہے، پس قیامت میں ان مؤمنین پر جو کچھ رحمت ہوگی وہ آپ ہی کی ان صفاتِ بشیر ونذیر وداعی وسراجِ منیر کے واسطے سے ہے، آپ اس غم وپریشانی کو الگ کیجئے)۔

داعی الی اللہ سے مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کو اللہ تعالیٰ کے وُجود اور توحید اور اطاعت کی طرف دعوت دینے والے ہیں، ''دَاعِيًا إِلَى اللَّهِ'' کو ''بِإِذْنِهِ'' کے ساتھ مشروط فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دینے والے اور بلانے والے اللہ ہی کے اِذن واِجازت سے ہیں، اس قید وشرط کا اضافہ اس اشارے کے لئے

ہے کہ تبلیغ و دعوت کی خدمت سخت دُشوار ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے اِذن و اِعانت کے بغیر اِنسان کے بس میں نہیں آسکتی۔ (معارف القرآن ج:۷ ص:۱۷۰)

رُجوع الی اللہ

ارشادِ ربانی

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۞ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۞ (الانشراح)

ترجمہ:- پھر جب تو فارغ ہو تو محنت کر، اور اپنے رَبّ کی طرف دِل لگا۔

خلاصۂ تفسیر

(آگے ان نعمتوں پر شکر کا حکم ہے کہ جب ہم نے آپ کو ایسی ایسی نعمتیں دی ہیں) تو آپ جب (تبلیغِ اَحکام سے جو دُوسروں کی نفع رسانی کی وجہ سے عبادت ہے) فارغ ہوجایا کریں تو (دُوسری عبادات متعلقہ بذاتِ خاص میں) محنت کیا کیجئے (مراد کثرتِ عبادت و ریاضت ہے کہ آپ کی شان کے یہی مناسب ہے) اور (جو کچھ مانگنا ہو اس میں) اپنے رَبّ ہی کی طرف توجہ رکھئے (یعنی اُسی سے مانگئے اور اس میں بھی ایک حیثیت سے بشارت ہے زوالِ عسر کی کہ خود درخواست کرنے کا حکم گویا درخواست پورا کرنے کا وعدہ ہے)۔

یادِ الٰہی اور توجہ الی اللہ

"فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۞ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۞" یعنی جب آپ ایک محنت یعنی دعوتِ حق اور تبلیغِ اَحکام سے فارغ ہوں تو (دُوسری) محنت کے لئے تیار ہوجایئے، وہ یہ کہ نماز اور ذکر اللہ اور دُعا و اِستغفار میں لگ جائیں۔ اکثر حضراتِ مفسرین نے اس آیت

کی یہی تفسیر کی ہے۔ بعض حضرات نے دُوسری تفسیریں بھی لکھی ہیں، مگر اَقرب وہی ہے جو اُوپر لکھی گئی۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت وتبلیغ اور خلقِ خدا کو راستہ دِکھانا، اُن کی اصلاح کی فکر یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی عبادت تھی، مگر یہ عبادت بواسطہ مخلوق ہے کہ ان کی اصلاح پر توجہ دیں اور اس کی تدبیر کریں، آیت کا مقصود یہ ہے کہ صرف اس عبادت بالواسطہ پر آپ قناعت نہ کریں، بلکہ جب اس سے فرصت ملے تو بلاواسطہ خلوَت میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں، اُسی سے ہر کام میں کامیابی کی دُعا کریں کہ اصل مقصود جس کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے وہ ذکر اللہ اور عبادت بلاواسطہ ہی ہے۔ اور شاید اسی لئے پہلی قسم یعنی عبادت بالواسطہ سے فراغت کا ذکر فرمایا کہ وہ کام ایک ضرورت کے لئے ہے، اُس سے فراغت ہوسکتی ہے، اور دُوسرا کام یعنی توجہ الی اللہ ایسی چیز ہے کہ اس سے فراغت مؤمن کو کبھی نہیں ہوسکتی بلکہ اپنی ساری عمر اور توانائی کو اس میں صَرف کرنا ہے۔

فائدہ:- اس سے معلوم ہوا کہ علماء جو تعلیم وتبلیغ اور اصلاحِ خلق کا کام کرنے والے ہیں، اُن کو اس سے غفلت نہ ہونا چاہئے کہ اُن کا کچھ وقت خلوَت میں توجہ الی اللہ اور ذکر اللہ کے لئے بھی مخصوص ہونا چاہئے جیسا کہ علمائے سلف کی سیرتیں اس پر شاہد ہیں، اس کے بغیر تعلیم وتبلیغ بھی مؤثر نہیں ہوتی، اُن میں نور وبرکت نہیں ہوتی۔

فائدہ:- لفظ ''فانصب'' نصب سے مشتق ہے، جس کے اصلی معنی تعب اور تکان کے ہیں، اس میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ عبادت اور ذکر اللہ اس حد تک جاری رکھا جائے کہ کچھ مشقت اور تکان محسوس ہونے لگے، صرف نفس کی راحت وخوشی ہی پر اس کا مدار نہ رہے، اور کسی وظیفے اور معمول کی پابندی خود ایک مشقت اور تعب ہے، خواہ کام مختصر ہی ہو۔

(معارف القرآن ج:۸ ص:۷۶۹)

تحمل،صبر اور اِحسان

ارشادِ ربانی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱- نٓ وَالۡقَلَمِ وَمَا یَسۡطُرُوۡنَ ۝۱ مَاۤ اَنۡتَ بِنِعۡمَۃِ رَبِّکَ بِمَجۡنُوۡنٍ ۝۲ (القلم)

ترجمہ:- قسم ہے قلم کی اور جو کچھ لکھتے ہیں، تو نہیں اپنے رَبّ کے فضل سے دیوانہ۔

خلاصۂ تفسیر

نٓ (اس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں) قسم ہے قلم کی (جس سے مقادیرِ خلق لوحِ محفوظ پر لکھے گئے) اور (قسم ہے) اِن (فرشتوں) کے لکھنے کی (جو کہ کاتبِ احوال ہیں۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے "قَلَم" اور "مَا یَسۡطُرُوۡنَ" کی یہی تفسیر فرمائی ہے (درمنثور) آگے جوابِ قسم ہے) کہ آپ اپنے رَبّ کے فضل سے مجنون نہیں ہیں (جیسا منکرینِ نبوّت کہتے ہیں، کذا فی الدر عن ابن جُریج فی سبب النزول، مطلب یہ کہ آپ نبیٔ برحق ہیں اور یہ قسمیں اس مدعا کے نہایت مناسب ہیں کیونکہ من جملہ تقادیر کے نزولِ قرآن بھی ہے، پس اس آیت میں اشارہ ہے کہ نبوّت آپ کی علمِ الٰہی میں پہلے ہی سے محقق ومؤکد ہے، پس ثبوت اس کا متیقن ہوا اور اَعمال لکھنے والے فرشتے مصدقین ومنکرین کے اعمال کو لکھ رہے ہیں، پس انکارِ نبوّت پر سزا ہوگی، اس سے ڈر کر ایمان لانا واجب ہے)۔

سورۂ ملک میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید اور علم وقدرت کے دلائل مشاہدۂ کائنات سے بیان ہوئے ہیں اور کفار ومنکرین پر عذابِ شدید کا ذکر ہے، سورۂ نون میں کفار کے اُن مطاعن کا جواب ہے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا کرتے تھے۔ سب سے پہلا اُن کا طعنہ یہ تھا کہ اللہ کے بھیجے ہوئے کامل العقل، کامل العلم، جامع الفضائل رسول

کو معاذ اللہ مجنون کہتے تھے، یا اس وجہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی فرشتے کے ذریعے نازل ہوتی تھی بوقتِ وحی اُس کے آثار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک پر دیکھے جاتے تھے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی سے حاصل شدہ آیات پڑھ کر سناتے تھے، یہ معاملہ کفار کے فہم وادراک سے باہر تھا، اس لئے اس کو جنون قرار دے دیا۔ اور یا اس وجہ سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم اور پوری دُنیا کے عقائدِ موجودہ کے خلاف یہ دعویٰ کیا کہ عبادت کے قابل اللہ کے سوا کوئی نہیں، جن خود تراشیدہ بتوں کو وہ خدا سمجھتے تھے، اُن کا بے علم وشعور، ناقابلِ نفع وضرر ہونا بیان کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عقیدے کا کوئی ساتھی نہ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے یہ دعویٰ لے کر بغیر کسی ظاہری ساز وسامان کے ساری دُنیا کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے۔ ظاہر بین نظروں میں اس کی کامیابی کا کوئی اِمکان نہیں تھا، ایسے دعوے کو لے کر کھڑا ہونا جنون سمجھا گیا اور بغیر کسی سبب کے بھی بعض طعن برائے طعن ہوسکتا ہے کہ مجنون کہتے ہوں، سورتوں کی ابتدائی آیتوں میں اُن کے اس خیالِ باطل کی تردید قسم کے ساتھ مؤکد کر کے بیان فرمائی ہے۔

''نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝۱ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝۲ ''حرفِ نون حروفِ مقطعہ میں سے ہے جو قرآنِ کریم کی بہت سی سورتوں کے شروع میں لائے گئے ہیں، ان کے معنی اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں، یا اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو، اُمت کو اس کی تحقیق میں پڑنے سے روک دیا گیا ہے۔ (معارف القرآن ج:۸ ص:۵۳۰)

> ''اس آیت میں قلمِ تقدیر یا عام قلمِ خلائق کی اور پھر لفظ ''مَا يَسْطُرُوْنَ'' میں جو کچھ لکھا گیا یا لکھا جائے گا اس کی قسم کھا کر خدا تعالیٰ نے کفار کے اس طعنِ باطل کا رَدّ فرمایا ہے کہ'' آپ مجنون ہیں'' ارشاد ہوا: ''مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ'' یعنی آپ اپنے رَبّ کی نعمت وفضل کی وجہ سے ہرگز مجنون نہیں۔ اس میں ''بِنِعْمَةِ رَبِّكَ'' بڑھا کر دعویٰ کی دلیل بھی دے دی کہ جس شخص پر اللہ تعالیٰ کی نعمت ورحمت مکمل ہو وہ کیسے مجنون ہوسکتا ہے؟ اس کو مجنون کہنے

والا خود مجنون ہے۔

ملاحظہ فرمائیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کفار کے طعن کہ ''آپ مجنون ہیں'' ان کو کوئی سخت جواب نہیں دیا بلکہ تحمل کا مظاہرہ فرمایا، لہٰذا دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والوں کو بھی مخالفین کے طعن و تشنیع کا جواب دینے کی بجائے اُسوۂ رسول اختیار کرنا چاہئے۔''

ارشادِ ربانی

۲- وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ﴿٣٤﴾ (حٰمٓ السجدة)

ترجمہ:- اور برابر نہیں نیکی اور بدی، جواب میں وہ کہہ جو اُس سے بہتر ہو، پھر تو دیکھ لے کہ تجھ میں اور جس میں دُشمنی تھی گویا دوست دار ہے قرابت والا۔

خلاصۂ تفسیر

نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی (بلکہ ہر ایک کا اثر جدا ہے، اور جب یہ بات ثابت ہوگئی تو اَب) آپ (مع اپنے متبعین کے) نیک برتاؤ سے (بدی کو) ٹال دیا کیجئے پھر یکایک (آپ دیکھیں گے کہ) آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہوجاوے گا جیسا کوئی دِلی دوست ہوتا ہے (یعنی بدی کا بدلہ بدی سے دینے میں تو عداوت بڑھتی ہے اور نیکی کرنے سے بشرطِ سلامتِ طبع دُشمن کی عداوت گھٹتی ہے، یہاں تک کہ اکثر تو بالکل ہی عداوت جاتی رہتی ہے اور اس معاملے میں مثل دوست کے ہوجاتا ہے گو دِل سے دوست نہ ہو)۔

''وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ'' یہاں سے دعوتِ الی اللہ کی خدمت انجام دینے والوں کو خاص ہدایات دی گئی ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ بُرائی کا بدلہ بُرائی سے نہ دیں، بلکہ صبر اور اِحسان سے کام لیں۔ ''اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ'' یعنی داعیانِ حق کی

خصلت یہ ہونا چاہئے کہ وہ لوگوں کی بُرائی کو طریقِ اَحسن سے دفع کریں، وہ یہ کہ بُرائی کا بدلہ بُرائی سے نہ لینا اور معاف کردینا تو عملِ حسن ہے، اور اَحسن یہ ہے کہ جس نے تمہارے ساتھ بُرا سلوک کیا، تم اس کو معاف بھی کردو اور اس کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرو۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ: اس آیت میں حکم یہ ہے کہ جو شخص تم پر غصّے کا اظہار کرے تم اس کے مقابلے میں صبر سے کام لو، جو تمہارے ساتھ جہالت سے پیش آوے تم اس کے ساتھ حلم و بُردباری کا معاملہ کرو، اور جس نے تمہیں ستایا اُس کو معاف کردو (مظہری)۔

بعض روایات میں ہے کہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو کسی شخص نے گالی دی یا بُرا بھلا کہا تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ: اگر تم اپنے کلام میں سچے ہو کہ میں مجرم وخطاوار اور بُرا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمادے، اور اگر تم نے جھوٹ بولا ہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمادے (قرطبی)۔ (معارف القرآن ج:۷ ص:۶۵۲)

''اِمام یعقوب کرخی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: سورۃ المزمل کے شروع سے مندرجہ ذیل آیت تک مقاماتِ سلوک کو بیان کیا گیا ہے:-

۱- رات میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے خلوت۔
۲- قرآنِ کریم میں اِشتغال۔
۳- ذکر اللہ پر دوام۔
۴- ماسوی اللہ سے اِعراض اور ترکِ تعلق۔
۵- اللہ تعالیٰ پر توکل۔
۶- لوگوں کی اِیذاؤں پر صبرِ جمیل، اس کو مذکورہ آیت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:-''

ارشادِ ربانی

۳- وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ﴿۱۰﴾ (المُزَّمِّل)

ترجمہ:- اور سہتا رہ جو کچھ کہتے رہیں اور چھوڑ دے اُن کو بھلی طرح کو چھوڑنا۔

خلاصۂ تفسیر

اور یہ لوگ جو جو باتیں کرتے ہیں اُن پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ اُن سے الگ ہو جاؤ (الگ ہونا یہ کہ کوئی تعلق نہ رکھو، اور خوبصورتی سے یہ کہ ان کی شکایت و انتقام کی فکر میں مت پڑو)۔

"وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا" بقول اِمام کرخی رحمہ اللہ یہ چھٹا حکم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے، یعنی لوگوں کی ایذاؤں اور گالیوں پر صبرِ جمیل۔ یہ مقاماتِ سلوک میں سب سے اعلیٰ مقام ہے کہ دُشمنوں کی جفاو ایذا پر صبر کیا جائے، یعنی یہ حضرات جن لوگوں کی خیرخواہی اور ہمدردی میں اپنی ساری قوت و توانائی اور ساری عمر خرچ کرتے ہیں، انہیں کی طرف سے اُس کی جزا میں گالیاں، ایذائیں، طرح طرح کے جور و ستم ان کے مقابلے میں آتے ہیں، اُن پر صبرِ جمیل کرنا یعنی انتقام کا ارادہ بھی نہ کرنا، یہ وہ اعلیٰ مقام ہے جو اِصطلاحِ صوفیہ میں فنائے کامل کے بغیر نصیب نہیں ہوتا۔

(معارف القرآن ج:۸ ص:۵۹۵)

عفوودرگزر و ہمدردی

ارشادِ ربانی

۱- وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِیْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾ (النساء)

ترجمہ:- اور کہتے ہیں قبول ہے، پھر جب باہر گئے تیرے پاس سے تو

مشورہ کرتے ہیں بعضے بعضے ان میں سے رات کو اس کے خلاف جو تجھ
سے کہہ چکے تھے، اور اللہ لکھتا ہے جو وہ مشورہ کرتے ہیں، سوتو تغافل
کر ان سے اور بھروسہ کر اللہ پر، اور اللہ کافی ہے کارساز۔

خلاصۂ تفسیر

اور یہ (منافق) لوگ (آپ کے اَحکام سن کر آپ کے سامنے زبان سے تو) کہتے ہیں کہ: ہمارا کام (آپ کی) اطاعت کرنا ہے، پھر جب آپ کے پاس سے (اُٹھ کر) باہر جاتے ہیں تو شب کے وقت (پوشیدہ) مشورے کرتے ہیں ان میں کی ایک جماعت (یعنی ان کے سرداروں کی جماعت) برخلاف اس کے جو کچھ زبان سے کہہ چکے تھے (اور چونکہ وہ سردار ہیں، اصل مشورہ وہ کرتے ہیں باقی ان کے تابع رہتے ہیں تو اس خلاف میں سب کی ایک حالت ہے) اور اللہ تعالیٰ (سرکاری روزنامچے میں) لکھتے جاتے ہیں جو کچھ وہ راتوں کو مشورے کیا کرتے ہیں (موقع پر سزا دیں گے) سو آپ ان کی (بیہودگی کی) طرف التفات (اور خیال) نہ کیجئے، اور (نہ کچھ فکر کیجئے، بلکہ سارا قصہ) اللہ تعالیٰ کے حوالے کیجئے، اور اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہیں (وہ خود مناسب طور پر اس کا دفعیہ فرمائیں گے، چنانچہ کبھی ان کی شرارت سے کوئی ضرر نہیں پہنچا)۔

معارف ومسائل

"وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ" اس آیت میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو دورُخی پالیسی رکھتے ہیں، زبان سے کچھ کہتے ہیں، دِل میں کچھ ہوتا ہے، اس کے بعد ایسے لوگوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کے متعلق ایک خاص ہدایت ہے۔

توکل علی اللہ

"فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا" جب منافقین آپ صلی اللہ

علیہ وسلم کے سامنے آتے تو کہتے کہ ہم نے آپ کا حکم قبول کیا، اور جب واپس جاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرنے کے لئے مشورے کرتے، اس سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت کوفت ہوتی، اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی کہ ان کی پروانہ کیجئے، آپ اپنا کام اللہ کے بھروسے پر کرتے رہیں، کیونکہ وہ آپ کے لئے کافی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص لوگوں کا پیشوا اور رہنما ہو، اسے طرح طرح کی دُشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے، لوگ طرح طرح کے اُلٹے سیدھے الزامات اس کے سر ڈالیں گے، دوستی کے رُوپ میں دُشمن بھی ہوں گے، ان سب چیزوں کے باوجود اس رہنما کو عزم و اِستقلال کے ساتھ اللہ کے بھروسے پر اپنے کام سے لگن ہونی چاہئے، اگر اس کا رُخ اور نصب العین صحیح ہوگا تو اِن شاءاللہ ضرور کامیاب ہوگا۔

(معارف القرآن ج:۲ ص:۴۸۸)

"داعی کو کارِ دعوت میں ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، جن میں نیک کام کرنے والے بھی ہوتے ہیں اور ظالم و جاہل بھی۔ داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر دو قسم کے طبقات سے اخلاقِ کریمانہ کا مظاہرہ کرے، ایسا نہ ہو کہ نیک لوگوں کے ساتھ تو نرم خو ہو، جبکہ بدکار ظالموں کے ساتھ ترش رُو ہو۔ مذکورہ آیتِ مبارکہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں طبقات کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آنے کی تلقین کی گئی ہے۔"

ارشادِ ربانی

۲- خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ (الاعراف)

ترجمہ:- عادت کر درگزر کی اور حکم کر نیک کام کرنے کا، اور کنارہ کر جاہلوں سے۔

خلاصۂ تفسیر

(لوگوں سے یہ برتاؤ رکھئے کہ ان کے اعمال و اخلاق سے) سرسری (نظر میں جو) برتاؤ (معقول و مناسب معلوم ہوں ان) کو قبول کرلیا کیجئے (ان کی تہ اور حقیقت کی تلاش نہ کیجئے بلکہ ظاہری نظر میں سرسری طور پر جو کام کسی سے اچھا ہو اس کو بھلائی پر محمول کیجئے، باطن کا حال اللہ کے سپرد کیجئے کیونکہ پورا اِخلاص و نیز شرائطِ قبول کی جامعیت اُخص الخواص کا حصہ ہے، حاصل یہ کہ معاشرت میں سہولت رکھئے، تشدّد نہ کیجئے، یہ برتاؤ تو اچھے کاموں میں ہے) اور (جو کام ظاہر نظر میں بھی بُرا ہو اس میں یہ برتاؤ رکھئے کہ اس باب میں) نیک کام کی تعلیم کردیا کیجئے (اور ان کے بہت درپے نہ ہوجئے)۔

پہلا جملہ "خُذِ الْعَفْوَ" ہے، عربی لغت کے اعتبار سے لفظ 'عفو' کے کئی معنیٰ ہوسکتے ہیں، اور اس موقع پر ہر معنیٰ کی گنجائش ہے، اسی لئے علمائے تفسیر کی مختلف جماعتوں نے مختلف معنیٰ لئے ہیں، جمہورِ مفسرین نے جس کو اِختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ "عفو" کہا جاتا ہے ہر ایسے کام کو جو آسانی کے ساتھ بغیر کسی کلفت اور مشقت کے ہوسکے، تو معنیٰ اس جملے کے یہ ہوئے کہ آپ قبول کرلیا کریں اُس چیز کو جو لوگ آسانی سے کرسکیں، یعنی واجباتِ شرعیہ میں آپ لوگوں سے اعلیٰ معیار کا مطالبہ نہ کریں، بلکہ وہ جس پیمانے پر آسانی سے عمل پیرا ہوسکیں اُتنے ہی درجے کو قبول کرلیا کریں، مثلاً نماز کی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ بندہ ساری دُنیا سے منقطع اور یکسو ہوکر اپنے رَبّ کے سامنے ہاتھ باندھے ہوئے اس لئے کھڑا ہے کہ حمد و ثنا کے ساتھ اپنے معروضات کو بلاواسطہ بارگاہِ اِلٰہی میں خود پیش کر رہا ہے، گویا وہ اس وقت براہِ راست حق تعالیٰ شانہٗ سے مخاطب ہے، اس کے جو آثارِ خشوع، خضوع، ادب و احترام کے ہونا چاہئیں، ظاہر ہے کہ لاکھوں نمازیوں میں سے کسی کسی اللہ کے بندے کو نصیب ہوتے ہیں، عام لوگ اس درجے کو نہیں پاسکتے تو اس آیت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تعلیم دی کہ آپ ان لوگوں سے اس اعلیٰ معیار کا مطالبہ ہی نہ رکھیں بلکہ جس

درجے کو وہ آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں وہ ہی قبول فرمالیں، اسی طرح دُوسری عبادات زکوٰۃ، روزہ، حج اور عام معاملات ومعاشرت کے واجباتِ شرعیہ میں جو لوگ پورا پورا حق ادا نہیں کر سکتے ان سے سرسری اطاعت وفرماں برداری ہی کو قبول کر لیا جائے۔

صحیح بخاری میں بروایت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آیت کے یہی معنیٰ نقل کیے گئے ہیں۔

اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے نازل ہونے پر فرمایا کہ: مجھے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے اعمال واخلاق میں سرسری اطاعت قبول کرنے کا حکم دیا ہے، میں نے عزم کر لیا ہے کہ جب تک میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں ایسا ہی عمل کروں گا۔ (ابنِ کثیر)

اَئمۂ تفسیر کی ایک بڑی جماعت حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، صدیقہ عائشہؓ اور مجاہدؒ وغیرہ نے اس جملے کے بھی یہی معنیٰ قرار دیے ہیں۔

دُوسرے معنیٰ ''عفو'' کے معافی اور درگزر کے بھی آتے ہیں، علمائے تفسیر کی ایک جماعت نے اس جگہ یہی معنیٰ مراد لے کر اس جملے کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گناہگاروں، خطاکاروں کے گناہ وقصور کو معاف کر دیا کریں۔

اِمامِ تفسیر ابنِ جریر طبری رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریلِ امین علیہ السلام سے آیت کا مطلب پوچھا، جبریلِ امین نے اللہ تعالیٰ سے دریافت کرنے کے بعد یہ مطلب بتلایا کہ اس آیت میں آپ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو شخص آپ پر ظلم کرے آپ اس کو معاف کر دیں، اور جو آپ کو کچھ نہ دے آپ اُس پر بخشش کریں، اور جو آپ سے تعلق قطع کرے آپ اس سے بھی ملا کریں۔

اس جگہ ابنِ مردویہؒ نے بروایت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ غزوۂ اُحد میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا اور

بڑی بے دردی سے ان کے اعضاء کاٹ کر لاش کی بے حرمتی کی گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لاش کو اس ہیئت میں دیکھ کر فرمایا کہ جن لوگوں نے حمزہ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے میں ان کے ستر آدمیوں کے ساتھ ایسا معاملہ کر کے چھوڑوں گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا گیا کہ آپ کا یہ مقام نہیں، آپ کے شایانِ شان یہ ہے کہ عفوودرگزر سے کام لیں۔

اس مضمون کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو اِمام احمدؒ نے عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کی ہے کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مکارمِ اخلاق کی تعلیم دی وہ وہی تھی کہ جو شخص تم پر ظلم کرے اس کو معاف کردو، جو تم سے قطع تعلق کردے تم اس سے ملا کرو، جو تمہیں محروم کردے تم اس کو بخشش دیا کرو۔

اور بیہقی نے بروایت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ: میں تم کو اَوّلین وآخرین کے اخلاق سے بہتر اخلاق کی تعلیم دیتا ہوں، وہ یہ ہے کہ جو شخص تم کو محروم کرے تم اُس پر بخشش کرو، جو تم پر ظلم کرے تم اس کو معاف کردو، جو تم سے تعلق قطع کرے تم اُس سے بھی ملا کرو۔

لفظ ''عفو'' کے پہلے اور دُوسرے معنیٰ میں اگرچہ فرق ہے، لیکن حاصل دونوں کا ایک ہی ہے کہ لوگوں کے اعمال واخلاق میں سرسری اطاعت وفرماں برداری کو قبول فرمالیا کریں، زیادہ تجسّس اور تفتیش میں نہ پڑیں، اوران سے اعلیٰ معیار کی اطاعت کا مطالبہ نہ کریں، اوران کی خطاؤں اور قصور سے درگزر فرمائیں، ظلم کا انتقام نہ لیں، چنانچہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال واخلاق ہمیشہ اسی سانچے میں ڈھلے رہے جس کا پورا مظاہرہ اس وقت ہوا جب مکہ فتح ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دُشمن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضے میں آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو آزاد کر کے فرمادیا کہ: تمہارے مظالم کا بدلہ لینا تو کیا، ہم تمہیں پچھلے معاملات پر ملامت بھی نہیں کرتے۔

دُوسرا جملہ اس ہدایت نامے کا "وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ" ہے، "عرف" بمعنی معروف ہر اچھے اور مستحسن کام کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آپ کے ساتھ بُرائی اور ظلم سے پیش آئیں، آپ ان سے انتقام نہ لیں بلکہ معاف کردیں، مگر ساتھ ہی ان کو نیک کام کی ہدایت بھی کرتے رہیں، گویا بدی کا بدلہ نیکی سے، ظلم کا بدلہ صرف انصاف ہی سے نہیں بلکہ احسان سے دیں۔

تیسرا جملہ: "وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ" ہے، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جاہلوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کنارہ کش ہوجائیں، مطلب یہ ہے کہ ظلم کا انتقام چھوڑ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ خیرخواہی اور ہمدردی کا معاملہ کریں اور نرمی کے ساتھ ان کو حق بات بتلائیں۔ مگر بہت سے جاہل ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس شریفانہ معاملے سے متأثر نہیں ہوتے اس کے باوجود جہالت اور سختی سے پیش آتے ہیں، تو ایسے لوگوں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ یہ ہونا چاہئے کہ ان کے دِل خراش اور جاہلانہ کلام سے متأثر ہوکر انہیں جیسی سخت گفتگو نہ کریں بلکہ ان سے کنارہ کش ہوجائیں۔

اِمامِ تفسیر ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: کنارہ کش ہونے کا بھی مطلب یہ ہے کہ ان کی بُرائی کا جواب بُرائی سے نہ دیں، یہ معنیٰ نہیں کہ ان کو ہدایت کرنا چھوڑ دیں کہ یہ وظیفۂ رِسالت و نبوّت کے شایانِ شان نہیں۔

صحیح بخاری میں اس جگہ ایک واقعہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں عیینہ ابن حصن مدینہ میں آیا اور اپنے بھتیجے حُرّ ابنِ قیس رضی اللہ عنہ کا مہمان ہوا، حضرت حرّ بن قیسؓ اُن اہلِ علم حضرات میں سے تھے جو حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی مجلسِ مشاورت میں شریک ہوا کرتے تھے، عیینہ نے اپنے بھتیجے حرّ بن قیسؓ سے کہا کہ: تم امیرالمؤمنین کے مقرّب ہو، میرے لئے ان سے ملاقات کا کوئی وقت لے لو، حرّ بن قیس رضی اللہ عنہ نے فاروقِ اعظم

رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ میرا چچا عیینہ آپ سے ملنا چاہتا ہے، آپ نے اجازت دے دی۔

مگر عیینہ نے فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی مجلس میں پہنچ کر نہایت غیر مہذّب اور غلط گفتگو کی، کہ نہ آپ ہمیں ہمارا پورا حق دیتے ہیں، نہ ہمارے ساتھ انصاف کرتے ہیں، فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو اس پر غصہ آیا تو حرّ بن قیس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ: امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ" اور یہ شخص بھی جاہلین میں سے ہے۔ یہ آیت سنتے ہی فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا سارا غصہ ختم ہوگیا اور اس کو کچھ نہیں کہا۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی یہ عادت معروف و مشہور تھی کہ: "كَانَ وَقَّافًا عِنْدَ كِتَابِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ" یعنی کتاب اللہ کے اَحکام کے آگے گردن ڈالتے تھے۔

یہ آیت مکارمِ اخلاق کی جامع آیت ہے، بعض علماء نے اس کا خلاصہ یہ بیان فرمایا ہے کہ لوگ دو قسم کے ہیں، ایک محسن یعنی اچھے کام کرنے والے، دُوسرے بدکار ظالم، اس آیت نے دونوں طبقوں کے ساتھ اخلاقِ کریمانہ برتنے کی یہ ہدایت دی ہے کہ نیک کام کرنے والوں سے ان کی ظاہری نیکی کو قبول کرلو، زیادہ تفتیش و تجسّس میں نہ پڑو اور نیکی کے اعلیٰ معیار کا ان سے مطالبہ نہ کرو بلکہ جتنا وہ آسانی سے کرسکیں اس کو کافی سمجھو، اور بدکاروں کے معاملے میں یہ ہدایت دی کہ ان کو نیک کام سکھاؤ اور نیکی کا راستہ بتلاؤ، اگر وہ اس کو قبول نہ کریں اور اپنی گمراہی اور غلطی پر جمے رہیں اور جاہلانہ گفتگو سے پیش آئیں تو ان سے علیحدہ ہوجائیں اور ان کی جاہلانہ گفتگو کا جواب نہ دیں، اس طرز سے یہ اُمید ہے کہ ان کو کسی وقت ہوش آئے اور اپنی غلطی سے باز آجائیں۔ (معارف القرآن ج:۴ ص:۱۵۵)

شفقت اور نرمی

"جو لوگ اصلاحِ خلق اور دعوتِ دِین کی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ اخلاقِ انبیاء سے متصف

ہوں۔انبیائے کرام علیہم السلام کے اخلاق میں سے یہ بات بھی اہم ہے کہ وہ دعوتِ دِین میں خیرخواہی اور نرم کلامی کو اِختیار کرتے تھے خواہ مقابل میں کتنا ہی بڑا سرکش کیوں نہ ہو۔ یہی نرم کلامی اور خیرخواہی تھی کہ ان کی دعوت میں تأثیر ہوتی تھی۔آج ہماری دعوت وتبلیغ کے مؤثر نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم مخاطب کو نیچا دِکھانے کی کوشش کرتے ہیں، جس میں حدودِ شرعیہ سے تجاوز کرکے سب وشتم اور طعن وتشنیع تک بات پہنچ جاتی ہے اور دعوت کی تأثیر جاتی رہتی ہے۔ مذکورہ آیاتِ مبارکہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے نرم کلامی اور خیرخواہی کی تلقین فرمائی ہے۔"

ارشادِ ربانی

۱- اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾ (طٰهٰ)

ترجمہ:- جاؤ طرف فرعون کی، اُس نے بہت سر اُٹھایا، سو کہو اُس سے بات نرم شاید وہ سوچے یا ڈرے

خلاصۂ تفسیر

(سو اَب) تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیاں (یعنی معجزات کہ اصل دو معجزے ہیں، عصا و یدِ بیضا اور ہر ایک میں وجوہِ اعجاز متعدّد ہیں) لے کر (جس موقع کے لئے حکم ہوتا ہے) جاؤ اور میری یادگاری میں (خواہ خلوَت میں، خواہ تبلیغ کے وقت) سستی مت کرنا (اب موقع جانے کا بتلایا جاتا ہے کہ) دونوں فرعون کے پاس جاؤ، وہ بہت نکل چلا ہے، پھر (اس کے پاس جاکر) اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ (رغبت سے) نصیحت قبول کرلے یا (عذابِ اِلٰہی سے) ڈر جاوے (اور اس سے مان جاوے)۔

مذکورہ بالا دو آیاتِ مبارکہ میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون کی ہدایت

کے لئے بھیجنے کا حکم ایک خاص ہدایت کے ساتھ دیا گیا ہے، یعنی "فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى"۔

پیغمبرانہ دعوت کا ایک اہم اُصول

اس میں پیغمبرانہ دعوت کا ایک اہم اُصول یہ بیان ہوا کہ فریقِ مخالف کتنا ہی سرکش اور غلط سے غلط عقائد و خیالات کا حامل ہو، اصلاح و ہدایت کا فریضہ انجام دینے والوں پر لازم ہے کہ اس کے ساتھ بھی ہمدردانہ، خیرخواہانہ انداز سے نرم بات کریں، اسی کا یہ نتیجہ ہوسکتا ہے کہ مخاطب کچھ غور و فکر پر مجبور ہوجائے اور اس کے دِل میں خدا کا خوف پیدا ہوجائے۔

فرعون جو خدائی کا دعوے دار جبار اور ظالم ہے، جو اپنی ذات کی حفاظت کے لئے ہزارہا بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کا مجرم ہے، اُس کی طرف بھی اللہ تعالیٰ اپنے خاص پیغمبروں کو بھیجتے ہیں تو یہ ہدایت نامہ دے کر بھیجتے ہیں کہ اُس سے بات نرم کریں تاکہ اس کو غور و فکر کا موقع ملے، اور یہ اُس پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ فرعون اپنی سرکشی اور گمراہی سے باز آنے والا نہیں ہے، مگر اپنے پیغمبروں کو اس اُصول کا پابند کرنا تھا جس کے ذریعے خلقِ خدا سوچنے سمجھنے پر مجبور ہوکر خدا تعالیٰ کے خوف کی طرف آجائے، فرعون کو ہدایت ہو یا نہ ہو، مگر اُصول وہ ہونا چاہئے جو ہدایت و اصلاح کا ذریعہ بن سکے۔

آج کل جو بہت سے اہلِ علم اپنے اختلافات میں ایک دُوسرے کے خلاف زبان درازی اور اِلتزام تراشی کو اِسلام کی خدمت سمجھ بیٹھے ہیں، اُنہیں اس پر بہت غور کرنا چاہئے۔ (معارف القرآن ج:۶ ص:۱۰۹)

ارشادِ ربانی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

۲- حٰمٓ ﴿١﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿٢﴾ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ

التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ۙ ذِي الطَّوْلِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ③ مَا
يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ④
كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۠ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۢ
بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۣ
فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ⑤ (المؤمن)

ترجمہ:- اُتارنا کتاب کا اللہ سے ہے جو زبردست ہے خبردار۔ گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا، سخت عذاب دینے والا، مقدور والا۔ کسی کی بندگی نہیں سوائے اس کے، اسی کی طرف پھر جانا ہے۔ وہ ہی جھگڑتے ہیں اللہ کی باتوں میں جو منکر ہیں، سو تجھ کو دھوکا نہ دے یہ بات کہ وہ چلتے پھرتے ہیں شہروں میں۔ جھٹلا چکے ہیں اُن سے پہلے قوم نوح کی اور کتنے فرقے ان سے پیچھے، اور ارادہ کیا ہر اُمت نے اپنے رسول پر کہ اس کو پکڑ لیں اور لانے لگے جھوٹے جھگڑے کہ اس سے ڈگاویں سچے دِین کو، پھر میں نے اُن کو پکڑ لیا (کہو) پھر کیسا ہوا میرا سزا دینا۔

خلاصۂ تفسیر

حٰمٓ (اس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ کتاب اُتاری گئی ہے اللہ کی طرف سے جو زبردست ہے، ہر چیز کا جاننے والا ہے، گناہ بخشنے والا ہے اور توبہ کا قبول کرنے والا ہے، سخت سزا دینے والا ہے، اُس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں، اسی کے پاس (سب کو) جانا ہے (پس قرآن مجید اور توحید کی حقیقت کا مقتضا یہ ہے کہ اس میں انکار وجدال نہ کیا جاوے مگر پھر بھی) اللہ تعالیٰ کی ان آیتوں میں (یعنی قرآن میں جو توحید پر بھی مشتمل ہے) وہی لوگ (ناحق کے) جھگڑے نکالتے ہیں جو (اس کے) منکر ہیں (اور اس انکار کا مقتضا یہ ہے

کہ ان کو سزا دی جاتی ہے، لیکن عاجلاً سزا نہ ہونا اِستدراج یعنی چندروزہ مہلت دینا ہے) سو ان لوگوں کا شہروں میں (امن وامان سے دُنیوی کاروبار کے لئے) چلنا پھرنا آپ کو اشتباہ میں نہ ڈالے (کہ اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ اسی طرح سزا وعذاب سے بچے رہیں گے اور آرام سے رہیں گے، اور آپ کے اس خطاب سے دُوسروں کو سنانا مقصود ہے، غرض ان پر دارو گیر ضرور ہوگی خواہ دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی یا صرف آخرت میں، چنانچہ) ان سے پہلے نوح (علیہ السلام) کی قوم نے اور دُوسرے گروہوں نے بھی جو ان کے بعد ہوئے (جیسے عاد وثمود وغیرہم دِینِ حق کو) جھٹلایا تھا اور ہر اُمت (میں سے جو لوگ ایمان نہ لائے تھے انہوں) نے اپنے پیغمبر کے گرفتار کرنے کا ارادہ کیا (کہ پکڑ کر قتل کردیں) اور ناحق کے جھگڑے نکالے تاکہ اُس ناحق سے حق کو باطل کردیں، سو میں نے (آخر) اُن پر دارو گیر کی، سو (دیکھو) میری طرف سے (ان کو) کیسی سزا ہوئی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ہدایت

ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے ابنِ ابی حاتم کی سند سے نقل کیا ہے کہ ایک اہلِ شام میں سے بڑا بارُعب قوی آدمی تھا اور فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس آیا کرتا تھا، کچھ عرصے تک وہ نہ آیا تو فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے اس کا حال پوچھا، لوگوں نے کہا کہ: امیر المؤمنین! اس کا حال نہ پوچھئے، وہ تو شراب میں بدمست رہنے لگا۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے منشی کو بلایا اور کہا کہ یہ خط لکھو:-

من عمر بن الخطاب الٰی فلان بن فلان، سلام علیك، فانی أحمد الیك اللہ الذی لا الٰہ اِلّا ھو غافر الذّنب وقابل التّوب شدید العقاب ذی الطول لا اللہ اِلّا ھو الیہ المصیر۔

ترجمہ:- من جانب عمر بن خطاب بنام فلاں بن فلاں۔ سلام علیک، اس کے بعد میں تمہارے لئے اُس اللہ کی حمد پیش کرتا ہوں جس کے

سوا کوئی معبود نہیں، وہ گناہوں کو معاف کرنے والا، توبہ قبول کرنے والا، سخت عذاب والا، بڑی قدرت والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اُسی کی طرف لَوٹ کر جانا ہے۔

پھر حاضرینِ مجلس سے کہا کہ سب مل کر اس کے لئے دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو پھیر دے اور اس کی توبہ قبول فرمائے۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے جس قاصد کے ہاتھ یہ خط بھیجا تھا اس کو ہدایت کر دی تھی کہ یہ خط اس کو اس وقت تک نہ دے جب تک کہ وہ نشے سے ہوش میں نہ آئے اور کسی دُوسرے کے حوالے نہ کرے۔ جب اس کے پاس حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ خط پہنچا اور اس نے پڑھا تو بار بار ان کلمات کو پڑھتا اور غور کرتا رہا کہ اس میں مجھے سزا سے ڈرایا بھی گیا ہے اور معاف کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے، پھر رونے لگا اور شراب خوری سے باز آ گیا، تو ایسی توبہ کی کہ پھر اس کے پاس نہ گیا۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو جب اس اثر کی خبر ملی تو لوگوں سے فرمایا کہ: ایسے معاملات میں تم سب کو ایسا ہی کرنا چاہئے کہ جب کوئی بھائی کسی لغزش میں مبتلا ہو جائے تو اس کو دُرستی پر لانے کی فکر نہ کرو اور اس کو اللہ کی رحمت کا بھروسہ دِلاؤ اور اللہ سے اس کے لئے دُعا کرو کہ وہ توبہ کر لے، اور تم اس کے مقابلے پر شیطان کے مددگار نہ بنو، یعنی اس کو بُرا بھلا کہہ کر یا غصہ دِلا کر اور دِین سے دُور کر دو گے تو یہ شیطان کی مدد ہوگی۔ (ابنِ کثیر)

تنبیہ

جو لوگ اصلاحِ خلق اور تبلیغ و دعوت کی خدمت انجام دینے والے ہیں، ان کے لئے اس حکایت میں ایک عظیم الشان ہدایت ہے کہ جس شخص کی اصلاح مقصود ہو اس کے لئے خود بھی دُعا کرو، پھر نرم تدابیر سے اس کو دُرستی کی طرف لاؤ، اشتعال انگیزی نہ کرو کہ اس سے اس کو نفع نہیں پہنچے گا بلکہ شیطان کی اِمداد ہوگی اور وہ اس کو اور زیادہ گمراہی میں مبتلا کر دے گا۔ (معارف القرآن ج:۷ ص:۵۸۲)

ارشادِ ربانی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۳- یٰۤاَیُّهَا الۡمُدَّثِّرُ ﴿۱﴾ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ﴿۲﴾ وَرَبَّکَ فَکَبِّرۡ ﴿۳﴾ وَثِیَابَکَ فَطَهِّرۡ ﴿۴﴾

(المُدَّثِّر)

ترجمہ:- اے لحاف میں لپٹنے والے! کھڑا ہو، پھر ڈر سنا دے، اور اپنے رَبّ کی بڑائی بول، اور اپنے کپڑے پاک رکھ۔

خلاصۂ تفسیر

سورۂ مدثر کے شروع میں جو اَحکام دیئے گئے ہیں ان کا تعلق زیادہ تر دعوت و تبلیغ اور اصلاحِ خلق سے ہے۔

سورۂ مدثر میں سب سے پہلا حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دیا گیا ہے کہ: "قُمۡ فَاَنۡذِرۡ" یعنی کھڑے ہو جایئے، اس کے معنی حقیقی قیام کے بھی ہو سکتے ہیں کہ آپ جو کپڑوں میں لپٹ کر لیٹ گئے ہیں، اس کو چھوڑ کر کھڑے ہو جایئے۔ اور یہ معنی بھی بعید نہیں کہ قیام سے مراد کام کے لئے مستعد اور تیار ہونا ہو، اور مطلب یہ ہو کہ اب آپ ہمت کر کے خلقِ خدا کی اصلاح کی خدمت سنبھالئے۔ "فَاَنۡذِرۡ" اِنذار سے مشتق ہے، جس کے معنی ڈرانے کے ہیں، مگر ایسا ڈرانا جو شفقت و محبت پر مبنی ہوتا ہے جیسے باپ اپنے بچے کو سانپ، بچھو اور آگ سے ڈراتا ہے، انبیاء کی یہی شان ہوتی ہے، اس لئے اُن کا لقب ''نذیر'' اور ''بشیر'' ہوتا ہے، ''نذیر'' کے معنی شفقت و ہمدردی کی بنا پر مضر چیزوں سے ڈرانے والا، اور ''بشیر'' کے معنی خوش خبری سنانے والا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی دونوں ہی لقب قرآنِ کریم میں جابجا مذکور ہیں مگر اس جگہ صرف اِنذار کے ذکر پر اِکتفا اس لئے کیا گیا کہ اس وقت مؤمن مسلمان تو گنے چنے چند ہی تھے، باقی سب منکر و کفار تھے جو کسی بشارت کے مستحق نہیں بلکہ ڈرانے ہی کے مستحق تھے۔ (معارف القرآن ج:۸ ص:۶۱۰)

ارشادِ ربانی

۴- فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ
حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ
فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾ (آل عمران)

ترجمہ:- سو کچھ اللہ ہی کی رحمت ہے، جو تو نرم دِل مل گیا اُن کو، اور اگر تو ہوتا تند خو، سخت دِل تو متفرق ہو جاتے تیرے پاس سے، سو تو ان کو معاف کر اور ان کے واسطے بخشش مانگ اور ان سے مشورہ لے کام میں، پھر جب قصد کر چکا تو اس کام کا تو پھر بھروسہ کر اللہ پر، اللہ کو محبت ہے توکل کرنے والوں سے۔

خلاصۂ تفسیر

بعد اس کے (کہ صحابہ کرامؓ سے ایسی لغزش ہوئی جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملامت اور مؤاخذہ کرنے کا حق تھا) خدا ہی کی رحمت کے سبب (جو کہ آپ پر ہے) آپ ان کے ساتھ نرم رہے، اور اگر آپ (خدانخواستہ) تند خو، سخت مزاج ہوتے تو یہ (بیچارے) آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے (پھر ان کو یہ فیوض و برکات کہاں نصیب ہوتے) سو (جب آپ نے برتاؤ میں ایسی نرمی فرمائی تو ان سے جو غلطی آپ کی تعمیلِ حکم میں ہوگئی ہے اس کو دِل سے بھی) ان کو معاف کر دیجئے (اور ان سے جو غلطی اللہ تعالیٰ کے حکم میں کوتاہی سے ہوئی اس کے لئے) آپ ان کے لئے اِستغفار کیجئے (اگرچہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کی معافی اور مغفرت کا اعلان پہلے ہی فرما دیا تھا مگر آپ کا ان کے لئے دُعائے مغفرت کرنا مزید ان کے لئے مفید اور موجبِ تسلی ہوگا) اور ان سے خاص خاص باتوں میں (بدستور) مشورہ لیتے رہا کیجئے (تاکہ اس خصوصی لطف سے ان کے دِلوں سے غم دُھل جائے) پھر (مشورہ لینے کے بعد) جب آپ (کسی ایک جانب) رائے پختہ کرلیں (خواہ وہ ان کے

مشورے کے موافق ہو یا مخالف) تو خدا تعالیٰ پر اِعتماد (کرکے اس کام کو کرڈالا) کریں، بے شک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔

مرشد ومربی کی خاص صفات

صحابہ کرامؓ جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشاق اور اپنی جان و مال سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عزیز رکھنے والے تھے، ان سے جب آپ کے حکم کے خلاف ایک لغزش صادر ہوگئی تو یہاں ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ ان حضرات کو جب اپنی لغزش اور خلاف ورزیٔ حکم پر تنبہ ہوا تو ان کا صدمہ حد سے بڑھ جائے، جو اُن کے قلب و دِماغ کو معطل کردے، یا رحمت سے مایوس بنادے، اس کا علاج تو پچھلی آیت میں بتلادیا گیا کہ: "فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ" اس لغزش کی سزا دُنیا میں دی جاچکی ہے، آخرت کا کھاتہ بے باق ہوگیا۔

دُوسری طرف رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس غلطی اور لغزش کے نتیجے میں زخمی ہوئے، جس سے جسمانی تکلیف بھی پہنچی اور رُوحانی تکلیف تو پہلی ہی سے تھی، تو اس جسمانی ورُوحانی تکلیف سے یہ احتمال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک میں صحابہ کرامؓ کی طرف سے تکدّر پیدا ہوجائے، جو اُن کی ہدایت وتلقین میں مخل ہوجائے، اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تعلیم دینا تھی کہ آپ ان کی خطا سے درگزر فرمائیں، ان کی لغزش دِل سے معاف کردیں اور آئندہ کے لئے بھی لطف ومہربانی کا معاملہ جاری رکھیں۔

اس مضمون کو حق تعالیٰ نے ایک عجیب وغریب اُسلوبِ بیان کے ساتھ ارشاد فرمایا جس میں ضمنی طور پر چند اہم فوائد بھی آگئے۔

ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان چیزوں کا حکم ایسے انداز سے دیا گیا ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ثنا وتعریف اور عظمتِ شان کا اظہار بھی ہے کہ یہ صفات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر پہلے سے موجود ہیں، اور دُوسرے اس سے پہلے "فَبِمَا رَحْمَةٍ"

کا لفظ بڑھا کر یہ بھی بتلا دیا کہ ان صفاتِ کمال کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر ہونا یہ ہماری رحمت سے ہے، کسی کا ذاتی کمال نہیں، پھر لفظِ ''رحمت'' کو بصورتِ نکرہ لا کر رحمت کے عظیم اور وسیع ہونے کی طرف اشارہ کر کے یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ رحمت صرف صحابہ کرامؓ پر ہی نہیں، بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان صفاتِ کمال کے ساتھ متصف فرما دیا۔

اس کے بعد ایک تیسرا اہم فائدہ بعد کے جملوں سے ظاہر فرما دیا کہ یہ نرم خوئی، خوش اخلاقی، عفو و درگزر اور لطف و مہربانی کی صفات اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر نہ ہوتیں تو اِصلاحِ خلائق کا جو کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہے وہ حسبِ منشا انجام نہ پاتا، لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اپنی اصلاح اور تزکیۂ اخلاق کا فائدہ حاصل کرنے کے بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھاگ جاتے۔

اور اس سب مجموعے سے ایک اور اہم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ ارشاد و اصلاح اور تبلیغ کے آداب اس سے معلوم ہو گئے کہ جو شخص رُشد و ہدایت اور دعوت الی اللہ اور اصلاحِ خلق کے کام کا ارادہ کرے اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ صفات اپنے اندر پیدا کرے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کے محبوب رسول کی سختی برداشت نہیں ہو سکتی تو پھر کس کی مجال ہے کہ وہ تشدّد اور کج خلقی کے ساتھ خلق اللہ کو اپنے گرد جمع کر سکے، اور ان کی اصلاح کا فرض انجام دے سکے۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تند خو، سخت طبیعت ہوتے تو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے منتشر ہو جاتے، اس سے معلوم ہوا کہ مرشد و مبلغ کے لئے تند خوئی، سخت کلامی، زہر اور اس کے کام کو ضائع کرنے والی چیز ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: ''فَاعْفُ عَنْهُمْ'' یعنی ان سے جو خطا ہو گئی ہے اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم معاف فرما دیں، اس سے معلوم ہوا کہ مصلح کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ عوام کی خطاؤں کا انتقام نہ لے، بلکہ عفو و درگزر سے کام لے، بُرا کہنے والوں پر مشتعل نہ ہو،

ایذا دینے والوں سے نرمی کا معاملہ کرے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: "وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ" یعنی آپ اُن کے لئے اللہ تعالیٰ سے بھی مغفرت طلب کریں، جس مین یہ ہدایت ہے کہ صرف یہی نہیں کہ ان کی ایذاؤں پر صبر کریں، بلکہ دِل سے اُن کی خیر خواہی نہ چھوڑیں، اور چونکہ سب سے بڑی خیر خواہی ان کی آخرت کی دُرستی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے کے لئے بخشش کی دُعا مانگیں۔ (معارف القرآن ج:۲ ص:۲۱۶)

ارشادِ ربانی

۵- وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

(البقرة)

ترجمہ:- اور جب ہم نے لیا قرار بنی اسرائیل سے کہ عبادت نہ کرنا مگر اللہ کی، اور ماں باپ سے سلوک نیک کرنا اور کنبے والوں سے اور یتیموں اور محتاجوں سے، اور کہیو سب لوگوں سے نیک بات اور قائم رکھیو نماز اور دیتے رہیو زکوٰۃ، پر تم پھر گئے مگر تھوڑے سے تم میں، اور تم ہی ہو پھرنے والے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب لیا ہم نے (توریت میں) قول وقرار بنی اسرائیل سے کہ عبادت مت کرنا (کسی کی) بجز اللہ کے، اور ماں باپ کی اچھی طرح خدمت گزاری کرنا اور اہلِ قرابت کی بھی اور بے باپ کے بچوں کی بھی اور غریب محتاجوں کی بھی، اور عام لوگوں سے (جب کوئی) بات (کہنا ہو تو) اچھی طرح (خوش خلقی سے) کہنا اور پابندی رکھنا

نماز کی اور ادا کرتے رہنا زکوٰۃ، پھر تم (قول وقرار کرکے) اس سے پھر گئے بجز معدودے چند کے، اور تمہاری تو معمولی عادت ہے اقرار کرکے ہٹ جانا۔

فائدہ:- یہ معدودے چند وہ لوگ ہیں جو توریت کے پورے پابند رہے، توریت کے منسوخ ہونے سے قبل شریعتِ موسویہ کے پابند رہے، جب توریت منسوخ ہوگئی تو شریعتِ محمدیہ کے متبع ہوگئے۔

مسئلہ:- اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ اَحکام اسلام اور سابقہ شریعتوں میں مشترک ہیں جن میں توحید، والدین اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کی خدمت اور تمام انسانوں کے ساتھ گفتگو میں نرمی وخوش خلقی کرنا اور نماز اور زکوٰۃ سب داخل ہیں۔

کافر سے بھی سخت کلامی ممنوع ہے

"قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا" سے مراد قَـولًا ذا حسن ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ جب لوگوں سے خطاب کرے تو بات نرم کرے، خوش رُوئی اور کشادہ دِلی سے کرے، چاہے مخاطب نیک ہو یا بد، سنی ہو بدعتی، ہاں دِین کے معاملے میں مداہنت اور اس کی خاطر سے حق پوشی نہ کرے، وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جب موسیٰ وہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو یہ ہدایت نامہ دیا کہ: "فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا" تو آج جو کلام کرنے والا ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے افضل نہیں، اور مخاطب کتنا ہی بُرا ہو فرعون سے زیادہ بُرا خبیث نہیں۔

طلحہ بن عمرؒ کہتے ہیں کہ میں نے اِمامِ تفسیر وحدیث عطاء رحمہ اللہ سے کہا کہ آپ کے پاس فاسد عقیدے والے لوگ بھی جمع رہتے ہیں، مگر میرے مزاج میں تیزی ہے، میرے پاس ایسے لوگ آتے ہیں تو میں ان کو سخت باتیں کہہ دیتا ہوں۔ حضرت عطاء رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: ایسا نہ کیا کرو، کیونکہ حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ "قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا" اس میں تو یہودی ونصرانی بھی داخل ہیں، مسلمان خواہ کیسا ہی ہو وہ کیوں نہ داخل ہوگا (قرطبی)۔

(معارف القرآن ج:۱ ص:۲۵۳)

مواقعِ تہمت سے اِحتراز

''داعی حق کو ہر ایسے کام سے اجتناب کرنا چاہئے جو دعوت کے کام میں خلل پیدا کرتا ہو، اسی میں یہ بھی شامل ہے کہ داعی مواقعِ تہمت سے بچے، اور کوئی ایسا فعل نہ کرے جس سے لوگوں کو بدگمانی پیدا ہوتی ہو۔ اگر کہیں ایسا شبہ ہو کہ لوگوں کو بدگمانی پیدا ہوگی تو فوراً اس بات کی تصریح کردے۔ مذکورہ دو واقعات (حضرت یوسف علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کا واقعہ) اس سلسلے میں مدنظر رہنا چاہئے۔''

ارشادِ ربانی

۱۔ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾ (یوسف)

ترجمہ:- کہا بادشاہ نے عورتوں کو: کیا حقیقت ہے تمہاری جب تم نے پھسلایا یوسف کو اس کے نفس کی حفاظت سے، بولیں: حاشاللہ ہم کو معلوم نہیں اس پر کچھ بُرائی، بولی عورت عزیز کی: اب کھل گئی سچی بات، میں نے پھسلایا تھا اس کو اس کے جی سے اور وہ سچا ہے۔ یوسف نے کہا: یہ اس واسطے کہ عزیز معلوم کرلیوے کہ میں نے اس کی چوری نہیں کی چھپ کر، اور یہ کہ اللہ نہیں چلاتا فریب دغابازوں کا۔

خلاصۂ تفسیر

کہا کہ تمہارا کیا واقعہ ہے جب تم نے یوسف (علیہ السلام) سے اپنے مطلب کی

خواہش کی (یعنی ایک نے خواہش کی اور بقیہ نے اس کی مدد کی، کہ اعانتِ فعل بھی مثل فعل کے ہے، اس وقت تم کو کیا تحقیق ہوا، شاید بادشاہ نے اس طور پر اس لئے پوچھا ہو کہ مجرم سن لے کہ بادشاہ کو اتنی بات معلوم ہے کہ کسی عورت نے اُن سے اپنا مطلب پورا کرنے کی بات کی تھی، شاید اس کا نام بھی معلوم ہو، اس حالت میں انکار نہ چل سکے گا، پس اس طرح شاید خود اِقرار کرلے) عورتوں نے جواب دیا کہ حاشاللہ ہم کو ان میں ذرا بھی تو بُرائی کی بات نہیں معلوم ہوئی (وہ بالکل پاک صاف ہیں، شاید عورتوں نے زلیخا کا وہ اقرار اس لئے ظاہر نہ کیا ہو کہ مقصود یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کا ثبوت تھا اور وہ حاصل ہو گیا، یا زلیخا کے رُوبرو ہونے سے حیا مانع ہوئی کہ اس کا نام لیں) عزیز کی بی بی (جو کہ حاضر تھی) کہنے لگی کہ اب تو حق بات (سب پر) ظاہر ہو ہی گئی (اب اِخفاء بیکار ہے، سچ یہی ہے کہ) میں نے ان سے اپنے مطلب کی خواہش کی تھی (نہ کہ انہوں نے جیسا میں نے الزام لگا دیا تھا "مَا جَزَآءُ مَنْ... الخ") اور بے شک وہی سچے ہیں (اور غالبًا ایسے اَمر کا اقرار کرلینا مجبوری کی حالت میں زلیخا کو پیش آیا، غرض تمام صورتِ مقدمہ اور اظہارات اور یوسف علیہ السلام کی براءت کا ثبوت ان کے پاس کہلا کر بھیجا، اس وقت) یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تمام اہتمام (جو میں نے کیا) محض اس وجہ سے تھا کہ عزیز کو (زائد) یقین کے ساتھ معلوم ہو جاوے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کی آبرو میں دست اندازی نہیں کی اور یہ (بھی معلوم ہو جائے) کہ اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا (چنانچہ زلیخا نے عزیز کی خدمت میں خیانت کی تھی کہ دُوسرے پر نگاہ کی، خدا نے اس کی قلعی کھول دی، پس میری غرض یہ تھی)۔

گیارہواں مسئلہ:- اس میں یہ ہے کہ جس طرح انبیاء علیہم السلام اور علمائے اُمت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کی آخرت دُرست کرنے کی فکر کریں، ان کو ایسے کاموں سے بچائیں جو آخرت میں عذاب بنیں گے، اسی طرح ان کو مسلمانوں کے معاشی حالات پر بھی نظر رکھنا چاہئے کہ وہ پریشان نہ ہوں، جیسے یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر صرف

تعبیرِ خواب بتادینے کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ یہ حکیمانہ اور خیر خواہانہ مشورہ بھی دیا کہ پیداوار کے تمام گیہوں کو خوشوں کے اندر رہنے دیں اور بقدرِ ضرورت صاف کر کے غلہ نکالیں تاکہ آخر سالوں تک خراب نہ ہوجائے۔

بارہواں مسئلہ:- یہ ہے کہ عالم مقتداء کو اس کی بھی فکر رہنی چاہئے کہ اس کی طرف سے لوگوں میں بدگمانی پیدا نہ ہو، اگرچہ وہ بدگمانی سراسر غلط ہی کیوں نہ ہو، اس سے بھی بچنے کی تدبیر کرنا چاہئے، کیونکہ بدگمانی خواہ کسی جہالت یا کم فہمی ہی کے سبب سے ہو بہرحال ان کی دعوت و اِرشاد کے کام میں خلل انداز ہوتی ہے، لوگوں میں اس کی بات کا وزن نہیں رہتا (قرطبی)۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "تہمت کے مواقع سے بھی بچو!" یعنی ایسے حالات اور مواقع سے بھی اپنے آپ کو بچاؤ جن میں کسی کو آپ پر تہمت لگانے کا موقع ہاتھ آئے، یہ حکم تو عام مسلمانوں کے لئے ہے، خواص اور علماء کو اس میں دُہری احتیاط لازم ہے، خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام عیوب اور گناہوں سے معصوم ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کا اہتمام فرمایا۔ ایک مرتبہ ازواجِ مطہراتؓ میں سے ایک بی بی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کی ایک گلی سے گزر رہی تھیں، کوئی صحابی سامنے آگئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُور ہی سے بتلادیا کہ میرے ساتھ فلاں بی بی ہیں۔ یہ اس لئے کیا کہ کہیں دیکھنے والے کو کسی اجنبی عورت کا شبہ نہ ہوجائے، اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل سے رہائی اور شاہی دعوت کا پیغام ملنے کے باوجود رہائی سے پہلے اس کی کوشش فرمائی کہ لوگوں کے شبہات دُور ہوجائیں۔

(معارف القرآن ج:۵ ص:۷۰)

ارشادِ ربانی

۲- وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِيٓ أَنْعَمَ ٱللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَٱتَّقِ ٱللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا ٱللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى ٱلنَّاسَ ۚ وَٱللَّهُ أَحَقُّ أَن

تَخۡشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَيۡدٌ مِّنۡهَا وَطَرًا زَوَّجۡنٰكَهَا لِكَىۡ لَا يَكُوۡنَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ حَرَجٌ فِىۡۤ اَزۡوَاجِ اَدۡعِيَآٮِٕهِمۡ اِذَا قَضَوۡا مِنۡهُنَّ وَطَرًا ؕ وَكَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ مَفۡعُوۡلًا ۝۳۷ (الاحزاب)

ترجمہ:- اور جب تو کہنے لگا اس شخص کو جس پر اللہ نے احسان کیا، اور تو نے احسان کیا، رہنے دے اپنے پاس اپنی جورو کو اور ڈر اللہ سے، اور تو چھپاتا تھا اپنے دِل میں ایک چیز جس کو اللہ کھولا چاہتا ہے، اور ڈرتا تھا لوگوں سے اور اللہ سے زیادہ چاہئے ڈرنا تجھ کو، پھر جب زید تمام کر چکا اس عورت سے اپنی غرض ہم نے اس کو تیرے نکاح میں دے دیا تا نہ رہے مسلمانوں پر گناہ نکاح کر لینا جورویں اپنے لے پالکوں کی جب وہ تمام کر لیں اُن سے اپنی غرض، اور ہے اللہ کا حکم بجالانا۔

خلاصۂ تفسیر

جب آپ (فہمائش ومشورے کے طور سے) اس شخص سے فرما رہے تھے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا (کہ اسلام کی توفیق دی جو اِنعامِ دِینی ہے، اور غلامی سے چھڑایا کہ نعمتِ دُنیویہ ہے) اور آپ نے بھی اِنعام کی (تعلیمِ دِین فرمائی اور آزاد کیا، اور پھوپھی زاد بہن سے نکاح کرایا، مراد حضرت زید رضی اللہ عنہ ہیں کہ آپ ان کو سمجھا رہے تھے) کہ اپنی بی بی (زینب) کو اپنی زوجیت میں رہنے دے (اور اس کی معمولی خطاؤں پر نظر نہ کر کہ گاہے اس سے ناموافقت ہو جاتی ہے) اور خدا سے ڈر (اور اس کے حقوق میں بھی کوتاہی نہ کر کہ کبھی اس سے ناموافقت پیدا ہو جاتی ہے) اور (جب شکایتیں حد سے متجاوز ہو گئیں اور قرائن سے اصلاح وتوافق کی اُمید نہ رہی تو اس وقت فہمائش کے ساتھ) آپ اپنے دِل میں وہ بات (بھی) چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ تعالیٰ (آخر میں) ظاہر کرنے والا تھا

(مراد اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح ہے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے جبکہ زید اِن کو طلاق دے دیں جس کو حق تعالیٰ نے "زَوَّجْنٰكَهَا" میں قولاً اور خود نکاح کردینے سے فعلاً ظاہر فرمایا) اور (اس مشروط اور معلق ارادے کے ساتھ ہی) آپ لوگوں (کے طعن) سے (بھی) اندیشہ کرتے تھے (کیونکہ اس وقت اس نکاح میں کسی اہم مصلحتِ دِینیہ کا ہونا ذہنِ مبارک میں نہ آیا ہوگا، محض دُنیوی مصلحت خاص حضرت زینبؓ کے خیال میں ہوگی اور اُمورِ دُنیویہ میں ایسا اندیشہ ہونا مضائقہ نہیں بلکہ بعض حیثیتوں سے مطلوب ہے جبکہ اعتراض سے دُوسروں کی دِین کی خرابی کا احتمال ہو اور ان کو اس سے بچانا مقصود ہو) اور ڈرنا تو آپ کو خدا ہی سے زیادہ سزاوار ہے (یعنی چونکہ واقع میں اس میں دِینی مصلحت ہے، جیسا کہ آگے "لِكَیْ لَا یَكُوْنَ... الخ" میں مذکور ہے، اس لئے خلق سے اندیشہ نہ کیجئے، چنانچہ بعد اطلاع مصلحتِ دِینیہ کے پھر اندیشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا اور ارادۂ نکاح میں تو کیا اندیشہ ہوتا، خود نکاح کے بعد بھی اندیشہ نہیں کیا، جس کا قصہ آگے ہے کہ) پھر جب زید کا اُس (زینب) سے جی بھر گیا (یعنی طلاق دے دی اور عدّت بھی گزر گئی تو) ہم نے آپ سے اس کا نکاح کردیا تا کہ مسلمانوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیبیوں کے (نکاح کے) بارے میں کچھ تنگی نہ رہے جب وہ (منہ بولے بیٹے) ان سے اپنا جی بھر چکیں (یعنی طلاق دے دیں، مطلب یہ کہ اس تشریع کا اظہار مقصود تھا) اور خدا کا یہ حکم تو ہونے والا تھا ہی (کیونکہ حکمت اس کو مقتضی تھی، آگے طعن کا جواب ہے کہ) ان پیغمبر کے لئے خدا تعالیٰ نے جو بات (تکویناً یا تشریعاً) مقرّر کردی تھی اس میں نبی پر کوئی الزام (اور طعن کی بات) نہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن (پیغمبروں) کے حق میں (بھی) یہی معمول کر رکھا ہے جو پہلے ہو گزرے ہیں (کہ ان کو جس اَمر کی اجازت ہوتی ہے بے تکلف وہ اس کو کرتے رہے ہیں اور محلِ طعن نہیں بنے، ایسے ہی یہ نبی بھی محلِ اعتراض نہیں) اور (اُن پیغمبروں کے بھی اس قسم کے جتنے کام ہوتے ہیں ان سب کے بارے میں بھی) اللہ کا حکم تجویز کیا ہوا (پہلے سے) ہوتا ہے (اور اسی کے موافق پھر اُن کو حکم ہوتا ہے اور وہ عمل کرتے ہیں، شاید آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کے قصے میں اس مضمون کو لانا اور پھر انبیاء کے تذکرے میں اس کو مکرّر لانا اس طرف اشارہ ہے کہ ایسے اُمور مثل تمام اُمورِ تکوینیہ کے ایسے متضمنِ حکمت ہوتے ہیں کہ پہلے ہی سے علمِ اِلٰہی میں تجویز ہوچکتے ہیں، پھر نبی پر طعن کرنا اللہ پر طعن کرنا ہے، بخلاف اُن اُمور کے جن پر خود حق تعالیٰ ملامت فرمادیں، گو وہ مقدّر ہونے کی وجہ سے متضمنِ حکمت ہوں مگر محلِ ملامت ہونا دلیل ہے اس کے تضمنِ مفاسد کی، اس لئے ان مفاسد کے اعتبار سے اُن پر نکیر جائز ہے)۔

لوگوں کے اعتراض سے بچنا محمود ہے

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کے طعن وتشنیع سے بچنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے کا اِخفاء کیوں فرمایا جو سببِ عتاب بنا؟ جواب یہ ہے کہ اس معاملے میں اصل ضابطہ جو قرآن وسنت سے ثابت ہے یہ ہے کہ جس کام کے کرنے سے لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہونے اور ان کے طعن وتشنیع میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ ہو تو لوگوں کے دِین کی حفاظت اور ان کے طعن وتشنیع کے گناہ سے بچنے کی نیت سے چھوڑ دینا اس صورت میں تو جائز ہے جب تک یہ فعل خود مقاصدِ شرعیہ میں سے نہ ہو، اور کوئی دِینی حکم حلال وحرام کا اس سے متعلق نہ ہو، اگرچہ فعل فی نفسہٖ محمود ہو۔ اس کی نظیر حدیث وسنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: زمانۂ جاہلیت میں جب بیت اللہ کی تعمیر کی گئی تو اس میں کئی چیزیں بناءِ ابراہیمی کے خلاف کردی گئی ہیں، اوّل تو یہ کہ بیت اللہ کا کچھ حصہ تعمیر سے باہر چھوڑ دیا، دُوسرے بناءِ ابراہیمی میں لوگوں کے بیت اللہ میں داخل ہونے کے لئے دو دروازے تھے، ایک مشرقی جانب میں، دُوسرا مغربی جانب میں، جس کی وجہ سے بیت اللہ میں داخل ہونے اور نکلنے میں زحمت نہ ہوتی تھی، اہلِ جاہلیت نے اس میں دو تصرف کئے کہ مغربی دروازہ تو بالکل بند کردیا اور مشرقی دروازہ جو سطحِ زمین سے متصل تھا، اس کو اتنا اُونچا کردیا کہ بغیر سیڑھی کے اس میں داخلہ نہ ہوسکے، جس سے مقصد یہ تھا کہ

جس کو اِجازت دیں صرف وہ اندر جاسکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اگر نومسلم لوگوں کے غلط فہمی میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں بیت اللہ کو پھر بناءِ ابراہیمی کے مطابق بنادیتا۔ یہ حدیث سب کتبِ معتبرہ میں موجود ہے، اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو غلط فہمی سے بچانے کے لئے اپنا یہ ارادہ جو شرعاً محمود تھا، اس کو ترک کردیا، اور من جانب اللہ اس پر کوئی عتاب نہیں ہوا، جس سے اس عمل کا عنداللہ مقبول ہونا بھی معلوم ہوگیا، مگر یہ معاملہ بیت اللہ کو بناءِ ابراہیمی کے مطابق دوبارہ تعمیر کرنے کا ایسا نہیں جس پر کوئی مقصدِ شرعی موقوف ہو یا جس سے اَحکامِ حلال وحرام متعلق ہوں۔

بخلاف واقعۂ نکاحِ زینبؓ کے کہ اس سے ایک مقصدِ شرعی متعلق تھا کہ جاہلیت کی رسمِ بد اور اس خیالِ باطل کی عملی تردید ہوجائے کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح حرام ہے، کیونکہ قوموں میں چلی ہوئی غلط رسموں کو توڑنا عملاً جب ہی ممکن ہوتا ہے جب اس کا عملی مظاہرہ ہو، حکمِ ربانی اسی کی تکمیل کے لئے حضرت زینبؓ کے نکاح سے متعلق ہوا تھا، اس تقریر سے بناء بیت اللہ کے ترک اور نکاحِ زینبؓ پر بارشادِ خداوندی عمل کے ظاہری تعارض کا جواب ہوگیا۔

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی قولی تبلیغ جو سورۂ اَحزاب کی پہلی آیات میں آچکی ہے، اس کو کافی سمجھا، اور اس کے عملی مظاہرے کی حکمت کی طرف نظر نہیں گئی، اس لئے باوجود علم وارادہ کے اس کو چھپایا، اللہ تعالیٰ نے آیاتِ مذکورہ میں اس کی اصلاح فرمائی اور اس کا اظہار فرمایا: "لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا" یعنی ہم نے زینبؓ سے آپ کا نکاح اس لئے کیا تاکہ مسلمانوں پر اس معاملے میں کوئی عملی تنگی پیش نہ آئے کہ منہ بولے بیٹوں کی مطلقہ بیویوں سے نکاح کرسکیں۔ (معارف القرآن ج:۷ ص:۱۵۵)

دعوتِ دِین میں اِستقلال

"کسی بھی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دو چیزیں ضروری ہوتی ہیں:-
۱-ثابت قدمی۔ ۲-مسلسل کوشش ومحنت
دعوتِ دِین کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بھی یہی دوضروری چیزیں ہیں۔مذکورہ آیات کی تفسیر میں حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ نے اسی کو مستنبط فرمایا ہے۔"

ارشادِ ربانی

۱- وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٥١﴾ (القصص)

ترجمہ:- اور ہم پے در پے بھیجتے رہے ہیں اُن کو اپنے کلام تا کہ وہ دھیان میں لائیں۔

خلاصۂ تفسیر

ہم نے اس کلام (یعنی قرآن) کو ان لوگوں کے لئے وقتاً فوقتاً یکے بعد دیگرے بھیجا تا کہ یہ لوگ (بار بار تازہ بتازہ سننے سے) نصیحت مانیں (یعنی ہم تو دفعۃً واحدۃً بھیجنے پر بھی قادر ہیں، مگر ان ہی کی مصلحت سے تھوڑا تھوڑا نازل کرتے ہیں، پھر اندھیر ہے کہ اپنی ہی مصلحت کی مخالفت کرتے ہیں)۔

"وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ" وَصَّلْنَا، توصیل سے مشتق ہے، جس کے اصلی لغوی معنی رسّی کے تاروں میں اور تار ملا کر اس کے مضبوط کرنے کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں حق تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کا سلسلہ یکے بعد دیگرے جاری رکھا، اور بہت سے نصیحت کے مضامین کا بار بار تکرار بھی کیا گیا تا کہ سننے والے متأثر ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ کا اہم پہلو یہ تھا کہ وہ حق بات کو

مسلسل کہتے اور پہنچاتے ہی رہتے تھے، لوگوں کا انکار و تکذیب اُن کے اپنے عمل اور اپنی لگن میں کوئی رُکاوٹ پیدا نہیں کرتا تھا، بلکہ وہ حق کو اگر ایک مرتبہ نہ مانا گیا تو دُوسری مرتبہ، پھر بھی نہ مانا گیا تو تیسری، چوتھی مرتبہ برابر پیش کرتے ہی رہتے تھے، کسی کے دِل میں ڈال دینا تو کسی ناصح ہمدرد کے بس میں نہیں، مگر اپنی کوشش کو بغیر کسی تکان اور اُکتاہٹ کے جاری رکھنا جوان کے قبضے میں تھا اس کو مسلسل انجام دیتے، آج بھی تبلیغ و دعوت کے کام کرنے والوں کو اس سے سبق لینا چاہئے۔ (معارف القرآن ج:٦ ص:٦٤١)

اِصلاحِ خلق

ارشادِ ربانی

۲- يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝۱۷ (لقمان)

ترجمہ:- اے بیٹے! قائم رکھ نماز کو اور سکھلا بھلی بات اور منع کر بُرائی سے اور تحمل کر جو تجھ پر پڑے، بے شک یہ ہیں ہمت کے کام۔

خلاصۂ تفسیر

(اور اعمال کے باب میں یہ نصیحت کی کہ) بیٹا! نماز پڑھا کرو (کہ بعد تصحیحِ عقائد کے اعلیٰ درجے کا عمل ہے) اور (جیسا تصحیحِ عقائد و اعمال سے اپنی تکمیل کی ہے، اسی طرح دُوسروں کی تکمیل کی بھی کوشش کرنا چاہئے، پس لوگوں کو) اچھے کاموں کی نصیحت کیا کر اور بُرے کاموں سے منع کیا کر اور (اس اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بالخصوص اور ہر حالت میں بالعموم) تجھ پر جو مصیبت واقع ہو اس پر صبر کیا کر کہ یہ (صبر کرنا) ہمت کے کاموں سے ہے۔

اسلام ایک اجتماعی دِین ہے، فرد کی اصلاح کے ساتھ جماعت کی اصلاح اس

کے نظام کا اہم جزو ہے، اس سے نماز جیسے اہم فریضے کے ساتھ اَمر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ذکر فرمایا گیا کہ لوگوں کو نیک کاموں کی دعوت دو اور بُرے کاموں سے روکو، "وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ" یہ دو فریضے ہیں، ایک اپنی اصلاح اور دُوسرا عام مخلوق کی اصلاح۔ دونوں ایسے ہیں کہ دونوں کی پابندی میں خاصی مشقت ومحنت برداشت کرنا پڑتی ہے، اس پر ثابت قدم رہنا آسان نہیں، خصوصاً اصلاحِ خلق کے لئے اَمر بالمعروف کی خدمت کا صلہ دُنیا میں ہمیشہ عداوتوں اور مخالفتوں سے ملا کرتا ہے، اس لئے اس وصیت کے ساتھ ہی یہ وصیت بھی فرمائی کہ: "وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ" یعنی ان کاموں میں تمہیں جو کچھ تکلیف پیش آئے اس پر صبر وثبات سے کام لو۔

(معارف القرآن ج:۷ ص:۳۸)

حق گوئی و بیباکی

ارشادِ ربانی

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۞ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۞ (القلم)

ترجمہ:- سو تو کہنا مت مان جھٹلانے والوں کا، وہ چاہتے ہیں کسی طرح تو ڈھیلا ہو تو وہ بھی ڈھیلے ہوں۔

خلاصۂ تفسیر

(آگے ذم منکرین کا مضمون ہے کہ جب آپ حق پر ہیں اور یہ لوگ باطل پر ہیں) تو آپ ان تکذیب کرنے والوں کا کہنا نہ مانئے (جیسا کہ اب تک نہیں مانا، اور وہ کہنا وہ ہے جو آگے مفہوم ہوتا ہے یعنی) یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ آپ (نعوذ باللہ اپنے منصبی کام میں کہ تبلیغ ہے ذرا) ڈھیلے ہو جاویں تو یہ بھی ڈھیلے ہو جائیں (آپ کا ڈھیلا ہونا یہ کہ بت پرستی کی مذمت نہ کریں، اور ان کا ڈھیلا ہونا یہ کہ آپ کی مخالفت نہ کریں، سورۂ کافرون کی تفسیر میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے ڈھیلے ہونے کا یہی مطلب بیان فرمایا ہے، درمنثور)۔

"فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۞ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۞" یعنی آپ ان جھٹلانے والوں کی بات نہ مانیں، یہ تو یوں چاہتے ہیں کہ آپ کچھ تبلیغِ اَحکام میں نرم پڑ جائیں اور شرک و بت پرستی سے ان کو روکنا چھوڑ دیں تو یہ بھی نرم پڑ جائیں کہ آپ پر طعن و تشنیع اور آپ کی اِیذا رسانی چھوڑ دیں۔ (قالہ ابن عباسؓ، قرطبی)

مسئلہ:- اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار و فجار کے ساتھ یہ سودا کر لینا کہ ہم تمہیں کچھ نہیں کہتے، تم ہمیں کچھ نہ کہو، یہ مداہنت فی الدین اور حرام ہے (مظہری)۔ یعنی بلا کسی اِضطرار و مجبوری کے ایسا معاہدہ جائز نہیں۔ (معارف القرآن ج:۸ ص:۵۳۳)

بیان کی خوبصورتی اور حسنِ تعبیر

ارشادِ ربانی

وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ۞ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ ۚ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ۞ (القصص)

ترجمہ:- اور میرا بھائی ہارون اس کی زبان چلتی ہے مجھ سے زیادہ، سو اس کو بھیج میرے ساتھ مدد کو کہ میری تصدیق کرے، میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھوٹا کریں۔ فرمایا: ہم مضبوط کر دیں گے تیرے بازو کو تیرے بھائی سے اور دیں گے تم کو غلبہ پھر وہ نہ پہنچ سکیں گے تم تک، ہماری نشانیوں سے، تم اور جو تمہارے ساتھ ہو غالب رہو گے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (دُوسری بات یہ ہے کہ زبان بھی زیادہ رواں نہیں ہے اور) میرے بھائی

ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ رواں ہے، تو اُن کو بھی میرا مددگار بنا کر میرے ساتھ رِسالت دے دیجئے کہ (وہ میری تقریر کی تائیداور) تصدیق (مفصل اور مکمل طور سے) کریں گے (کیونکہ) مجھ کو اندیشہ ہے کہ وہ لوگ (فرعون اوراس کے درباری) میری تکذیب کریں (تو اس وقت مناظرے کی ضرورت ہوگی اور زبانی مناظرے کے لئے عادۃً وہ آدمی زیادہ مفید ہوتا ہے جو رَواں زبان ہو)، ارشاد ہوا کہ: (بہتر ہے) ہم ابھی تمہارے بھائی کو تمہارا قوتِ بازُو بنائے دیتے ہیں (ایک درخواست تو یہ منظور ہوئی) اور (دُوسری درخواست کی منظوری اس طرح ہوئی کہ) ہم تم دونوں کو ایک خاص شوکت (وہیبت) عطا کرتے ہیں جس سے ان لوگوں کو تم پر دسترس نہ ہوگی (پس) ہمارے معجزے لے کر جاؤ، تم دونوں اور جو تمہارا پیرو ہوگا (اُن لوگوں پر) غالب رہوگے۔

وعظ میں اچھی خطابت اور فصاحت مطلوب ہے

"هُوَ اَفْصَحُ مِنِّىْ لِسَانًا" اس سے معلوم ہوا کہ وعظ وتبلیغ میں فصاحتِ کلام اور مقبول طرزِ خطابت محمود اور مطلوب ہے، اس کی تحصیل میں کوشش بھی مذموم نہیں۔

(معارف القرآن ج:۶ ص:۶۳۲)

تحریر کی جامعیت اور اَثر انگیزی

ارشادِ ربانی

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّىْۤ اُلْقِىَ اِلَىَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ (النمل)

ترجمہ:- کہنے لگی: اے دربار والو! میرے پاس ڈالا گیا ایک خط عزّت کا، وہ خط ہے سلیمان کی طرف سے اور وہ یہ ہے شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

(سلیمان علیہ السلام نے ہدہد سے یہ گفتگو کر کے بلقیس کے نام ایک خط لکھا جس کا مضمون آگے قرآن میں مذکور ہے، اور ہدہد کے حوالے کیا کہ وہ اس کو چونچ میں لے کر چلا اور اکیلے یا مجلس میں بلقیس کے پاس ڈال دیا) بلقیس نے (پڑھ کر اپنے سرداروں کو مشورے کے لئے جمع کیا اور) کہا کہ: اے اہلِ دربار! میرے پاس ایک خط (جس کا مضمون نہایت) باوقعت (اور عظیم الشان ہے) ڈالا گیا ہے (باوقعت اس لئے کہ حاکمانہ مضمون ہے جس میں باوجود انتہائی اِختصار کے اعلیٰ درجے کی بلاغت ہے اور) وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور اس میں یہ (مضمون) ہے (اوّل) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

آدابِ مکاتبت

"اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" قرآنِ کریم نے انسانی زندگی کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا جس پر ہدایات نہ دی ہوں۔ خط وکتابت اور مراسلت کے ذریعے باہمی گفت وشنید بھی انسان کی اہم ضروریات میں داخل ہے، اس سورت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا مکتوب بنام ملکہ سبا (بلقیس) پورا کا پورا نقل فرمایا گیا، یہ ایک پیغمبر ورسول کا خط ہے اور قرآنِ کریم نے اس کو بطور اِستحسان کے نقل کیا ہے، اس لئے اس خط میں جو ہدایات خط وکتابت کے معاملے میں پائی جاتی ہیں وہ مسلمانوں کے لئے بھی قابلِ اتباع ہیں۔

سب سے پہلی ایک ہدایت تو اس خط میں یہ ہے کہ خط کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے نام سے شروع کیا، مکتوب الیہ کا نام کس طرح لکھا، قرآنِ کریم کے الفاظ میں وہ مذکور نہیں۔ مگر اتنی بات اس سے معلوم ہوئی کہ خط لکھنے والے کے لئے سنتِ انبیاء یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنا نام لکھے، جس میں بہت سے فوائد ہیں، مثلاً خط پڑھنے سے پہلے ہی مکتوب الیہ کے علم میں آجائے کہ میں کس کا خط پڑھ رہا ہوں تا کہ وہ اُسی ماحول میں خط

کے مضمون کو پڑھے اور غور کرے، مخاطب کو یہ تکلیف نہ اُٹھانی پڑے کہ کاتب کا نام خط میں تلاش کرے کہ کس کا خط ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے مکاتیب منقول اور شائع شدہ عالم میں موجود ہیں، اُن سب میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے کہ "من محمد عبد اللہ ورسولہ" سے شروع فرمایا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ جب کوئی بڑا آدمی اپنے چھوٹے کو خط لکھے، اس میں تو اپنے نام کی تقدیم پر کوئی اِشکال نہیں، لیکن کوئی چھوٹا اپنے باپ، اُستاذ، شیخ یا اور کسی بڑے کو خط لکھے، اُس میں اپنے نام کو مقدّم کرنا کیا اس کے ادب کے خلاف نہ ہوگا؟ اور اس کو ایسا کرنا چاہئے یا نہیں؟ اس معاملے میں حضراتِ صحابہ کرامؓ کا عمل مختلف رہا ہے، اکثر حضرات نے تو اِتباعِ سنتِ نبوی کو اَدب پر مقدّم رکھ کر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم کو جو خطوط لکھے اُن میں بھی اپنے نام کو مقدّم لکھا ہے۔ ''رُوح المعانی'' میں ''بحرِ محیط'' کے حوالے سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے:-

ما كان أحد أعظم حرمة من رسول الله صلى الله عليه وسلم وكان أصحابه اذا كتبوا اليه كتابًا بدءوا بأنفسهم قلت وكتاب علاء الحضرمي يشهد له على ما روى۔

ترجمہ:- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تو کوئی اِنسان قابلِ تعظیم نہیں، مگر صحابہ کرامؓ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خط لکھتے تو اپنا نام ہی شروع میں لکھا کرتے تھے، اور حضرت علاء حضرمی کا خط جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام معروف ہے وہ اس پر شاہد ہے۔

البتہ ''رُوح المعانی'' میں مذکورہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: یہ سب کلام افضلیت میں ہے، جواز میں نہیں، اگر کوئی شخص اپنا نام شروع کے بجائے آخیر میں لکھ دے تو یہ بھی جائز ہے۔ فقیہ ابواللیثؒ کی بستان میں ہے کہ اگر کوئی شخص مکتوب الیہ کے نام

سے شروع کردے تو اس کے جواز میں کسی کو کلام نہیں کیونکہ اُمت میں یہ طریقہ بھی چلا آرہا ہے، اس پر نکیر نہیں کی گئی۔ (رُوح المعانی وقرطبی)

خط کا جواب دینا سنتِ انبیاء ہے

تفسیر قرطبی میں ہے کہ جس شخص کے پاس کسی کا خط آئے اُس کے لئے مناسب ہے کہ اُس کا جواب دے کیونکہ غائب کا خط حاضر کے سلام کے قائم مقام ہے، اسی لئے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں ہے کہ وہ خط کے جواب کو جوابِ سلام کی طرح واجب قرار دیتے تھے۔ (قرطبی)

مکتوب کے آغاز میں بسم اللہ لکھنا

حضرت سلیمان علیہ السلام کے مذکورہ خط سے، نیز رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام مکاتیب سے ایک مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ خط کے شروع میں "بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ" لکھنا سنتِ انبیاء ہے، رہا یہ مسئلہ کہ بسم اللہ کو اپنے نام سے پہلے لکھے یا بعد میں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکاتیب اس پر شاہد ہیں کہ بسم اللہ کو سب سے مقدّم، اس کے بعد کاتب کا نام، پھر مکتوب الیہ کا نام لکھا جائے، اور قرآنِ کریم میں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے اور بسم اللہ بعد میں مذکور ہے، اس کے ظاہر سے جواز اس کا بھی معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ اپنے نام کے بعد لکھی جائے، لیکن ابنِ ابی حاتم نے یزید بن رومان سے نقل کیا ہے کہ دراصل حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے خط میں اس طرح لکھا تھا: "بسم الله الرحمٰن الرحیم، من سیمان بن داؤد الٰی بلقیس ابنة ذی شرح وقومها، ان لا تعلوا ... الخ"۔ بلقیس نے جب یہ خط اپنی قوم کو سنایا تو اُس نے قوم کی آگاہی کے لئے سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے ذکر کردیا، قرآنِ کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ بلقیس کا قول ہے، قرآنِ کریم میں اس کی تصریح نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصل خط میں بسم اللہ مقدّم تھی یا سلیمان علیہ السلام کا نام، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کا نام لفافے

کے اُوپر لکھا ہو اور اندر بسم اللہ سے شروع ہو، بلقیس نے جب اپنی قوم کو خط سنایا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے ذکر کر دیا۔

مسئلہ:- خط نویسی کی اصل سنت تو یہی ہے کہ ہر خط کے شروع میں بسم اللہ لکھی جائے، لیکن قرآن وسنت کے نصوص واشارات سے حضراتِ فقہاء نے یہ کلیہ قاعدہ لکھا ہے کہ جس جگہ بسم اللہ یا اللہ تعالیٰ کا کوئی نام لکھا جائے، اگر اُس جگہ اُس کاغذ کے بے ادبی سے محفوظ رکھنے کا کوئی اہتمام نہیں بلکہ وہ پڑھ کر ڈال دیا جاتا ہے تو ایسے خطوط اور ایسی چیز میں بسم اللہ یا اللہ تعالیٰ کا کوئی نام لکھنا جائز نہیں کہ وہ اس طرح اس بے ادبی کے گناہ کا شریک ہوجائے گا۔ آج کل جو عموماً ایک دُوسرے کو خطوط لکھے جاتے ہیں ان کا حال سب جانتے ہیں کہ نالیوں اور گندگیوں میں پڑے نظر آتے ہیں، اس لئے مناسب یہ ہے کہ ادائے سنت کے لئے زبان سے بسم اللہ کہہ لے، تحریر میں نہ لکھے۔

آیتِ قرآنی پر مشتمل تحریر کا کافر کے ہاتھ میں دینا

یہ خط حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو اس وقت بھیجا ہے جبکہ وہ مسلمان نہیں تھیں، حالانکہ اس خط میں "بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" لکھا ہوا تھا، جس سے معلوم ہوا کہ ایسا کرنا جائز ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط ملوکِ عجم کو لکھے ہیں اور وہ مشرک تھے، اُن میں بھی بعض آیاتِ قرآن لکھی ہیں، وجہ دراصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا کسی کافر کے ہاتھ میں دینا تو جائز نہیں، لیکن ایسی کوئی کتاب یا کاغذ جس میں کسی مضمون کے ضمن میں کوئی آیت آگئی ہے، وہ عرف میں قرآن نہیں کہلاتا اس لئے اس کا حکم بھی قرآن کا حکم نہیں ہوگا، وہ کسی کافر کے ہاتھ میں بھی دے سکتے ہیں اور بے وضو کے ہاتھ میں بھی۔

(عالمگیری کتاب الحظر والإباحه)

مکتوب کی تاثیر

حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس والا نامے کو دیکھئے تو چند سطروں میں تمام اہم

اور ضروری مضامین بھی جمع کردیئے اور بلاغت کا اعلیٰ معیار بھی قائم ہے۔ کافر کے مقابلے میں اپنی شاہانہ شوکت کا اظہار بھی ہے، اس کے ساتھ حق تعالیٰ کی صفاتِ کمال کا بیان اور اسلام کی طرف دعوت بھی اور ترفع وتکبر کی مذمت بھی، درحقیقت یہ خط بھی اعجازِ قرآنی کا ایک نمونہ ہے۔ حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ خط نویسی میں تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت بھی وہی ہے کہ تحریر میں طول نہ ہو، مگر ضروری کوئی مضمون چھوٹے بھی نہیں (رُوح المعانی)۔

(معارف القرآن ج:۶ ص:۵۷۴)

عمل میں کوتاہی اور تبلیغِ دِین

''دعوت الی اللہ کا کام جتنا افضل ہے اتنا ہی نازک بھی ہے، داعی کو اس رستے میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے، جیسے انبیاء علیہم السلام نے دعوت دینے سے قبل اس پر عمل کرکے دِکھایا، یوں داعی کو بھی پہلے خود عمل کرنا چاہئے تاکہ لوگ اس کی دعوت کو قبول کرسکیں۔ لیکن اگر خدانخواستہ کسی وقت داعی خود بے عمل ہوجائے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ دعوت کے اس اہم فریضے کو بھی ترک کردے، نہیں بلکہ مسلسل دعوت الی اللہ دیتا رہے کیونکہ اس سے جہاں عوام الناس کو دِین کی بات معلوم ہوگی وہاں اس کا نفس خود اس کو بھی راہِ ہدایت پر چلنے کے لئے یقیناً مجبور کرے گا۔ آنے والی آیتِ مقدسہ میں اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔''

ارشادِ ربانی

اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۴۴ (البقرۃ)

ترجمہ:- کیا حکم کرتے ہو لوگوں کو نیک کام کا اور بھولتے ہو اپنے آپ کو، اور تم تو پڑھتے ہو کتاب، پھر کیوں نہیں سوچتے ہو۔

خلاصۂ تفسیر

(علمائے بنی اسرائیل کے بعض اقارب مسلمان ہوگئے تھے، جب ان سے گفتگو آتی تو خفیہ طور پر یہ علماء اُن سے کہتے تھے کہ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسولِ برحق ہیں، ہم لوگ تو کسی مصلحت سے مسلمان نہیں ہوتے مگر تم اس مذہبِ اسلام کو نہ چھوڑنا، اسی بنا پر حق تعالیٰ نے فرمایا) کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اِیمان لانے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنے کو) اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی (یعنی توریت کی جس میں جابجا ایسے عالم بے عمل کی مذمتیں مذکور ہیں) تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔

"اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ" اس آیت میں خطاب اگرچہ علمائے یہود سے ہے، ان کو ملامت کی جارہی ہے کہ وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو یہ تلقین کرتے تھے کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کرتے رہو، اور دِینِ اسلام پر قائم رہو (جو علامت ہے اس بات کی کہ علمائے یہود دِینِ اسلام کو یقینی طور پر حق سمجھتے تھے) مگر خود نفسانی خواہشات سے اتنے مغلوب تھے کہ اسلام قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے، لیکن معنی کے اعتبار سے یہ ہر اُس شخص کی مذمت ہے جو دُوسروں کو تو نیکی اور بھلائی کی ترغیب دے، مگر خود عمل نہ کرے، دُوسروں کو خدا سے ڈرائے مگر خود نہ ڈرے، ایسے شخص کے بارے میں احادیث میں بڑی ہولناک وعیدیں آئی ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: شبِ معراج میرا گزر کچھ لوگوں پر ہوا جن کے ہونٹ اور زبانیں آگ کی قینچیوں سے کترے جارہے تھے، میں نے جبرئیل سے پوچھا: یہ کون ہیں؟ جبرئیل نے بتایا کہ: یہ آپ کی اُمت کے دُنیادار واعظ ہیں جو لوگوں کو تو نیکی کا حکم کرتے تھے مگر اپنی خبر نہ لیتے تھے۔ (ابنِ کثیر)

ابنِ عساکرؒ نے ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: بعض جنتی

بعض دوزخیوں کو آگ میں دیکھ کر پوچھیں گے کہ: تم آگ میں کیونکر پہنچ گئے؟ حالانکہ ہم تو بخدا انہی نیک اعمال کی بدولت جنت میں داخل ہوئے جو ہم نے تم سے سیکھے تھے۔ اہلِ دوزخ کہیں گے: ہم زبان سے کہتے ضرور تھے، لیکن خود عمل نہیں کرتے تھے۔ (ابنِ کثیر)

فاسق کی نصیحت

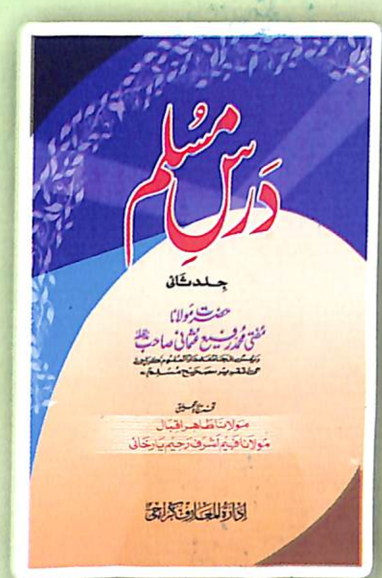
لیکن مذکورہ بیان سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ بے عمل یا فاسق کے لئے دُوسروں کو وعظ و نصیحت کرنا جائز نہیں، اور جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہو وہ دُوسروں کو اس گناہ سے باز رہنے کی تلقین نہ کرے، کیونکہ کوئی اچھا عمل الگ نیکی ہے اور اس اچھے عمل کی تبلیغ دُوسری مستقل نیکی ہے، اور ظاہر ہے کہ ایک نیکی کو چھوڑنے سے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دُوسری نیکی بھی چھوڑ دی جائے۔ جیسے ایک شخص اگر نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ روزہ بھی ترک کردے، بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ دُوسروں کو نماز پڑھنے کے لئے بھی نہ کہے۔ اسی طرح کسی ناجائز فعل کا ارتکاب الگ گناہ ہے اور اپنے زیرِ اثر لوگوں کو اس ناجائز فعل سے نہ روکنا دُوسرا گناہ ہے، اور ایک گناہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دُوسرا گناہ بھی ضرور کیا جائے۔ (رُوح المعانی)

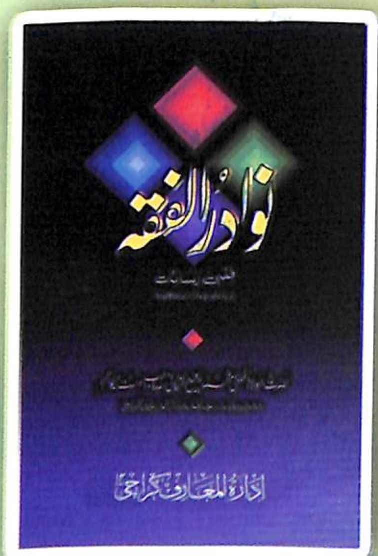
چنانچہ اِمام مالک رحمہ اللہ نے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: اگر ایک شخص یہ سوچ کر اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دے کہ میں خود گنہگار ہوں، جب گناہوں سے خود پاک ہوجاؤں گا تو لوگوں کو تبلیغ کروں گا۔ تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ تبلیغ کرنے والا کوئی بھی باقی نہ رہے گا، کیونکہ ایسا کون ہے جو گناہوں سے بالکل پاک ہو؟ حضرت حسن کا ارشاد ہے کہ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ لوگ اسی غلط خیال میں پڑ کر تبلیغ کا فریضہ چھوڑ بیٹھیں (قرطبی)۔ بلکہ حضرت سیّدی حکیم الاُمت تھانویؒ تو فرمایا کرتے تھے کہ: جب مجھے اپنی کسی بُری عادت کا علم ہوتا ہے تو میں اس عادت کی مذمت اپنے مواعظ میں خاص طور سے بیان کرتا ہوں تاکہ وعظ کی برکت سے یہ عادت جاتی رہے۔

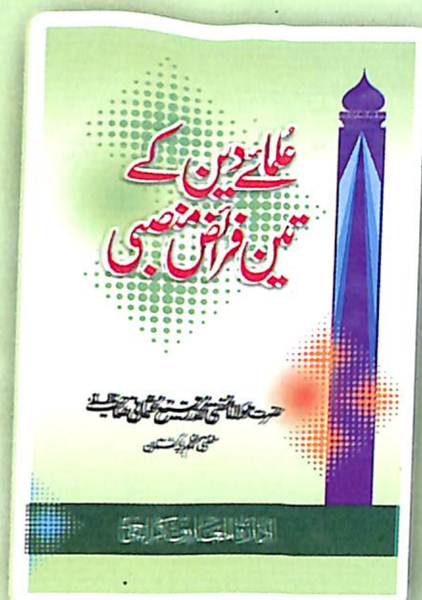
خلاصہ یہ ہے کہ آیت "اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بے عمل آدمی کو وعظ کہنا جائز نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ واعظ کو بے عمل نہیں ہونا چاہئے، اور دونوں میں فرق واضح ہے۔ مگر یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ بے عمل ہونا نہ تو واعظ کے لئے جائز ہے نہ غیر واعظ کے لئے، پھر واعظ کی تخصیص کیوں؟ جواب یہ ہے کہ ناجائز تو دونوں کے لئے ہے، مگر واعظ کا جرم غیر واعظ کے جرم کے مقابلے میں زیادہ سنگین اور زیادہ قابلِ ملامت ہے، کیونکہ واعظ جرم کو جرم سمجھتے ہوئے جان بوجھ کر کرتا ہے، اس کے پاس یہ عذر نہیں ہوتا کہ مجھے اس کا جرم ہونا معلوم نہ تھا، برخلاف غیر واعظ کے اور اَن پڑھ جاہل کے کہ اس کو خواہ علم حاصل نہ کرنے کا الگ گناہ ہو، لیکن ارتکابِ گناہ میں اس کے پاس کسی درجے میں عذر موجود ہوتا ہے کہ مجھے معلوم نہ تھا، اس کے علاوہ عالم اور واعظ اگر کوئی جرم کرتا ہے تو یہ دِین کے ساتھ ایک قسم کا اِستہزاء ہے، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جتنا اَن پڑھ لوگوں کو معاف کرے گا اتنا علماء کو معاف نہیں کرے گا"۔

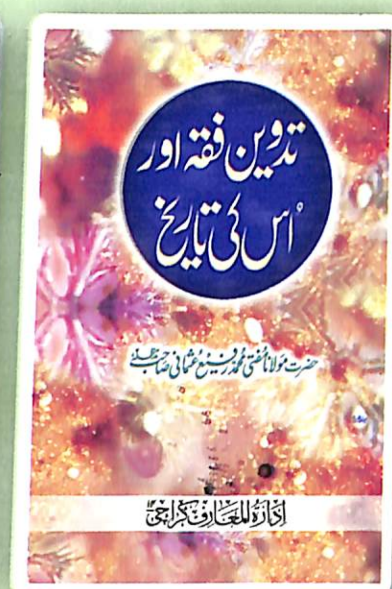
(معارف القرآن ج:۱ ص:۲۱۸)

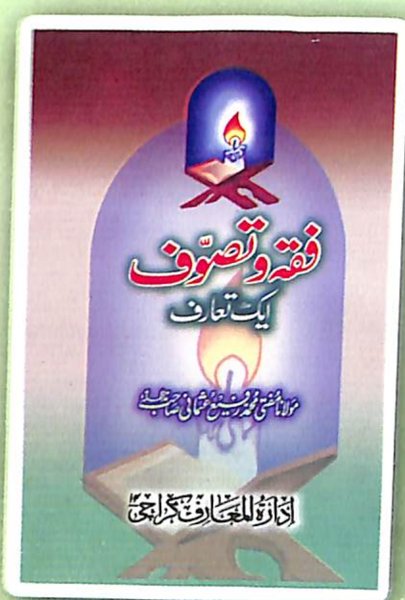
***

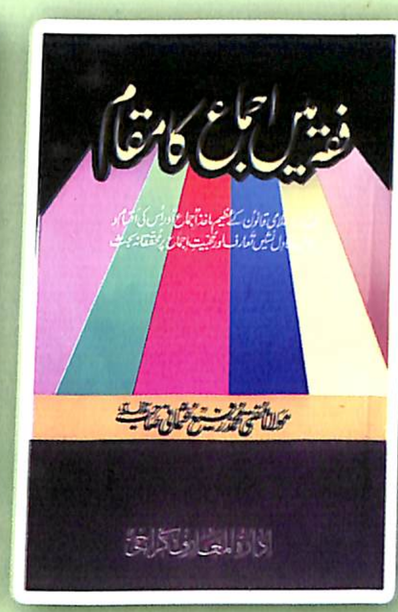

درسِ مسلم
جلد ثانی
حضرت مولانا
مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب
مولانا طاہر اقبال
مولانا فہیم اشرف رحیم یارخانی
ادارۃ المعارف کراچی


نوادر الفقہ
ادارۃ المعارف کراچی


علمائے دین کے
تین فرائض منصبی


تدوین فقہ اور
اس کی تاریخ
حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب
ادارۃ المعارف کراچی


فقہ و تصوف
ایک تعارف
مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب
ادارۃ المعارف کراچی


فقہ میں اجماع کا مقام